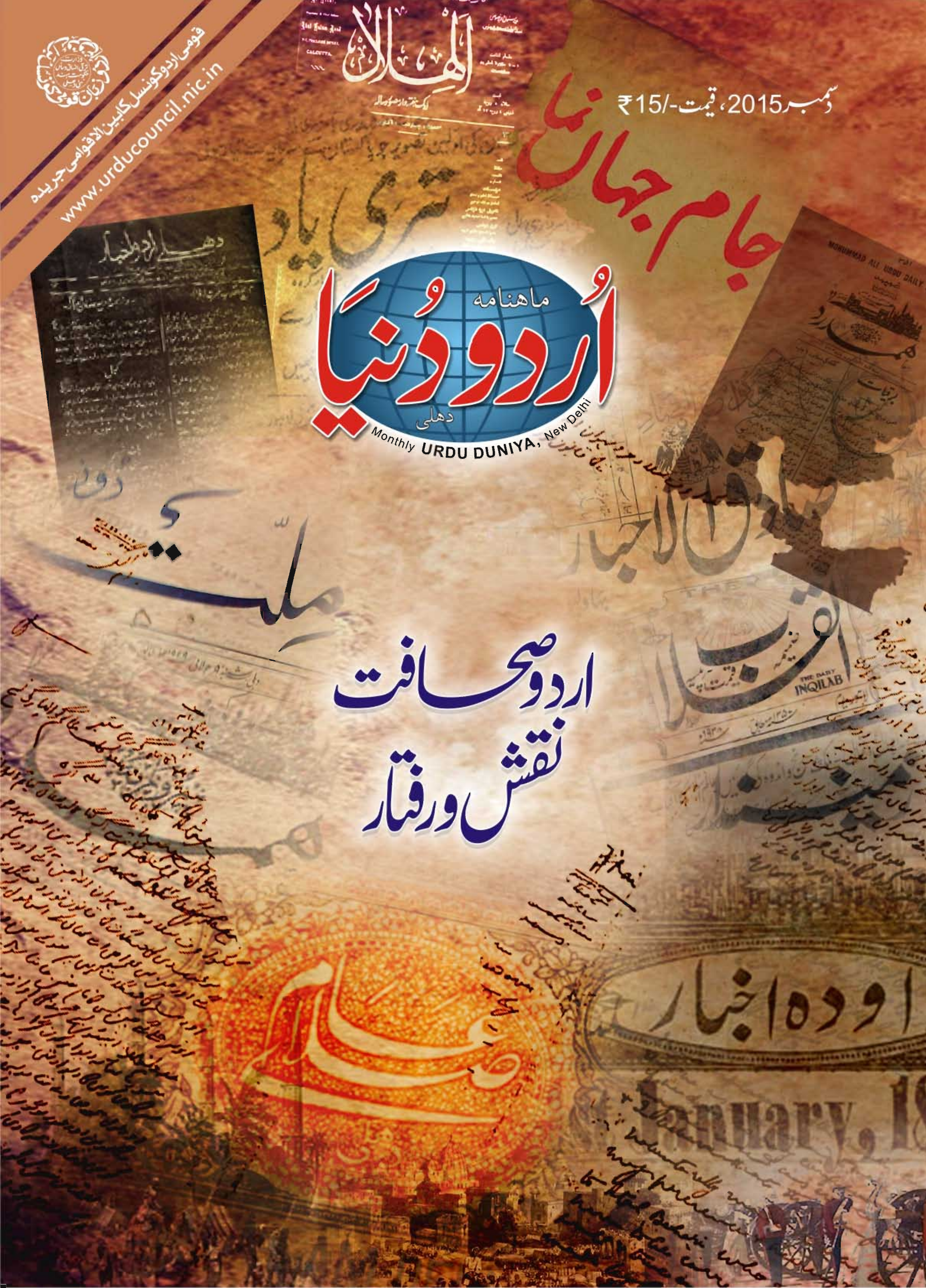

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2015، قیمت -/15₹

ماهنامه اردو دنیا دهلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

اردو صحافت
نقش و رفتار

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

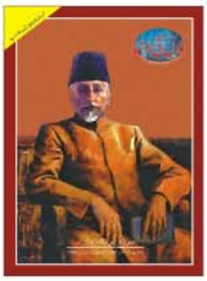

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:12 دسمبر 2015

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
پروفیسر اصغر عباس — اشفاق احمد عمر 8

گوشہ صحافت
اولین شہید صحافی مولانا محمد باقر — اسد رضا 11
اردو صحافت پر قدغن
اور اس کے معتوب صحافی — ظہیر انور 15
فارسی صحافت کا ارتقا اور ہندوستانی
فارسی ادب میں اس کے نقوش — صالحہ رشید 18

قوانین صحافت کمپنی کے عہد میں — محمد شکیل 21
اردو صحافت: اجمالی جائزہ — اے ایم صدیقی 23
راشد الخیری کی صحافتی خدمات — محمد اکبر 27
تیرہویں صدی:
ادب لطیف کا نمائندہ رسالہ — محمد رضوان خان 31
روزنامہ 'ملت' ہمدرد کا نقش ثانی! — محمد شرافت علی 34
اردو صحافت میں غیر مسلم
صحافیوں کی خدمات — حامد رضا صدیقی 37
جدید اردو صحافت
کے معمار: حیات اللہ انصاری — محمد یوسف وانی 40
طبی صحافت کے ذریعے فروغ اردو — اسعد فیصل فاروقی 43
اردو صحافت کوئز — سید فضل اللہ مکرم 46

ادبی مباحث
اردو افسانے میں دلت رجحان — متھن کمار 48
شعرِ عرفان: معنی کا ایک نیا جہان — آشوتوش شری واستو 51

نفسیات
نرگسیت کے منفی پہلو — سید اقبال امروہوی 54

دوسری زبانوں سے
بینار (مراٹھی کہانی) — وِس۔ کھانڈیکر
ترجمہ: محمد اسد اللہ 56

شخصیت
خواجہ احمد فاروقی (خاکہ) — ظہیر احمد صدیقی 60

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 64

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 75

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 76

ہماری بات

فروغِ زبان کے جہاں بہت سے وسائل اور ذرائع ہیں، ان میں ایک مؤثر ذریعہ صحافت بھی ہے کہ اس کا بنیادی رشتہ اس عوام سے ہے جس کے ذریعہ زبان پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔ صحافت نہ صرف عوام کی ذہن سازی کرتی ہے بلکہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی شعور کی بیداری میں بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔ اطلاعات اساس معاشرے میں صحافت ضرورت بن گئی ہے جس کی وجہ سے اس کا دائرہ کار بھی وسیع ہوگیا ہے۔ اب صحافت ایک طرح سے جام جہاں نما ہے جس سے آج کے عہد کا انسان پوری دنیا کے منظرنامے سے نہ صرف واقفیت حاصل کرتا ہے بلکہ اسی کی بنیاد پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔

ماضی میں صحافت کی ایک درخشاں اور زریں تاریخ رہی ہے۔ صحافت نے جمہوری حقوق، مساوات، امن، سیکولرزم، اتحاد، یگانگت اور یک جہتی کے لیے جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی صحافت کا بہت فعال انقلابی کردار رہا ہے۔ اردو صحافت نہ ہوتی تو شاید ہندوستان کو آزادی کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ماضی کے زیادہ تر صحافیوں نے فرنگیوں کے خلاف جو محاذ کھولا تھا اس کا ہندوستانی عوام کے شعور پر بہت گہرا اثر پڑا۔ آزادی اور انقلاب کے جذبے کو بیدار کرنے میں سب سے اہم رول اردو صحافت ہی کا رہا ہے۔ 1857 اور اس کے بعد جو اخبارات شائع ہوئے ان میں زیادہ تر اخبارات نے انگریزوں کی پالیسیوں کی مخالفت کی۔ ان اخبارات کی ایک لمبی فہرست ہے۔ قومی جدو جہد کے علاوہ صحافت نے زبانوں کو نئی زندگی دی خاص طور پر اردو زبان کا جو دائرہ ہندوستان کے مختلف علاقوں تک پھیلا اور اس زبان نے لوگوں کے دلوں میں اپنی جو جگہ بنائی ہے اس میں اخبارات کا بہت اہم رول رہا ہے۔ بعض اخبارات نے اپنے مقاصد میں بھی تحریر کیا ہے کہ ان کا مقصد زبان کی ترقی ہے۔ اس لحاظ سے فروغ زبان سے صحافت کا ایک ناگزیر اور لازمی رشتہ ہے۔ آج کے عہد میں بھی اردو زبان صحافت کے ذریعے ہی عوام تک پہنچ رہی ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں تک جو علمی یا ادبی پس منظر نہیں رکھتے یا ادب وثقافت سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے انھیں بھی قومی، عالمی منظر نامے یا مقامی احوال وکوائف سے آگہی کے لیے صحافت کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ مگر صحافت کی تمام تر قومی، ملکی اور لسانی خدمات کے باوجود المیہ یہ رہا کہ اردو صحافت کی جملہ جہات اور قومی ثقافتی شعور کی بیداری میں اس کے کردار کے حوالے سے کوئی مربوط اور مبسوط گفتگو نہیں کی جاسکی۔ صحافت کے موضوعات اور مسائل پر بھی کوئی معنی خیز مکالمہ نہیں ہوسکا، اور نہ ہی صحافت کی کوئی منظم تاریخ ترتیب دی گئی ہے، جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں وہ بھی تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں ناکام ہیں۔

اردو صحافت کے بہت سے مسائل ہیں جن پر موجودہ تناظر میں سنجیدگی سے تحقیق کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل دوسو سالہ جشن صحافت اسی مقصد کے تحت منا رہی ہے کہ اردو صحافت کے مجموعی کردار سے عوام کو روشناس کرایا جائے اور مختلف ادوار پر مبنی منطقائی اعتبار سے صحافت کی ایک مربوط تاریخ مرتب کی جائے اور خاص طور پر ان گم گشتہ اخبارات کی جستجو کی جائے جو تحریک آزادی کے دوران ان علاقوں سے نکل رہے تھے جو اب اردو کے لیے غیر مانوس اور اجنبی بن گئے ہیں۔

قومی اردو کونسل اردو صحافت کی نہ صرف ایک انسائیکلو پیڈیا ترتیب دے گی بلکہ اردو کے اہم اخبارات کے انتخابات کی اشاعت پر بھی توجہ مرکوز کرے گی تاکہ اخبارات کی شکل میں جو سیاسی، سماجی، تمدنی دستاویز محفوظ ہے اس سے علمی وعوامی حلقہ روشناس ہوسکے۔

اردو دنیا کے اس شمارے میں اردو صحافت پر کچھ تحریریں اسی مقصد سے شائع کی جارہی ہیں کہ ہم اپنے صحافتی منظرنامے سے واقف ہوسکیں اور یہ جان سکیں کہ سیاست اور معاشرت کے علاوہ زبان وادب کے فروغ میں اردو اخبارات کا کیا حصہ رہا ہے۔ آئندہ بھی ان اخبارات کے حوالے سے تحریریں شائع ہوتی رہیں گی جن پر علمی اور ادبی حلقے نے ابھی تک زیادہ توجہ مرکوز نہیں کی ہے۔ خاص طور پر وہ اخبارات زیر بحث آئیں گے، جن کے بارے میں ہماری نئی نسل واقف نہیں ہے۔ نامور اور گمنام صحافیوں پر مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے گا۔ اس تعلق سے آپ کے ذہن میں کچھ تجاویز اور مشورے ہوں تو ہمیں ضرور لکھیں۔ ہم ان مشوروں کی روشنی میں 'اردو دنیا' کے شمارے ترتیب دیتے رہیں گے۔

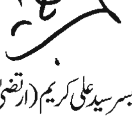

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

اردو دنیا اکتوبر 2010 کا شمارہ اپنی امتیازی خوبیوں یعنی حسن طباعت و کتابت سے مزین اور محققانہ اور معلوماتی مضامین سے مملو موصول ہوا۔ اس کے مضامین پسند آئے: گاندھی جی کے تعلیمی افکار، مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد، اردو کے ہندو مرثیہ گو، برٹن کالج کی ادبی خدمات، تاجیکی ادب کا روشن ستارہ: ابوالقاسم لاہوتی۔

دنیائے ادب کی دس عظیم کتابوں میں اردو کے جلیل القدر ادیبوں کی کسی کتاب کا ذکر نہیں۔ علی گڑھ تحریک کے بانی نے بدرالدین طیب جی کانگریس کے صدر کے نام خط میں ہندوستانی قوم کے وجود سے انکار کیا تھا۔

(ڈاکٹر) کرشن بھاوک
گورونانک نگر، گلی نمبر 18K، پٹیالہ 147003 (پنجاب)

'اردو دنیا' اکتوبر ماہ کا شمارہ مہاتما گاندھی و سرسید احمد خاں صاحب کے گوشوں اور معیاری مضامین پر مبنی ہے۔ اس شمارے کا سرورق ہندوستان کے دونوں انمول رتنوں کی از حد خوبصورت تصاویر سے آراستہ و پیراستہ ادارے کے حسنِ ظن کا ضامن ہے۔

اس شمارے میں محترمہ نجمہ رحمانی نے بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں ہندوستانی، بالخصوص دہلی کی تہذیب و تمدن کی موزوں اشعار سے قابلِ تحسین عکاسی کی ہے۔ اس مقالے میں ظفر کی شاعری میں ہندی، پنجابی و مقامی دیگر زبانوں کے نایاب نمونوں کے تصرف سے قومی اتحاد و یکجہتی ہی نشان زد ہوا ہے۔

صفحہ 44 پر ولی دکنی کی ایک سطر غلط شائع ہوگئی ہے۔ ''عشاق کی تسخیر کوں یو سحرِ بنگالہ ہوا۔'' میں 'کوں یوٗ' کی بجائے 'شاید 'کو یوں' درکار تھا۔ اسی طرح ص 45 پر ''سر پر گوندھ کے باندھا جوڑا۔'' فقرے میں 'گوندھ' کی جگہ 'گونتھ' چاہیے تھا اور 'جوڑے کی گندھاوٹ' کی بجائے 'گنتھاوٹ' ۔ کیونکہ مالا، جوڑا وغیرہ تو ہمیشہ 'گونتھا' جاتا ہے، جبکہ 'گوندھا' تو آٹا ہی جاتا ہے۔

ظفر بادشاہ کے عہد میں ایک بار ایک ہی دن ہولی و

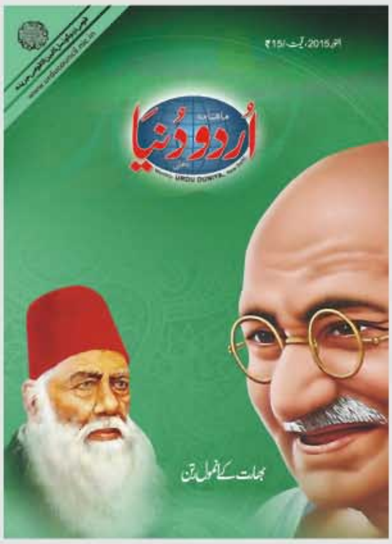

عید پڑ جانے کے موجب عوام اس شش و پنج میں تھے کہ حکام کی جانب سے کس تیوہار کو شاہی اہتمام سے منایا جائے گا۔ تب اپنی دور اندیشی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے بہادر شاہ نے یہ حکم صادر کر دیا تھا کہ ہندو مسلم دونوں مذاہب کے لوگ مل جل کر مشترکہ طریقے سے آدھے آدھے دن دونوں ہی تیوہار منائیں گے۔ اس ایک مثال سے بھی ظفر کے قومی اتحاد و یکجہتی کے جذبے کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے۔

انور ظہیر انصاری صاحب کے مقالے میں مجروح سلطانپوری کے تخلیقی بانکپن کے ساتھ ہی شاعرِ اعظم کے فطری بانکپن و امید پرستی والے جذبے کی بھی خط کشی دیکھتے ہی بنتی ہے۔ ڈاکٹر سنجے کمار نے بلند پایہ شاعر انیس سے وابستہ اپنے مقالے میں روایت سے منظور شدہ شاعری کے نو رسوں کے علاوہ مزید دو اور رسوں کو جذبۂ طفلانہ و عبادت (بھکتی) سے منسوب کرکے اپنے عمیق و دقیق مطالعے کا ثبوت درج کیا ہے۔ ہندی زبان میں بھکتی کے دَور کے مہاکوی سورداس جی نے طفل کرشن جی کے جذبات کی اس طرح سے شہرۂ آفاق مہا کاویہ 'سور ساگر' میں عکاسی کی تھی، کہ تمام نقادنے 'واتسلیہ رس' کا اختراع کرکے اسے بطور ایک نیا رس قائم کرنے کا اجتماعی طور سے فیصلہ کرلیا تھا، اسی طرح آگے چل کر روپ گوسوامی نے بھکتی رس پر مبنی ایک مکمل کتاب ہی تحریر فرمائی تھی۔ اس کا نام تھا 'بھکتی رسامرت سِندھوٗ'۔ اسی مضمون کے تحت 'ورڑن' لفظ کی بجائے 'ورنن' درکار تھا اور لفظ 'گھر نڑا' (ص 49) کی جگہ 'گھرِ نا' چاہیے تھا، اسی کی تشریح کے تحت 'وی بھتس' رس کا نام ندارد ہے۔

اسی مضمون میں محولہ ایک کتاب 'رس یعنی فلسفۂ انبساط' کے مصنف کا نام 'مولوی حبیب الرحمٰن شاستری' بھی قومی اتحاد و لسانی یک جہتی کا ایک نایاب نمونہ ہے۔ مسلمان ادیب سنسکرت زبان میں بھی اعلیٰ سندیں حاصل کیا کرتے ہیں، یہ امر قابلِ تقلید و از حد حیرت افزا واقع ہوا ہے۔ انیس امروہوی نے مختلف الصفات بھیشم ساہنی کی پیدائش کی مبارک صدی کے مکمل ہونے پر ایک برمحل مضمون شائع کروا کر قارئین پر احسان کیا ہے۔ یہ از حد معلوماتی اور لائقِ صد تحسین مقالہ ہے۔

پرویز اشرفی
ڈی 321، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

'اردو دُنیا' ستمبر 2015 کا شمارہ مقبول عام ادیب راجندر سنگھ بیدی کے یوم پیدائش کی صدی کے مکمل ہونے پر اور شہرہ آفاق افسانہ نویس عبد اللہ حسین کی رحلت پر شائع مناسب و اعلیٰ مضامین پر مبنی ہے۔ اس طرح یہ شمارہ دونوں ادیبوں کے لیے مناسب و معقول خراج عقیدت پیش کرنے والا دستاویزی نوعیت کا حامل ہے۔ بشیر مالیرکوٹلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ نے راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا قابل قدر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

سہیل انجم کا قلمی خاکہ پروفیسر ارتضٰی کریم بڑے ہی موثر انداز میں ردیف اور قافیہ کے طرز پر سپرد قلم ہوا ہے، خاکہ لائق تحسین ہے۔ سابق صدر جمہوریہ ہند عبدالکلام پر لکھا گیا مضمون کافی معلوماتی ہے۔ محترم مشتاق احمد نوری سے لیا گیا انٹرویو اہمیت کا حامل ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ بہار کے افسانہ نویسوں نے ہی فکشن کی امامت کی ہے۔ 'اردو دنیا' نومبر کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ متعدد معلوماتی اور قیمتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ زبان رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جارہی ہے، اختر الایمان کا انفرادی آہنگ،

شاعری میں قومی یکجہتی کا تصور، رومانیت سے آگے کا سفر، محمد محفوظ الحسن کا مضمون 'اردو زبان و ادب اور مگہی' معلوماتی مضمون ہے۔ ادبی مباحث کے تحت تخلیق اور تخلیقیت ، اردو ادب میں تہذیبی اشتراک اور رواداری جامع مضامین ہیں۔ حبیب نثار نے 'مشترکہ تہذیب کے فروغ میں چشتی صوفیا کا حصہ' پیش کر کے دور حاضر میں یکجہتی کو مضبوط کرنے کی سعی کی ہے۔ جو لوگ صوفیائے کرام کے متعلق منفی فکر رکھتے ہیں اُن کے لیے ایک آئینہ ہے۔ تاریخ سے شغف رکھنے کی وجہ سے غارہائے ایلورہ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اسے دیکھنے کا شوق بیدار ہوا ہے۔

ماسٹر اسداللہ

محلّہ کھٹیکاں، مالیرکوٹلہ (پنجاب)

'اردو دنیا' اکتوبر 2015 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ شمارہ پچھلے شماروں کی طرح خوبصورت کتابت وطباعت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ تمام مشمولات دل چسپ اور ہزار معلوماتی ہیں۔ پرمغز مضمون 'دنیائے ادب کی دس عظیم کتابیں' از جناب غلام نبی خیال بھی شامل شمارہ ہے جس میں کتب کے احوال مختصراً بیان ہیں۔ جو تفصیلاً جانکاری کے لیے تشنگی بڑھاتے ہیں۔

(1) دانتے کا ڈوائن کامیڈی ایک منفرد قسم کا شاہکار ہے، جو حیات بعد از ممات کے تصوراتی سفر پر مبنی ہے۔ اس میں جہنم، اعراف اور جنت کی مصنف کس طرح تصویر کشی کرتے ہیں، جاننے کا ضرور تجسس پیدا ہوتا ہے جبکہ شیخ سعدی اپنے ایک شعر میں ان کی تصاویر اس طرح کھینچ چکے ہیں:

حورانِ بہشتی را دوزخ بود اعراف
از دوزخیاں پرس اعراف بہشت است

(2) شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ بھی خوبصورتی سے بیان ہے۔ واقعات کی ایک اہم کڑی کو مگر فراموش کر دیا ہے۔ بطور کمپلیمنٹ جسے پیش کیا جا رہا ہے، بے شک ''بادشاہِ وقت نے فردوسی کو دربار میں بلا کر شاہنامہ نظم کرنے کی درخواست کی تھی اور شاعر کو ایک ایک شعر کے عوض ایک ایک اشرفی عطا کرنے کا خود اقرار کیا تھا۔ تیس سال کی محنت کے بعد جب فردوسی اپنے عظیم کارنامے کا مسودہ لے کر دربارِ شاہی میں گیا تو وہاں یہ سن کر اس کے دل کو زبردست ٹھیس لگی کہ بادشاہ اپنے وعدے سے مکر گیا تھا اور وہ ایک شعر کے لیے ایک اشرفی دینے سے منکر ہوا۔ فردوسی عالم مجبوری میں خاموشی سے دربار سے نکلا۔''

یہاں تک درست بیان کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کو مگر موصوف کے مندرجہ ذیل الفاظ پر اعتراض ہے کہ ''بادشاہ اس کے بعد اس اضطراب میں مبتلا ہوا کہ اس نے فردوسی کے ساتھ سراسر بے انصافی کی ہے۔ اس نے ایک قاصد کے ہاتھوں ساری رقم فردوسی کے ہاں روانہ کی۔''

بادشاہ اس کے بعد خود بخود اس اضطراب میں مبتلا نہ ہوا تھا کہ اس نے فردوسی سے سراسر بے انصافی کی ہے۔ بلکہ ایک عرصے کے بعد بادشاہ نے فردوسی کے اشعار سنے اور ان کا اثر ہوا وہ رونے لگا اور ساری کی ساری رقم فردوسی کے ہاں روانہ کی۔

ضیاءالدین احمد العلوی امروہی اپنی کتاب مراۃ الانساب کے صفحہ نمبر 41-140 پر یوں فرماتے ہیں:

''کچھ عرصے بعد فردوسی کا ایک شعر سن کر محمود رویا اور کہا میں نے فردوسی کے حق میں ظلم کیا اور اسی وقت ساٹھ ہزار دینار سرخ طوس فردوسی کے پاس بھیجے مگر ایک دروازہ سے طوس میں دینار پہنچے اور دوسرے دروازہ سے حسرت واندوہ کا تابوت یعنی فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ملازمان سلطان نے یہ دینار اُس کی بہن کو پیش کیے مگر اس عالی حوصلہ عفیفہ نے ان کو واپس کر دیا۔''

بادشاہ کے رویے نے شاعر کا دل مجروح کیا۔ جواب میں اس نے محمود کی ایک طویل ہجو نظم کر ڈالی۔ اسی کے اشعار تھے جن کو سن کر بادشاہ رونے پر مجبور ہوئے۔

جاوید اکرم

کیندریہ ودیالیہ، پربندھ نگر، لکھنؤ

نومبر 2015 کا اردو دنیا موصول ہوا۔ اختر الایمان پر گوشہ شائع کر کے آپ نے اس بے چینی اور کرب کو دور کیا ہے جس نے اختر الایمان کی شخصیت اور ان کے فن کو یکسر نظر انداز کر رکھا تھا۔ پہلی بار کسی ذہین اور فطین مدیر کی نظر اس طرف گئی ہے اور آپ نے عظیم فن کار کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کیا۔ آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں اور علمیت سے اردو والوں کو یہ امید ہے کہ آپ ایسی نایاب شخصیات کو نئی نسل سے متعارف کرا کر اردو ادب میں پھر وہی توانائی بھر دیں گے جس کی عرصے سے کمی محسوس کی جارہی تھی۔ مجھے امید ہی نہیں بھرپور یقین ہے کہ بحیثیت این سی پی یو ایل، ڈائرکٹر آپ اردو ادب میں نئے اور صحت مند اضافوں کا سبب بنیں گے۔ آپ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

حنا فردوس

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دنیائے اردو ادب میں خواص وعوام میں بے حد مقبول ومعروف، معیاری اور علمی ماہنامہ 'اردو دنیا' کے شمارہ 11 کی کامیاب اشاعت کے لیے دلی مبارکباد۔ نومبر 2015 کے شمارے میں اپنا مضمون دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی جس کے لیے شعبہ ادارت کی میں بے حد شکر گزار ہوں۔ بہت بہت شکریہ!

نصر ملک

کوپن ہیگن، ڈنمارک

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا 'سرسید نمبر' ملا۔ اس شمارے کے مشمولات اپنے اپنے عنوان کے اعتبار سے جن موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں، ان کے مصنّفین نے انھیں کمال چابکدستی سے رقم کیا ہے۔ عبداللہ سلمان کا مضمون 'متحدہ قومیت اور سرسید' ایک ایسی جاندار تحریر ہے کہ ہمارے لیے 'ہندو مسلم دوستی' کی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی طرح 'سرسید اور بنارس کی اصلاحی سرگرمیاں' بھی ماضی کے آئینے میں حال کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مستقبل کے لیے ایسے اقدامات کی جانب متوجہ کرتا ہے جو ہر قسم کی فرقہ پرستی سے مبرا ہو۔ محترم غلام نبی خیال نے جن کتابوں پر اظہار کیا ہے وہ ان کی وسعت مطالعہ اور عالمی ادب میں قدیم و جدید کے امتزاج کو ظاہر کرتا اور قاری کو متذکرہ کتابوں کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ 'برنن کالج کی اردو خدمات' کے عنوان سے 'اردو دنیا کے اس شمارے میں موجود مضمون میرے لیے بہت معلوماتی رہا اور کئی نئی باتوں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ امید ہے اس طرح کے معلوماتی مضامین آئندہ بھی اردو دنیا میں شائع ہوتے رہیں گے۔ 'ہماری بات' کے عنوان سے جناب پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) نے 'عالمی سطح پر اردو زبان کی نئی بستیوں کے حوالے سے بہت پتے کی بات کی ہے۔ آج امریکہ، کناڈا، انگلستان اور اسکینڈے نیویا کے ممالک، ڈنمارک، ناروے، سویڈن اور اب فن لینڈ میں جو اردو ادب تخلیق پا رہا ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ اردو تخلیق کار اپنی اپنی جگہ پر ان نئی بستیوں میں اردو ادب کی ترقی کے لیے خاصے متحرک ہیں اور ان کا تخلیق کیا ہوا ادب اردو کا ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔

معین الدین شمسی

ٹیچر اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ

'اردو دنیا' اکتوبر 2015 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر مہاتما گاندھی اور سرسید خاں کی دیدہ زیب تصویر کے مابین 'بھارت کے انمول رتن' نوشتہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوا اور کیوں نہیں آج گاندھی کی شخصیت ان کی ذات اور ان کی فکر تمام دنیا کے اجتماعی شعور کا حصہ بن چکی ہے۔ اتنے برسوں کے بعد گاندھی جی کی شخصیت واقعی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ سادگی ایسی کہ زندگی کا بیش تر حصہ ایسے لباس میں گزار دیا جس سے تن کو ڈھانپنا کارِ مشکل ہے۔ بولتے اتنے دھیمے لہجے میں کہ بہترین مقررین میں بھی ان کا شمار نہیں کیا گیا۔ شکل وصورت ایسی کہ دیکھنے میں عام آدمی سے بھی زیادہ عام لگتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ تمام ظاہری اوصاف کی عدم موجودگی میں نہایت غیراہم اور مجہول سے نظر آنے والے اس شخص کو آج عظمتیں سلام کرتی ہیں۔ وہیں سرسید احمد خان کے یہاں قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کے رویوں اور طریقوں کی وکالت تو شروع سے کما حقہ موجود تھی۔ جو اس دور میں انگریزوں کے ذریعے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے نظریے کے تحت فرقہ واریت کو فروغ دینے کے عمل کا مقابلہ کرنے کے لیے اور ضروری اور قابل قدر فکر تھی سرسید کا خیال تھا کہ مہذب حکومت کو مذہبی معاملات میں قطعی غیر متعصب ہونا چاہیے۔ سرسید احمد کے سیکولر اور قومی یکجہتی کے نظریے کی اس سے اچھی مثال کیا ہوسکتی ہے کہ MAO کالج کے دروازے ہمیشہ ہندو اور مسلم طلبا کے لیے یکساں طور پر کھلے رہتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کالج کا پہلا گریجویٹ ایک ہندو طالب علم ہی تھا۔ بہرحال ان دو اہم شخصیت کو 'بھارت کے انمول رتن' کہنا بجا ہے۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی 'ہماری بات' ازحد مفید اور قابل عمل ہے۔ اکتوبر کے شمارے میں گوشہ سرسید احمد خاں نکال کر ان کے کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ باقی مشمولات قابل صد ستائش ہیں۔ کتابوں کی دنیا خوب ہے۔

احمد عثمانی
ایڈیٹر ماہنامہ 'بیباک' مالیگاؤں

اکتوبر 2015 کے 'اردو دنیا' میں جناب انیس امروہوی کا مضمون 'ایک روشن خیال شخصیت بھیشم ساہنی' پڑھنے کے بعد پرانی یادیں ذہن کے دریچے سے نکل آئیں۔ ملک میں جے پرکاش نارائن کی تحریک زوروں پر جاری تھی۔ اس کا سب سے زیادہ اثر بہار پر تھا۔ وہاں جلوس نکلتے تھے، گرفتاریاں ہورہی تھیں۔ ریل روکو تحریک، چکہ جام اور بہت سارے طریقے اپنائے جارہے تھے جس کا اثر پورے ملک پر ہورہا تھا وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی پریشان اور کانگریس حکومت حیران تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ شاعروں، ادیبوں کا ایک بڑا طبقہ جو ترقی پسند کہلاتا تھا اس کا جھکاؤ اندرا گاندھی کی طرف تھا۔ ایسے وقت میں بہار کے گیا شہر میں تین روزہ ترقی پسند کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔

مہاراشٹر سے بہت سارے ادیبوں اور شاعروں کی شرکت کی توقع تھی لیکن چند ہی لوگ شریک ہوئے ان میں دبلے پتلے بھیشم ساہنی، بیمار کیفی اعظمی، ان کی بیگم شوکت کیفی، مراٹھی کے تین شاعر اور یہ راقم الحروف شامل تھے۔

کیفی اعظمی اور شوکت کیفی صاحبہ کو کسی آرام دہ مقام پر ٹھہرایا گیا تھا اور ہمیں ایک اسکول کے ہاسٹل میں ٹھہرایا گیا تھا جو اس وقت تحریک کی وجہ سے خالی کرالیا گیا تھا۔ میں بھیشم ساہنی کے ساتھ ہی تھا۔ میں سب سے کمسن ڈیلی گیٹ تھا اس لیے سبھی لوگ میرا خیال رکھتے تھے۔ سب سے زیادہ بھیشم ساہنی دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہ مجھے اکیلے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔

ہمارا سیشن صبح دس گیارہ بجے کسی کالج کے آڈیٹوریم میں ہوتا تھا۔ آڈیٹوریم لے جانے اور لانے کے لیے سرکاری گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں۔ بہار میں اس وقت کانگریس پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ کلام حیدری اور پروفیسر وہاب اشرفی کا اس کانفرنس میں کلیدی کردار تھا۔ سارے انتظامات ان دونوں حضرات کے ذمے تھے۔ ایک صبح میں نہا دھوکر باہر نکلا تو دو مُشٹنڈے پہلوان کان سے اونچی تیل پلائی لاٹھیاں لے کر میرے آزو بازو آگئے۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ کہا۔ ''خیریت!'' وہ دونوں بولے۔ ''ہم آپ کے انگ رکشک ہیں۔!!'' میں نے دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں پہلوانوں کے بیچ میں بونا لگ رہا تھا۔ میں پلٹ گیا۔

یہ واقعہ بھیشم ساہنی صاحب کو بتایا تو وہ بڑے پیار سے ڈانٹنے لگے۔ ''تم کو منع کیا تھا کہ اکیلے مت جانا۔ کیوں گئے تھے؟ اب مت جانا۔ کہیں جانا ہو تو میرے ساتھ چلنا۔''

میں نے کہا۔ ''کیسے جائیں گے؟ یہ ''انگ رکشک'' تو جاگتے ہیں اور باہر نکلتے ہی آزو بازو آجاتے ہیں۔ بھیشم ساہنی مسکرائے اور کہا۔ ''کل صبح میں ساڑھے تین چار بجے تمھیں جگادوں گا۔ اس وقت یہ گانجہ پی کر سوئے رہتے ہیں۔ کل ہم بودھ گیا جائیں گے اور سیشن کے وقت لوٹ آئیں گے۔ صبح انھوں نے مجھے اور میرے ساتھ ایک نوجوان پنجابی ادیب جس کو امریکی حکومت نے کالے لوگوں کی حمایت میں ہونے والی تحریک میں شرکت کے الزام میں امریکہ بدر کردیا تھا۔ (اس نوجوان ادیب نے ایک ناول 'کالے لوگ' لکھا تھا) ہم دونوں کو بھیشم ساہنی جی نے جگایا۔ جلد ضروریات سے فارغ ہوئے اور بھیشم ساہنی جی کے ساتھ خاموشی سے کیمپس سے باہر آگئے۔ بھیشم ساہنی جی ہم دونوں لڑکوں کے پیچھے باڈی گارڈ کی طرح چلتے تھے۔ بودھ گیا پہنچے تو انھوں نے گائڈ کا کام کیا۔ جس درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بدھ جی کو گیان پراپت ہوا تھا وہ درخت بھی بتایا اور چینی، نیپالی، جاپانی اور تبتی پگوڈے بھی بتائے۔ میں اور پنجابی ادیب ان کے ساتھ واپس نہیں گئے۔ انھوں نے بہت اصرار کیا لیکن ہم کچھ وقت وہاں گذارنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر محمد اشرف
لیکچرار، شعبۂ اردو و فارسی

'اردو دنیا' اکتوبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ گوشۂ سرسید اس عظیم شخصیت کو ایک پرخلوص خراجِ عقیدت ہے۔ سرسید کے افکار و خیالات و نظریات عصرِ حاضر میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ گوشے میں جناب عبداللہ سلمان صاحب کا مضمون 'متحدہ قومیت اور سرسید' خاص طور پر توجہ کا مرکز ہے۔ خراجِ عقیدت کے تحت مضامین بھی قابلِ ستائش ہیں۔ جس میں ڈاکٹر محمد نعمان خان نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور آفاق حسین صدیقی نے بہت ہی قابلِ قدر موضوع کو منتخب کیا۔ ادارت کی بات کی جائے تو مجموعی رسالہ باہمی ہم آہنگی کی مثال پیش کرتا ہے۔ دیگر الفاظ میں کہا جائے تو پورا ہندوستان اس میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

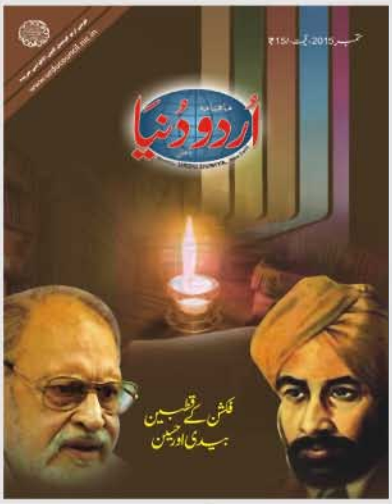

عبداللہ عثمانی
4/17، گدیواڑہ، دیوبند، ضلع: سہارنپور، یوپی

احقر 'اردو دنیا' کا شوق سے مطالعہ کرتا ہے۔ اردو دنیا کا تازہ شمارہ ماہ ستمبر 2015 موصول ہوا جو افسانوی افق کے تاجدار راجندر سنگھ بیدی اور عبداللہ حسین کی شخصیت و خدمات پر مشتمل ہے، سرورق پر یہ جملہ ''اردو کے قطبین: بیدی اور حسین'' بہت جامع اور معنیٰ خیز ہے۔ اداریہ میں بھی قابل قدر فکشن نگار بیدی اور عبداللہ حسین کی خدمات کا ذکر ہے، بیدی کے بارے میں یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ خوش قسمتی سے بیدی کو ایسے معتبر و مستند تحقیق کار ملے جنھوں نے اپنی مخصوص صلاحیتوں سے بیدی کے پورے فن و فکر کو اجاگر کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ اسی کڑی میں بیدی پر تمام مضامین دستاویزی خصوصیت رکھتے ہیں۔ 'اُداس نسلیں' عبداللہ حسین مرحوم کا ایسا کارنامہ ہے جس کو فکشن کی پہچان کہا جائے گا۔ عبداللہ حسین پر، انیس اکرام فطرت، غلام ابن سلطان وغیرہ کی تحریریں قابلِ قدر ہونے کے علاوہ بڑی عرق ریزی سے قلم بند کی گئی ہیں۔ اردو قلمکاروں کے حوالے سے بشر نواز، سرور عثمانی پر بھی اچھے مضامین اس شمارے میں شامل ہیں، کلی طور پر اردو دنیا اردو زبان و ادب کا نقیب اور پاسدار ہے۔

اشفاق احمد عمر

سرسید کی تحریروں کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی شدید ضرورت ہے

پروفیسر اصغر عباس

سرسید مطالعات کے باب میں پروفیسر اصغر عباس ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے سرسید علیہ الرحمہ کے افکار اور اقدار کو اپنی ذات میں اس طور پر جذب کرلیا ہے کہ ان کی ہر تحریر و تقریر سرسید کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور انہی پہ ختم بھی ہوتی ہے۔ علی گڑھ میں سرسید کے بہت سے عاشق ہوں گے مگر سرسید کی تحریروں سے جتنا سچا عشق اصغر عباس نے کیا ہے اس کی نظیر کم ملتی ہے۔ چمنِ سرسید سے ان کا تدریسی رشتہ بھی ہے۔ ان کا شمار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے مخلص اور مشفق اساتذہ میں ہوتا ہے۔ سرسید پر ان کی کتابیں دستاویزی حیثیت کی حامل ہیں۔ دیگر اصناف پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بہت سے اہم کام کیے ہیں اور اس کے علاوہ علی گڑھ کے شب و روز سے ان کی آنکھوں کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ علی گڑھ اردو اور سرسید کے حوالے سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر اشفاق احمد عمر نے ان سے گفتگو کی ہے۔ انٹرویو کے کچھ اقتباسات قارئین کی نذر ہیں: (ادارہ):

اشفاق احمد عمر: محترم آپ فرمائیں کہ آپ کا وطن کہاں ہے اور اپنے خاندانی پس منظر پر بھی روشنی ڈالیے۔

اصغر عباس: میرا وطن مالوف اعظم گڑھ (اب ضلع مئو) کا مردم خیز قصبہ بی بی پور ہے، یہیں 9 اکتوبر 1941 کو پیدا ہوا۔ ابھی چند دن ہوئے مجھے اعظم گڑھ کے موضع خانقاہ کے بارے میں جاننے کی ضرورت پیش آئی، یہ وہی جگہ ہے جہاں شبلی کے جدِ اعلیٰ نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایچ۔ آر نیویل، آئی سی ایس جس نے صوبہ آگرہ اور اودھ کے اضلاع کا گزیٹیر مرتب کیا ہے، اس کی ورق گردانی شروع کی۔ اعظم گڑھ کے گزیٹیر میں خانقاہ کا ذکر تو نہیں ملا لیکن میرے مولد قصبہ بی بی پور، میرے نسبی سلسلہ اور میرے مورث اعلیٰ کا تذکرہ اس میں مل گیا۔

کہا جاتا ہے کہ میرے جد امجد فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں سمرقند و بخارا سے آکر بی بی پور میں آباد ہو گئے تھے۔ ہمارا سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے جنھیں سات ماہ تک رسول اللہؐ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ حفیظ جالندھری نے شاہ نامۂ اسلام میں لکھا ہے:

ابو ایوبؓ کے گھر میں حبیب کبریا ٹھہرے
مگر جب ہوگئی تیار مسجد اس میں آ ٹھہرے

میرے افراد خاندان دربار اودھ کے زمانے میں چکلہ اعظم گڑھ کے قاضی کے عہدے پر مامور ہوا کرتے تھے، یہ سلسلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اقتدار میں بھی باقی رہا۔ جب یوپی میں آزادی سے پہلے Tenancy Act نافذ ہوا تو روزی روٹی میں اضافے اور بچوں کی تعلیم کی غرض سے مذکورہ ایکٹ کے نفاذ کے چند سالوں بعد ہمارا خاندان گورکھ پور شہر میں منتقل ہو گیا جہاں محلہ انچوا میں میرے والد محترم محمد علی عباس کی ننہال تھی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں بی بی پور میں سرسید تحریک کے اثرات پہنچ چکے تھے، اسی لیے بیسویں صدی کے اوائل میں ہمارے گھر کے کئی افراد نے علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ اسی قصبہ بی بی پور کے رہنے والے بریگیڈیر عثمان بھی تھے جنھوں نے کشمیر کے محاذ پر پاکستانی افواج سے لڑتے ہوئے اپنے ملک پر جان قربان کردی تھی۔ جسٹس محمد اسمٰعیل جو ہندوستان میں پاکستان کے پہلے ہائی کمشنر مقرر ہوئے تھے ان کی ننہال بھی قصبہ بی بی پور میں تھی۔ بیسویں صدی کے وسط تک اس قصبے میں خاصی ثقافتی سرگرمیاں رہتی تھیں۔

ا ا ع: آپ نے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کن اداروں سے حاصل کی، ان تعلیمی مراکز کی ان دنوں تہذیبی فضا کیسی تھی؟

اصغر عباس: میری ابتدائی تعلیم قصبہ بی بی پور میں میرے گھر پر ہوئی جو مولوی صاحب مجھے پڑھاتے تھے وہ فربہ اندام اور خاصے سیاہ فام تھے۔ میرا بچپن انھیں کے رعب تلے گزرا۔ جب ہم لوگ گورکھ پور منتقل ہوئے تو میرا داخلہ وہاں کے میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج میں چوتھی جماعت میں ہوا، ان دنوں اس کالج کا زمزمہ اپنے اوج کمال پر تھا۔ ذہین، شائستہ اور شگفتہ طالب علموں کے علاوہ تعلیم و تربیت کو عبادت کی طرح انجام دینے والے شفیق اور سخت گیر اساتذہ سے یہ کالج معمور تھا۔ یہاں میرے اکثر اساتذہ وہ تھے جنھوں نے میرے والد کو بھی پڑھایا تھا۔

یہاں آئے دن تہذیبی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں، یاد پڑتا ہے کہ مصحفی اور انشا کے معرکے کو بھی اس کالج میں اسٹیج کیا گیا تھا جس کی ہدایت میرے اساتذہ شمس الآفاق صاحب اور سید منظور علی صاحب کی تھی۔ اس تمثیل کے سارے کردار کالج کے طلبا نے ادا کیے تھے، یہ ان دنوں اس قدر مقبول ہوئی تھی کہ اہلِ شہر کے اصرار پر اسے لگاتار دو بار پیش کیا گیا۔

ہمارے کالج میں ان دنوں بڑے شاندار مشاعرے ہوئے جن میں گورکھ پور کے ایشوری پرشاد گہر، بھگوتی پرشاد ریحان، رام داس، علیم ساجد علی اخگر، اسد اللہ عباسی، ہندی، جگر، احمر کو میں نے پڑھتے ہوئے سنا۔ کالج کے مشاعروں میں اقبال سہیل، مجروح سلطان پوری، جگر مراد آبادی، روش صدیقی، معین احسن جذبی اور سید حامد کو یہیں میں نے پہلی بار اپنا کلام پڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان دنوں سید حامد کا یہ شعر:

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے اٹھے

اہلِ شہر کی زبانوں پر تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ شعر ان کے شعری مجموعہ لمحات میں موجود نہیں ہے۔

جن دنوں میں اسلامیہ کالج کی نچلی جماعتوں میں تھا دور حاضر کے سب سے بڑے نقاد عالم شاعر اور فکشن نگار شمس الرحمن فاروقی کالج کی اعلیٰ جماعت میں زیر تعلیم تھے اور ان کا ناولٹ 'دلدل سے باہر' قسط وار رسالہ 'معیار' میرٹھ میں شائع ہو رہا تھا اور کالج کے طلبا میں اس کا بڑا چرچا تھا۔ ان باتوں سے اندازہ لگائیے کہ ہمارے کالج کی تہذیبی فضا ان دنوں کیسی تھی، لیکن اب اسے ڈھونڈیے چراغ رخ زیبا لے کر۔

اسلامیہ کالج سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد گورکھ پور یونیورسٹی میں میرا داخلہ بی اے میں ہو گیا۔ ان دنوں وہاں کے شعبۂ اردو میں تنہا ذات ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کی تھی لیکن جلد ہی ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد جنھوں نے مجھے اسلامیہ کالج کی چھٹی جماعت میں بھی پڑھایا تھا اور ڈاکٹر ناصر حسین نقوی کا اضافہ ہوا۔ بی اے میں مجھے پروفیسر پرتاپ سنگھ نے انگریزی پڑھائی تھی، ان اساتذہ کا اندازِ تدریس آج بھی دل پر نقش ہے۔ ایم اے فائنل کا زبانی امتحان لینے کے لیے یہاں علی گڑھ سے سرور صاحب آئے تھے اور انھوں نے مجھے سب سے زیادہ نمبر دیے تھے۔ گورکھ پور یونیورسٹی کا شعبۂ اردو نیا نیا قائم ہوا تھا لیکن ملک میں اس نے جلد ہی اپنی پہچان بنالی۔ ربع صدی کے اندر یہاں کے طلبا نے بڑی تعداد میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو میں اپنے دستخط ثبت کیے، اس شعبے کے سربراہ پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی پیہم جدوجہد سے دین دیال گورکھ پور یونیورسٹی کے ملحقہ ستائیس کالجوں میں اردو کے شعبے کھلے۔ آزادی کے بعد ملک میں اردو کے فروغ کے لیے یہ پہلا کارنامہ تھا جس کی کوئی دوسری مثال اب تک نہیں ملتی۔

گورکھ پور یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آ گیا یہاں سے لائبریری سائنس میں ڈگری لینے کے بعد میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں سر سید کے عہد آفریں اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے پر پی ایچ ڈی کے لیے کام شروع کیا۔ یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سر سید پر پہلا پی ایچ ڈی کا کام تھا جب کہ یہاں عرصے سے تحقیق کا کام ہو رہا تھا۔ ان دنوں علی گڑھ کے شعبۂ اردو نے برصغیر ہی میں نہیں ساری دنیا میں اپنے علمی ادبی تحقیقی روایت کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر آل احمد سرور تھے جن کے اسلوب تحریر ہی پر نہیں ان کے لکچروں پر بھی طلبا فدا رہتے تھے۔ وہ اردو زبان و ادب کے عارف اور اردو تحریک کے قائد کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے منتخبات میں گنے جاتے تھے۔ ان دنوں شعبۂ اردو میں معین احسن جذبی صاحب اور خورشید الاسلام صاحب سینئر استادوں میں تھے۔ مجنوں گورکھ پوری جنھوں نے گورکھ پور میں میرے والد کو پڑھایا تھا، ان دنوں یہاں کے شعبۂ اردو سے منسلک تھے۔ اس کے علاوہ قصبہ بی بی پور ضلع اعظم گڑھ کے ڈاکٹر محمد عزیر تھے جن کی کلاسیکی ادب پر گہری نظر تھی۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ ان کا قابلِ قدر تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہاں ریسرچ میں میرے داخلے کے دو سال بعد یہ دونوں حضرات شعبے سے سبک دوش ہو کر کراچی چلے گئے۔ شعبے میں نسیم قریشی صاحب تھے جنھوں نے علی گڑھ میگزین کا سر سید نمبر نکالا تھا جسے بعد میں علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ نسیم صاحب کی بذلہ سنجی اور تقریر کی دھوم تھی، وہ مجلسی آدمی تھے۔ مجھے ان کے ساتھ سکنڈ شو سینما جانے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ خلیل الرحمن اعظمی صاحب تھے جن کی اردو کے عصری رجحانات پر گہری نظر تھی، وہ مجھ سے محبت سے پیش آتے تھے۔ شعبے میں خواجہ مسعود علی ذوقی صاحب تھے جن کے چیمبر میں مجھے بیٹھنے کی انھوں نے اجازت دے رکھی تھی۔ کچھ دن بعد شعبے میں اندور سے ڈاکٹر شمیم حنفی صاحب آئے جو میری مدد کو تیار رہتے تھے۔ شعبے میں لسانیات کے درس کے لیے کچھ دنوں کے لیے ڈاکٹر عبدالعظیم صاحب اور چودھری محمد نعیم صاحب بھی آئے تھے، اس کے علاوہ ڈاکٹر مسعود عالم صاحب شاہ جہاں پور سے آئے تھے، شعبے میں ان حضرات سے میرے روابط رہے۔ ان کے علاوہ شعبے میں دوسرے اساتذہ بھی تھے، کہا جاتا تھا کہ اساتذہ اور طلبا کی تعداد اور علمی کاموں کے لحاظ سے یہ دنیا میں اردو کا سب سے بڑا شعبہ تھا۔

ریسرچ کے کام کے دوران سرور صاحب نے جو انجمن ترقی اردو ہند کے اعزازی جنرل سکریٹری تھے، انجمن کے ہفتہ وار اخبار ہماری زبان اور اس کے سہ ماہی رسالہ اردو ادب کا مجھے اسسٹنٹ مقرر کر دیا۔ اس جگہ کو کنور اخلاق محمد خاں شہریار نے چھوڑا تھا جو شعبۂ اردو میں لکچرر ہو گئے تھے۔ تقریباً چار برس تک یہ کام میرے سپرد رہا۔ ریسرچ کے دوران مجھے شعبۂ اردو کے سمینار کا انچارج بھی مقرر کر دیا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے دن رات کام میں لگا رہنا ہوتا لیکن ان کاموں سے مجھے علمی فائدہ ہوا، اور مالی لحاظ سے بھی میں بے فکر رہا۔

ہندوستان کی جامعات کے اردو شعبوں میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے کسی موضوع پر سمینار کے انعقاد کی پہلی بار طرح ڈالی۔ سرور صاحب کی سربراہی میں جدیدیت پر غالب، سر سید، اقبال اور اردو فکشن پر بڑے تاریخی سمینار ہوئے۔

ا ا ع: آپ نے درس تدریس کا سلسلہ کہاں سے، کب سے شروع کیا اور کب سبک دوش ہوئے؟

اصغر عباس: شعبۂ اردو میں تدریس کا کام میں نے 1969 سے شروع کیا، ملازمت کے دوران شعبے کی جانب سے 'رشید احمد صدیقی آثار و اقدار' کے عنوان سے مضامین کا مجموعہ شائع کیا جسے برصغیر میں تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا۔ جن دنوں مجھ پر شعبے کی ذمہ داری تھی، شعبۂ اردو نے علی سردار جعفری اور پروفیسر آل احمد سرور پر قومی سمینار کا انعقاد کیا۔ آل احمد سرور سمینار کا ہندوستان و پاکستان کے اخبار و جرائد میں بڑا ذکر ہوا۔ اس کا ایک سبب سرور صاحب کی شخصیت تھی لیکن یہ بھی تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا سمینار تھا جو کسی زندہ شخصیت پر منعقد ہوا تھا، اس میں سرور صاحب بہ نفس نفیس شریک تھے۔ اس کی صدارت

سوانحی کوائف

نام: اصغر عباس

والد کا نام: جناب حاجی محمد علی عباس صاحب (مرحوم)

والدہ: محترمہ عزت النساء (مرحومہ)

پیدائش: 19 اکتوبر 1941 بی بی پور، اعظم گڑھ، یوپی

تعلیم: (پی ایچ ڈی) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ اور اس کے اثرات اردو صحافت پر (پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی زیر نگرانی)

ملازمت: 1969 سے 2003 تک علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی شعبہ اردو میں

تصانیف و تالیفات: سید احمد خاں رترجمہ، سر سید کی صحافت، سر سید، اقبال اور علی گڑھ، سر سید کی تعزیتی تحریریں، انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، انتخاب مضامین ذکاء اللہ، سر سید کا سفر نامہ مسافران لندن، پرنٹ کلچر سر سید علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (انگریزی میں Primus Books, Delhi)، اردو کا جمالیاتی ادب اور علی گڑھ، ارمغانِ آل احمد سرور، عرفانِ سید حامد، رشید احمد صدیقی آثار و اقدار، سردار جعفری شخصیت اور فن، سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی، مولوی سید سبحان اللہ عظیم گورکھپوری کا سفر نامۂ حج

مضامین: سو سے بھی زائد مضامین ہندوستان و پاکستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے

بیرونی سفر: پاکستان، انگلینڈ، ماریشس، تاشقند، سعودی عرب

اعزازات و انعامات: ❖ اردو اکیڈمی لکھنؤ، یوپی ❖ حالی ایوارڈ اردو اکیڈمی، ہریانہ ❖ امتیاز میر ایوارڈ

موجودہ پتہ: گلشن دوست، سر سید نگر سول لائنس علی گڑھ۔

سید حامد صاحب نے کی تھی اور کلیدی خطبہ شمس الرحمن فاروقی نے دیا تھا۔ اس سمینار میں جو مقالے پڑھے گئے اسے انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے بہ اصرار انجمن سے 'ارمغان سرور' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اسی دوران شعبۂ اردو نے پروفیسر قیصر جہاں کی نگرانی اور نوید انجم کی ادارت میں علی گڑھ میگزین کا خواتین نمبر شائع کیا جسے قبول عام حاصل ہوا تھا۔ مجھے اس کی بھی بڑی خوشی ہوئی تھی جب پہلی بار شعبے سے اُنیس طلبا یو جی سی کے نٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں طلبا کی کامیابی اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں شعبے کے ڈی ایس اے کے پروگرام کی ذمے داری بھی مجھ پر تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس پروگرام کا خصوصی موضوع علی گڑھ تحریک کو قرار دیا جائے۔ سوچا تھا کہ اس طرح علی گڑھ تحریک پر کچھ ڈھنگ کا کام ہو جائے گا لیکن میری ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ 2003 میں شعبے کے تدریسی کاموں سے سبک دوش ہو گیا لیکن 2002 میں مجھے یونیورسٹی نے سرسید اکادمی کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا۔

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ سرسید کی وفات کے بعد یونیورسٹی سے بانیِ درس گاہ کی کوئی تصنیف شائع نہ ہو سکی حالاں کہ یونیورسٹی میں اپنا پریس اور پبلی کیشنز ڈویژن بھی موجود تھا۔ یہ تو خدا بھلا کرے سرسید کے رفیق سید ممتاز علی کے بیٹے سید امتیاز علی تاج کا جن کی مساعی اور رہنمائی میں شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے مجلس ترقی ادب لاہور سے اٹھارہ جلدوں میں سرسید کی تحریریں مرتب کر دیں، لیکن ابھی علی گڑھ میں سرسید کی بڑی تعداد میں غیر مدوّن تحریریں موجود ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہونے کا منہ دیکھ رہی ہیں۔ اگر انھیں مرتب کیا جائے تو وہ کم از کم بیس جلدوں میں آئیں گی۔

2002 سے 2008 تک سرسید اکادمی نے سرسید کی مرتب کردہ آئین اکبری، تاریخ فیروز شاہی، تزک جہاں گیری، آثار الصنادید کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن اور خطباتِ احمدیہ تازہ مقدمات کے ساتھ ان کا عکسی ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے علاوہ اکادمی کے فیلو پروفیسر اقبال حسین نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی دو جلدوں میں دستاویزات، سید محمود پیپرس اور دستاویزات محسن الملک شائع کیا۔ سرسید اکادمی نے دو سو صفحات پر مشتمل سرسید کی سوانح سنسکرت، ملیالم، تامل، تیلگو زبانوں میں لکھوائیں اور شائع کیں۔ اس پروگرام کا آغاز پروفیسر صلاح الدین عمری کی عربی سوانح اور سرسید کے منتخب مضامین کے عربی ترجمے سے ہوا۔ اس طرح عالم عرب کو سرسید کے افکار و خیالات سے پہلی بار روشناس کرانے کا اعزاز پروفیسر صلاح الدین عمری کو حاصل ہوا۔

سرسید کی بے مثل سوانح، حیات جاوید کے صرف پہلے حصے کا اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے ڈیوڈ میتھیوز اور ڈاکٹر خالد حسن قادری نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، یہ نامکمل تھا۔ سرسید اکادمی نے مکمل حیات جاوید کا نئے سرے سے انگریزی میں ترجمہ کرایا اور شائع کیا۔ اس کے علاوہ سرسید کے منتخب مضامین، منتخب مکتوبات اور منتخب خطبات کا اکادمی کے فیلو ڈاکٹر حمید اللہ اور عبد المنان صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کیا اور اکادمی نے شائع کیے۔

اا ع: سرسید سے آپ کی دلچسپی کے اسباب کیا ہیں؟

اصغر عباس: غالباً ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا جب میں نے سرسید کے دو مضامین خوشامد اور بحث و تکرار پڑھے، دونوں مجھے پسند آئے، سن شعور کی منزلیں طے کرتے ہوئے سرسید سے شیفتگی بڑھتی گئی۔ علی گڑھ آیا تو سرور صاحب نے علی گڑھ گزٹ پر تحقیقی کام کرنے کے لیے کہا۔ اسی دوران

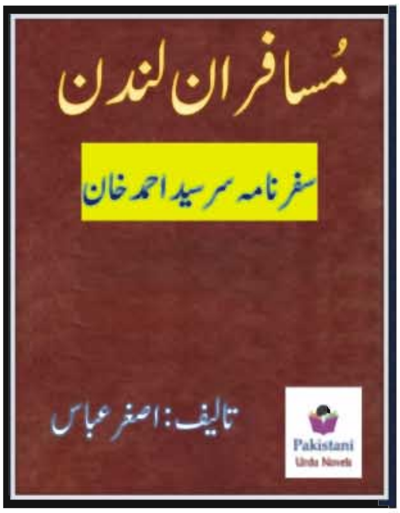

سرسید کے مکتوبات اور خطبات پڑھے جس سے ان کی جامعیت کا انداز ہوا۔ ان کی بے خوفی، دلیری اور نبض دوراں پر ان کی اچھی گرفت کا قائل ہوا اور پھر جو کہا جاتا ہے کہ یک در گیر و محکم گیر وہی میرے ساتھ ہوا۔ مجھے سرسید اور ان کے رفقا کی تحریریں پڑھتے ہوئے مسرت و انبساط کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان پر لکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ کسی شے کی کمی کا احساس رہتا ہے۔

اا ع: کیا آپ کی یونیورسٹی میں بنگال شانتی نکیتین یونیورسٹی کی طرح اپنے بانی کے افکار و خیالات سے روشناس کرانے کے لیے طلبا کے لیے کوئی لازمی نصاب ہے؟

اصغر عباس: شانتی نکیتن یونیورسٹی میں اس کے بانی کا نام لینے کے بجائے احتراماً یونیورسٹی کا ہر فرد انھیں 'گرودیو' کہتا ہے۔ وہاں بی اے کی سطح تک طلبا کے لیے ٹیگور اسٹڈیز لازمی ہے۔ ہماری یونیورسٹی میں ایسا کچھ نہیں ہے یہاں ایسے افراد بھی ہیں جو صرف سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر سرسید کے خلاف اپنے تخیل کی باگ کھلی چھوڑ دیتے ہیں اور اس باب میں یہاں مسٹر اور مولانا کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ایسی فضا میں سرسید کے افکار و خیالات پر مشتمل کسی نصاب کا طلبا کے لیے لازمی کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تقریباً نصف صدی سے میں نے یہ دیکھا ہے کہ یہاں کی کورٹ، اکیڈمک کونسل اور ایکزیکیوٹو کونسل کے منصوبوں میں جدید ہندوستان کے معمار سرسید کے افکار و خیالات کی ترویج کی کوئی شق شامل نہیں رہی ہے۔ یہی حال ساری دنیا میں پھیلے اس کے سابق طلبا اور طالبات کا بھی ہے، وہ بھی اس سلسلے میں قطعی حساس نہیں ہیں۔

اا ع: دو برس بعد 2017 میں سرسید کی پیدائش کو دو سو برس ہو جائیں گے، کیا اس سلسلے میں آپ کی یونیورسٹی نے کوئی علمی منصوبہ تیار کیا ہے؟

اصغر عباس: انیسویں صدی میں اردو ادب کا ایک عہد سرسید کے نام سے منسوب ہے لیکن اردو سرسید کی صرف ایک جہت تھی ان کی اور بہت سی جہات ہیں جو ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ ان پر صرف شعبۂ اردو ہی میں نہیں، شعبۂ تاریخ، پولیٹیکل سائنس، سوشیالوجی، ایجوکیشن، دینیات، اسلامک اسٹڈیز، لا، ماس کمیونی کیشن اور اکنامکس کے شعبوں میں ایک نہیں کئی کئی پی ایچ ڈی کا کام ہو سکتا ہے۔ اگر یونیورسٹی نے اس پہلو پر توجہ دی ہوتی تو 2017 تک کئی افراد ایسے تیار ہو گئے ہوتے جن کی سرسید کے کاموں پر نظر ہوتی، وہ جشن سرسید میں مفید کام انجام دیتے۔

2017 کے سرسید کے یوم پیدائش کے جشن کے سلسلے میں یونیورسٹی کو یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ اب اس کی بڑی ضرورت ہے کہ یونیورسٹی میں ایک ٹرانس لیشن بیورو قائم کیا جائے جہاں سرسید کی تحریروں کو انگریزی کا جامہ پہنایا جائے تا کہ جدید ہندوستان کے معمار کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آئے اور ذہنوں میں اس سلسلے میں جو جالے ہیں وہ صاف ہوں۔

اا ع: کیا آپ سرسید کے حوالے سے نئی نسل کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

اصغر عباس: جناب! میری یہ بساط نہیں کہ کوئی پیغام دوں لیکن میری یہ تمنا ضرور ہے کہ آج کے نوجوان خاص طور پر علی گڑھ کے، انھیں چاہیے کہ وہ سرسید کی تحریروں کی تشریح موجودہ علوم کی روشنی میں کریں اور اپنی شخصیت کی تعمیر نو کے ساتھ سرسید کے اس خواب کو پورا کرنے کا عہد کریں جو انھوں نے ہندوستان کے شاندار مستقبل کے لیے دیکھا تھا۔ جس میں آزاد تحقیق، رواداری، بلند نظری اور اخلاق شامل ہیں۔

■

Ashfaque Ahmad Umar, 172 Tapti Hotel, JNU, New Delhi-67, M.: 9868479143
E-mail.:ashfaq.2013@gmail.com

اسد رضا

اوّلین شہید صحافی مولانا محمد باقر

اگرچہ آج تک دنیا میں سیکڑوں صحافیوں کو مختلف ممالک میں شہید کیا جا چکا ہے، لیکن یہ افتخار اردو زبان کو ہی حاصل ہے کہ جس نے عالم انسانیت کو ایسا پہلا صحافی دیا، جسے 1857 کی جنگ آزادی میں سامراجیوں نے گولیوں سے بھون کر شہید کر دیا تھا۔ اُس صحافی کا نام مولانا محمد باقر تھا۔ مولانا اس معروف اخبار 'دہلی اردو اخبار' کے مدیر تھے، جس نے وطن عزیز ہندوستان میں 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے دوران مجاہدین کو فرنگیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ صرف حوصلہ بلکہ انھیں متحد ہونے کا پیغام بھی دیا تھا۔ تاہم مولانا کی ملّی وصحافتی خدمات اور شہادت پر روشنی ڈالنے سے قبل محمد باقر مرحوم کے خاندان اور ان کی تعلیم وتربیت کے بارے میں تذکرہ کرنا بھی مناسب ہوگا۔ مولانا محمد باقر کے والد مولانا محمد اکبر مشہور عالم دین تھے۔ علامہ امداد صابری نے اپنی تصنیف 'تاریخ صحافت اردو' جلد اول، صفحہ 202 پر تحریر کیا ہے:

''ان کے والد مولانا محمد اکبر دہلی کے نامی گرامی عالم دین اور مجتہد تھے۔ ان کے اجداد عہد نادری میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ یہاں پہلے ریاست کشمیر اور پھر علاقہ دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا۔''

مولانا باقر چونکہ اپنے والدین کے اکلوتے فرزند تھے لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ ان کا پسر بھی دینی اور دنیوی علوم حاصل کر کے انھیں کی طرح دین کی ترویج کرے۔ لہٰذا محمد باقر نے خوب تعلیم حاصل کی۔ 1825 میں انگریز دہلی کالج قائم کر چکے تھے۔ مولانا نے اس کالج سے تعلیم بھی حاصل کی اور یہاں استاد بھی مقرر ہوئے۔ ذریعہ معاش کے لیے سرکاری ملازمت بھی کی لیکن صحافت کی جانب فطری رجحان ہونے کے باعث مولانا نے دہلی کالج سے اس کا ایک فاضل لیتھو پریس خریدا اور پھر دوران ملازمت 28 فروری 1837 کو 'دہلی اخبار' کے نام سے ایک اردو اخبار کی اشاعت شروع کر دی۔ چونکہ ملازمت کے ساتھ وہ انگریزی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کے تحت اخبار نہیں نکال سکتے تھے۔ لہٰذا اخبار پر بطور مدیر باقر صاحب نے اپنا نام نہیں دیا، لیکن ہندوستانی ملازمین کے ساتھ انگریزوں کے سوتیلے برتاؤ اور دیسی ملازمین کو کم تنخواہ کی وجہ سے مولانا خوش نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور اشاعت دین کے ساتھ ساتھ اپنے اخبار کے لیے ہمہ وقت کام کرنے لگے۔ 10 مئی 1840 کو مولانا نے اپنے اخبار کا نام 'دہلی اخبار' کی بجائے 'دہلی اردو اخبار' رکھا۔ اپنے اخبار کے نام کے ساتھ 'اردو' کے لاحقے سے محمد باقر نے یہ ثابت کیا کہ عربی وفارسی کا عالم ہونے کے باوجود انھیں اپنی مادری اور ہندوستان کی عوامی زبان سے بہت زیادہ محبت تھی۔ یہاں یہ بتانا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ انیسویں صدی میں اردو کے کئی اخبارات نصف فارسی اور نصف اردو زبان میں شائع ہوتے تھے۔ خود اُردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' مکمل طور پر اردو کا اخبار نہیں تھا بلکہ اس کا آدھا حصہ فارسی اور بقیہ نصف اردو پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی انیسویں صدی سے صرف اردو کا اخبار شائع کر کے مولانا نے کاروانِ صحافت کو آگے بڑھانے میں قابل قدر رول ادا کیا۔ ان کی صحافتی خدمات کا تذکرہ ہم چند عنوانات کے تحت کر سکتے ہیں۔

پہلا عنوان 'ادبی صحافت' ہے۔ مولانا باقر حالانکہ ایک عالم دین تھے لیکن انھوں نے 'دہلی اردو اخبار' کا ایک حصہ ادبی صحافت کے لیے بھی وقف کر رکھا تھا۔ جس میں اس دور کے

10/مئی 1840 کو مولانا نے اپنے اخبار کا نام 'دهلی اخبار' کی بجائے 'دهلی اردو اخبار' رکھا۔ اپنے اخبار کے نام کے ساتھ 'اردو' کے لاحقے سے محمد باقر نے یه ثابت کیا که عربی وفارسی کا عالم ہونے کے باوجود انهیں اپنی مادری اور ہندوستان کی عوامی زبان سے بهت زیادہ محبت تهی۔ یهاں یه بتانا بهی غیر مناسب نه ہوگا که انیسویں صدی میں اردو کے کئی اخبارات نصف فارسی اور نصف اردو زبان میں شائع ہوتے تهے۔ خوداُردو کا پهلا اخبار 'جام جهاں نما' مکمل طور پر اردو کا اخبار نهیں تها بلکه اس کا آدها حصه فارسی اور بقیه نصف اردو پر مشتمل ہوتا تها۔

شعرا کی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں اور بڑے ادیبوں وشعرا مثلاً مرزا اسداللہ خاں غالب اور استاد ذوق کی نوک جھونک کے علاوہ دیگر ادبی واقعات بھی شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار میں ذوق کے علاوہ بہادرشاہ ظفر، مرزا غالب، حافظ غلام رسول، مرزا محمد علی بخت، مرزا حیدر شکوہ اور خود مولانا کے فرزند اور معروف شاعر وادیب مولانا محمد حسین آزاد کی تخلیقات بھی زینت اشاعت بنتی تھیں۔ دہلی اردو اخبار کا ادبی حصہ اتنا اہم ہے کہ اگر کسی یونیورسٹی کا شعبہ اردو یا دہلی اردو اکادمی اس کی تدوین کرائے تو خاصی ضخیم کتاب عالم وجود میں آسکتی ہے۔

دہلی اردو اخبار کے دوسرے اور سب سے اہم حصے کو ہم سیاسی صحافت کا عنوان دے سکتے ہیں۔ مولانا محمد باقر کا سیاسی شعور کافی پختہ تھا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی داؤ پیچ کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے اور مغل بادشاہ بہادرشاہ ظفر کی سیاسی مجبوریوں سے بھی واقف تھے۔ دیسی نوابوں اور راجاؤں و مہاراجاؤں کی بساط سیاست پر چالوں کو بھی وہ خوب سمجھتے تھے۔ یہاں یہ تذکرہ بھی مناسب ہوگا کہ اپنے اخبار میں مولانا علیحدہ علیحدہ کالموں میں سیاسی خبریں اور تجزیے شائع کیا کرتے تھے۔ مثلاً مغل بادشاہ، شاہزادوں اور لال قلعے کی خبریں ایک کالم میں چھپتی تھیں تو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی سے متعلق خبروں اور واقعات کو مولانا باقر دوسرے کالم میں شائع کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صحافی مولانا باقر نے ان کالموں کو باقاعدہ نام بھی دیا تھا۔ مثال کے طور پر وہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں سے متعلق خبروں کو 'صاحب کلاں بہادر' نامی کالم کے تحت شائع کرتے تھے۔ اسی طرح 'دہلی اردو اخبار' میں بہادرشاہ ظفر اور لال قلعے سے متعلق اطلاعات اور خبروں کو وہ 'حضور والا' کالم کے عنوان سے چھاپتے تھے۔ اگرچہ ان کالموں میں صحافی مولانا باقر عموماً اعتدال کا دامن تھامے رہتے تھے لیکن کوئی بات یا واقعہ ناگوار محسوس ہوتا تو اس پر سخت ردعمل کا اظہار بھی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انگریزوں نے ملک کے مسلمانوں کو بہکانے اور ہندوؤں سے الگ کرنے کے لیے دہلی کی جامع مسجد پر ایک اشتعال انگیز اشتہار لگایا، جس میں کہا گیا تھا کہ کارتوسوں میں گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے لہٰذا مسلم سپاہی مشتعل نہ ہوں۔ مولانا باقر نے اپنے اخبار میں اس اشتہار پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا 'کوئی پوچھے کہ کیا اس سے دین ہندو کا نہیں بگڑتا۔ اب ان (انگریزوں) کی کس بات کا اعتبار کیا جائے۔ بہرکیف

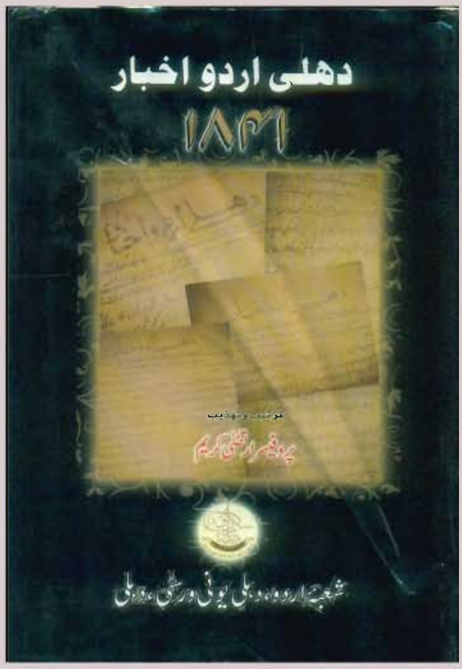

شاہ جہاں آباد دہلی کا پہلا اردو اخبار 'دہلی اردو اخبار' کی سیاسی اور ادبی اہمیت کے پیش نظر ہی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے دہلی اردو اخبار کے 26 جنوری 1840 سے 20 دسمبر 1840 تک کے شماروں کو 'دہلی اردو اخبار (1840)' کے عنوان سے مرتب کیا تھا جو 1972 میں شائع ہوا۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 1841 کے دہلی اردو اخبار کے شماروں کو مرتب کیا جو شمارہ نمبر 203 مورخہ 10 جنوری 1841 سے شمارہ نمبر 257 مورخہ 26 دسمبر 1841 پر محیط ہے۔ یہ 2010 میں 'دہلی اردو اخبار 1841' کے عنوان سے شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے جشن زریں تقریبات نے موقعے پر شائع ہوا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ ''سیاست سے قطع نظر دہلی اردو اخبار کی ادبی اہمیت بھی ہے۔ اول تو یہ کہ مولوی محمد باقر اور مولوی محمد حسین آزاد اس کے دامن سے وابستہ تھے جن کی علمی حیثیت مسلم ہے۔ دوسرے غالب، ظفر، ذوق، حافظ غلام رسول ویران، مرزا نورالدین، خلف مرزا اشکوہ، مرزا جواں بخت، مرزا حیدر شکوہ اور نواب زینت محل سے متعلق اس میں بے مثل مواد ملتا ہے۔ ان اوراق کے مطالعے سے غالب کی زندگی کو ہم سماج کے ایک بڑے نقشے میں دیکھ سکتے ہیں۔''

دہلی اردو اخبار کے اور بھی پرانے شمارے نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، عثمانیہ یونیورسٹی وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ ان پرانے بوسیدہ شماروں کی اشاعت بھی اس وقت کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر ادبی حصے کی تدوین اور تحقیق کی جائے تو ادب کی بہت سی جہتیں روشن ہوسکتی ہیں۔ (ادارہ)

سپاہ اسلام عین عاقبت اندیشی کے سمجھ گئے کہ آج یہ ظلم ہندو پر ہے کل ہم پر ہے۔' اس طرح صحافی محمد باقر نے نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ مسلم فوجیوں کی جانب سے بھی انگریز کے ہندو مسلم نفاق کے خودساختہ عقیدے کو اپنے اخبار کے ذریعے مسترد کردیا اور انگریزوں کی سازش کو ناکام بنادیا۔

مولانا باقر نے خبروں اور رپورٹوں کے ساتھ ساتھ مجاہدین آزادی کا حوصلہ بڑھانے والی نظمیں بھی 'دہلی اردو اخبار' میں شائع کیں۔ مثلاً مولانا کے فرزند مولانا محمد حسین آزاد کی ایک پرجوش اور فکر انگیز نظم بعنوان 'تاریخ انقلاب: عبرت افزا' شائع کی۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ چشم زدن میں
ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاں دار
تھی صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت
تھی صاحب جاہ و حشم و لشکر جرّار
اللہ ہی اللہ جس وقت کہ نکلے
آفاق میں شیخ غضب حضرت تہّار
کام آیا نہ علم و ہنر نہ حکمت و فطرت
یورپ کے تلنگو نے لیا سب کو یہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گردشِ گردوں بھی عجب گردشِ دوّار
نیرنگ پہ غور اس کے جو تو عیاں ہے
ہر شعبدۂ تازہ میں صد بازیِ عیار
عزت کے لیے خلق میں یہ سانحہ بس ہے
گر دیوے خدا عقل سلیم و دل ہشیار

مولانا باقر ایک فطری صحافی تھے۔ انھیں اپنے وطن اور مجاہدین آزادی سے نہایت محبت تھی، لہٰذا ان کا اخبار بھی

مئے حب الوطنی سے لبریز رہتا تھا۔ مثال کے طور پر باقر مرحوم نے 1857 کی جنگ آزادی میں انگریز حکمرانوں کی ابتدائی ناکامی کا تذکرہ چٹخارے دار زبان میں کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اب کہاں ہیں انگلش مین اور جنٹل مین آف انڈیا اور وہ لن ترانیاں حکمت و حکومت داناؤں انگلستانیوں کی۔ اب دیکھیں کہ شہر دیہات ہندوستان کے بے جرأتوں اور نادانوں اور بے عزموں اور بے بند بستوں نے ان کے اہل حکمت و اہل جرأت صاحبانِ عزم وانتظام کو کس نوبت پر پہنچادیا۔''

مولانا 'دہلی اردو اخبار' میں واقعات و حالات کا تجزیہ بھی کیا کرتے تھے۔ میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے صحافی محمد باقر نے اپنے اخبار میں تحریر کیا 'بجرم انکار 85 سوار اس میں سے قید ہوئے کہ یوم یک شنبہ کو حمیت دینی اور حمیت مذہبی نے جوش کیا اور دفعتاً تمام اہل پلٹن و رسالہ جو شخص جس حال میں تھا ہتھیار سنبھال کر اول جیل خانہ سے اپنے برادران اسلامی کو چھڑا لائے اور مع پلٹن در پے انگریزوں اور گوروں کے ہوئے اور جہاں ملے تہ تیغ کیا حتیٰ کہ سب انگریز اور گورے مضطر دمدمہ میگزین میں محصور ہوئے اور غازیان نامی راہی دہلی ہوئے۔''

مرحوم باقر نے ہندوستان کے مختلف شہروں بالخصوص یوپی کے شہروں اور قصبات کے مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں اور انگریزوں کے ساتھ ان کے معرکوں کو بھی اپنے اخبار میں پیش کیا۔ اس طرح ان کے اخبار 'دہلی اردو اخبار' کی بدولت نہ صرف دیگر علاقوں کے باشندوں کو پہلی جنگ آزادی کے واقعات کا علم ہوگیا تھا بلکہ وطن کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کا جذبہ بھی پیدا ہوتا تھا اور حوصلہ بھی ملتا تھا۔ مثلاً چند شہروں کی خبریں ملاحظہ فرمائیں۔ آگرہ میں مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں اور انگریزوں کی پسپائی کا حال 'دہلی اردو اخبار' میں اس طرح بیان کیا گیا:

''آجکل یہ افواہ ہے کہ محل جنابہ بیجا بائی کا آگرہ میں فتح ہوگیا۔ بعض کہتے ہیں کہ خود انگریزوں نے ان کو سونپ دیا۔ امید ہے غازی بروقت مدد پائے، غازیوں کی بہ عنایت الٰہی گوروں کو دم بھر میں چھانٹ ڈالیں گے۔''

اسی طرح صحافی باقر مرحوم نے کول (علی گڑھ) کے بارے میں اپنے اخبار میں یہ لکھا تھا:

''سنا گیا ہے کہ چار کمپنیاں کول کی بھی انگریزوں کا منہ کالا کر کے حضور سلطانی میں آحاضر ہوئیں یعنی جو انگریز پایا اسے موت کے گھر پہنچایا اور خزانہ خوب لٹایا۔ تمام رعایا نے وہاں خوب لوٹا۔''

غازی آباد کی خبر دیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''گوجروں نے کسی طرح ایک دو توپ قبضے میں کر کے غازی آباد کو اڑا دیا اور خوب لوٹ کی۔''

کانپور میں بھی بغاوت کے اثرات نظر آئے جس کا ذکر صحافی باقر نے ان الفاظ میں اپنے اخبار میں کیا تھا: ''کانپور کا حال بھی مثل سب جگہ کے سنا گیا۔ جہاں انگریزوں کو پایا جاتا ہے، مارا جاتا ہے۔''

مولانا باقر دھلی کی ثقافتی سرگرمیوں اور ادیبوں کے حالات وواقعات کو بھی اپنے اخبار میں پیش کرتے رہے۔ مثال کے طور پر جب مرزا اسداللّٰہ خاں غالب کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کیا گیا تو یہ خبر 'دھلی اردو اخبار' میں اس طرح شائع ہوئی 'سنا گیا ہے کہ ان دنوں گزر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثلاً ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے، بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب وطلب و کثرتِ مردماں کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانے دار قوم سے سیّد اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔

مولانا باقر ایک فطری صحافی تھے لہٰذا انھوں نے صرف سیاسی خبریں ہی 'دہلی اردو اخبار' میں شائع نہیں کیں بلکہ ثقافتی اور ادبی خبروں کو بھی اپنے اخبار میں مناسب جگہ دی لیکن 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے واقعات ہی اخبار پر عموماً چھائے رہے۔ چونکہ میرٹھ چھاونی سے پہلی جنگ آزادی کا آغاز سپاہی منگل پانڈے نے کیا تھا۔ لہٰذا صحافی باقر مرحوم نے میرٹھ کے بارے میں 'دہلی اردو اخبار' میں لکھا:

''رسالہ ترک سواران غازی پور کا اور پلٹن نام پہلے سے برسر پرخاش تھی اور ان سے بابت کارتوس کے کہ چربی اور جھلی وغیرہ اس پر منڈھی ہوئی ہے۔ مثل پلاٹن مقامات دیگر حسب مندرجہ اخبار سابق تکرار در پیش تھی کہ انجام کو بجرم انکار 85 سوار اس میں سے قید ہوئے۔''

مولانا باقر دہلی کی ثقافتی سرگرمیوں اور ادیبوں کے حالات و واقعات کو بھی اپنے اخبار میں پیش کرتے رہے۔ مثال کے طور پر جب مرزا اسداللہ خاں غالب کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کیا گیا تو یہ خبر 'دہلی اردو اخبار' میں اس طرح شائع ہوئی 'سنا گیا ہے کہ ان دنوں گزر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثلاً ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے، بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب وطلب و کثرتِ مرد ماں کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانے دار قوم سے سیّد اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ مرزا نوشہ ایک شاعر، نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کر کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علیٰ قدر مراتب ہوا، مرزا نوشہ پر سو روپے نہ ادا کریں تو چار مہینے قید۔''

مولانا باقر مرحوم نے مستقبل کے صحافیوں اور مورخین کے لیے یہ بھی بتایا کہ ایک صحافی یا مدیر کو کیسا ہونا چاہیے اور اس کا فرض کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ہماری زبان کا یہ شہید صحافی اپنے اخبار میں لکھتا ہے کہ:

''ایڈیٹر کو ایسا مواد چھاپنا چاہیے جس سے اس کا اخلاقی معیار قائم ہو اور لوگوں کا معیار اور کردار بلند ہو۔ ان مقاصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایڈیٹر خود انھیں اچھی مثال پیش کرے۔''

مرحوم محمد باقر نے سیاسی و ثقافتی سرگرمیوں اور واقعات کے علاوہ ان مسائل کو بھی اپنے اخبار میں پیش کیا، جن سے ہندوستان کے عموماً اور دہلی کے عوام خصوصاً دو چار تھے۔ مولانا چونکہ خود ایک دیانت دار صحافی اور مذہبی پیشوا تھے لہٰذا انھیں جہاں بھی بدعنوانی اور برائی نظر آئی، انھوں نے اپنے اخبار میں اس کا تذکرہ ضرور کیا۔ آج بھی نہ صرف اردو بلکہ دیگر ہندوستانی زبانوں کے اخبارات محمد باقر مرحوم کی اس روایت پر عمل کرتے ہوئے نہایت بے باکی سے برائیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ مثلاً مولانا نے چوری کے واقعات پر لکھا۔

جب دہلی شہر میں چوری کے واقعات بڑھنے لگے تو مولانا

باقر نے اس کے لیے پولیس کو بھی ذمے دار ٹھہرایا اور اپنے اخبار میں لکھا:

''ظاہر ہے چوروں سے سازش رکھتے ہیں ورنہ ممکن نہیں کہ ہر شب بے سازش پاسبان و ارباب پولیس کے (چور) چوری کی ہمت کر سکیں۔''

مولانا باقر نے آہستہ آہستہ اپنے اخبار کے ذریعے حب الوطنی، اتحاد بین المسلمین اور حریت پسندی و بے باکی کی تلقین اپنے قارئین کو کی۔ پہلی جنگ آزادی یعنی 1857 کے انقلاب تک آتے آتے تو 'دہلی اردو اخبار' پوری طرح مجاہدین آزادی کا ہم نوا ہو گیا تھا۔ دراصل اس اخبار کو ہی ہم اردو کا پہلا سیاسی اخبار قرار دے سکتے ہیں کیونکہ اس میں سب سے زیادہ سیاسی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر 24 مئی 1857 کے اپنے اخبار میں مولانا نے مجاہدین آزادی کی بلند شہر میں کامیابی سے متعلق یہ خبر شائع کی:

''بلند شہر میں بھی سنا ہے کہ سپاہ نے انگریزوں کو مار ڈالا جو کوئی قسمت سے بھاگ گیا سو بھاگ گیا، باقی سب مارے گئے۔ قیدی جیل خانے کے تمام چھوٹ گئے اور کوٹھیاں انگریزوں کی تباہ و برباد ہوئیں۔''

دراصل 1857 کی جنگ آزادی کے بیج بونے میں مولانا باقر کے 'دہلی اردو اخبار' نے انتہائی اہم رول ادا کیا جس کا ثبوت ان کی وہ تحریریں ہیں جو وقتاً فوقتاً اخبار میں شائع ہوتی رہیں۔ جنگ آزادی میں خاصی پیش رفت ہونے کے بعد جون 1857 میں محمد باقر نے اخبار میں مجاہدین آزادی کا جوش بڑھانے کے لیے لکھا:

''اسے سپاہ دلیرانِ تلنگان بیشتر تاریخوں میں جس طرح سے سلطنت ہائے سابقہ میں کارنامہ ہائے شجاعان زماں گزشتہ یادگار ہیں کہ تاریخ قدیمہ ہند میں خاندان یدونشی میں بھیم و ارجن وغیرہ بہادری میں یادگار ہیں اور علیٰ ہذا القیاس تواریخ فارسی میں شجاعت رستم و سام اور سلطنت اہل اسلام میں فتوحات حضرت صاحب قراں امیر تیمور گاں اور دلیران فوج چنگیز خاں اور بہادران ہلاکو خاں و افواج نادریہ تواریخوں میں لکھے چلے آتے ہیں اور آخر زمانے کے لوگوں کی ہمت کو بڑھاتے ہیں اور جرأت کو ترقی دیتے ہیں اسی طرح یہ معرکہ تمہارا بھی تواریخوں میں لکھا جائے گا اور صفحہ عالم پر کار رستمانہ تمھارا یادگار رہے گا کہ اس بہادری اور جواں مردی سے تم نے ایسے اولوالعزم اور متکبر سلطنت کے کروغرور کو توڑا ہے۔''

مولانا محمد باقر نے مجاہدین آزادی اور پہلی جنگ آزادی کے لیے اپنے اخبار کا 17 مئی 1857 کا پورا شمارہ ہی وقف کر دیا تھا۔ اس خصوصی شمارے کو بغاوت نمبر کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس لیے اگر انگریز اس صاحب سیف و قلم کو اپنا دشمن نمبر ایک باغی اور بے باک صحافی سمجھتے تھے تو شاید غلط نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ مولوی باقر نے واقعی ہر طرح ایک مجاہد آزادی اور حریت پسند صحافی کے فرائض انجام دیے تھے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صحافی باقر انگریزی سامراج کے خلاف تھے، مگر وہ انگریزوں اور عیسائیوں سے نفرت نہیں کرتے تھے اور اپنے اخبار میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں غرض یہ کہ تمام اقوام کو جگہ دیتے۔ ماسٹر رام چندا گر چہ عیسائی تھے لیکن مولانا باقر مرحوم اُن سے محبت کرتے تھے۔ اسی طرح کرنل سردار سکندر سنگھ ان کے دوست تھے۔ اس لحاظ سے مولوی باقر کو ایک سیکولر ہندوستانی صحافی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ مولانا کے اخبار نے دیگر ہندوستانی اخبارات کے مدیران کو بھی پہلی جنگ آزادی کی حمایت کرنے کی ترغیب دی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجاہدین آزادی اور ملک کے مختلف فرقوں کے لوگوں سے متحد ہونے کی اپیل بھی کی تھی جو 'دہلی اردو اخبار' میں نہایت اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ اس اپیل میں انھوں نے لکھا تھا:

''ہندو مسلمان متحد ہو کر جان کی بازی لگادو اور مجاہدانہ شان سے انگریزوں کا خاتمہ کر دو۔'' اس اپیل کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا اور پہلی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان متحد ہو کر انگریزوں سے لڑے، لیکن انگریزوں کی عیاری اور ہندوستانیوں کے بھولے پن کی وجہ سے 1887 کی جنگ آزادی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی۔

ظاہر ہے کہ انگریزوں نے جنگ آزادی کو ناکام بنانے کے بعد مجاہدین آزادی کو چن چن کر گرفتار کرایا، چونکہ مولانا باقر ایک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ پہلی جنگ آزادی کے مجاہد قلم بھی تھے، لہٰذا 15 ستمبر 1857 کو دیگر مجاہدین کے ساتھ اردو کے اس حریت پسند صحافی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور 16 ستمبر 1857 کو دہلی دروازہ کے قریب واقع ایک میدان میں انگریز افسر کیپٹن ہڈسن کے حکم پر اس بے باک صحافی اور مجاہد آزادی کو بھی توپ سے اڑا دیا گیا۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام حقائق کے باوجود مولانا کے کچھ دشمنوں اور انگریزوں کے دوستوں نے انھیں انگریز سامراج کا جاسوس کہا۔ اگر چہ ایک دو محققین مولانا محمد باقر کی تاریخ شہادت 16 ستمبر نہیں بلکہ 17 ستمبر 1857 کو صحیح سمجھتے ہیں، لیکن دیگر محققین 16 ستمبر کو ہی اس باعث افتخار اردو صحافی کا یوم شہادت تسلیم کرتے ہیں۔ بہر حال مولانا محمد باقر کو 16 ستمبر 1857 کو شہید کیا گیا ہو یا 17 ستمبر 1857 کو لیکن اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف اردو یا ہندوستان کے پہلے شہید صحافی ہیں بلکہ ان سے قبل دنیا میں کسی پیشہ ور صحافی کو اس کی حریت پسندی کے لیے شہید نہیں کیا گیا اور یہ افتخار صرف ہماری زبان اردو کو ہی حاصل ہے کہ اس نے اس جہاں کو اولین شہید صحافت عطا کیا۔

■

Asad Raza, 97-F, Sector-7, DDA Flats, Jasola,New Delhi-110025

ظہیر انور

اردو صحافت پر قدغن اور اس کے معتوب صحافی
(مغربی بنگال کے حوالے سے)

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ صحافت ایک باوقار اور بے خوف فن سے عبارت ہے اور اس کا مقصد اور آغاز بھی اطلاعات اور ترسیل اور خبر کو پوری سچائی اور جزئیات کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ علم کا باب بھی کھلا رہے اور اصلاح کا در بھی لیکن اس کے علاوہ بھی گزرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ دیگر مقاصد بھی صحافت کی دنیا میں شامل ہوتے گئے۔ سچائی، بے خوفی اور حرفِ غلط یا غیر صالح اقدام کے لیے صحافت کی دنیا ایک ایسے ہتھیار کی صورت اختیار کرتی گئی کہ طاقت اور سخت ہاتھوں سے کچلنے کی رسم کے خلاف صف آرا ہونا ضروری ٹھہرا۔ سیاسی Vendeta نے بھی اس راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کیں لیکن مولوی محمد باقر، مولوی جمیل الدین، مولوی ظفر علی خاں، سوامی پرکاشانند اور پنڈت میلا رام وفا کے پہلو بہ پہلو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے قانونِ زباں بندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جذبہ قومیت اور سچائی کے لیے جہدِ مسلسل کا ساتھ دیا اور کبھی خاموش تماشائی نہیں رہے۔ جدید اخبار نویسی کی داغ بیل شاید اسی احساس کے ساتھ جڑ پکڑتی گئی کہ اگر حکومتیں زباں بندی کے درپے ہوں، توپ اور طمنچے مقابل ہوں تو سر کے بل چل کر سچ کا الزام خود پر لو۔ حکمراں نالاں رہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ سچ زندہ ہے۔ ہندوستان میں صحافت اور وہ بھی بے باک صحافت کی ابتدا حکومت دشمنی اور کلونیل پالیسی کی سختی اور ناروا سلوک کے خلاف صف آرا ہونے سے شروع ہوتی ہے اور جدوجہدِ آزادی تک ہندوستانی صحافت بشمول مغربی بنگال کی صحافت اسی مقصد کے زیرِ اثر رہی۔ عتیق احمد صدیقی اپنی قابلِ قدر تصنیف 'ہندوستانی اخبار نویسی: کمپنی کے عہد میں' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''حکومت نے اخباروں کے باب میں انتہائی جابرانہ پالیسی اختیار کی لیکن یہ سخت گیری ہندوستانی اخبار نویسی کے سوتوں کو بند کرنے یا اس کے دھارے کا رخ موڑنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ کمپنی کے عہد کی ہندوستانی اخبار نویسی کی تاریخ جہدِ مسلسل کی تاریخ ہے۔ اس دور کی اخبار نویسی حالات کی صرف خاموش تماشائی نہ رہی یا مستقبل کے مورخ کے لیے واقعات وحادثات کو صرف محفوظ کرنے ہی کی خدمت اس نے انجام نہیں دی بلکہ اس کا کارنامہ یہ ہے کہ ناخوش گوار حالات میں اس نے رائے عامہ پیدا کرنے کا فرضِ منصبی ادا کیا اور ناسازگار ماحول میں اس کو پروان چڑھایا۔''

یعنی ہمارے صحافیوں کو خصوصاً بنگال کے صحافیوں کو بھی اپنے فرضِ منصبی پر قائم رہنے اور رائے عامہ کو بیدار کرنے نیز آزادانہ طرزِ تحریر سے اپنی صدا بلند کرنے کی نظر اور ہمت ملی تھی۔ آزادی کے ابتدائی دنوں میں آزادیِ رائے وفکر کو 'Restrict' کرنے کی اجازت دستور میں ہمیشہ پنپتی رہی۔ اگرچہ ہندوستانی سیاست داں جن کی تصویریں آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اور صحافت کا ایک بڑا گوشہ جو Pervert کہلانے کا حکم رکھتا ہے اور پریس Baron کے تابع بھی رہتا ہے بلکہ آج منصب وجاہ کی خواہشوں نے عتاب کا مطلب ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ جس قدر غلط بات رقم ہو اور حکومتِ وقت کے آگے سر جھکایا جائے اس کی نوازشیں اتنی ہی منفرد ہوتی ہیں۔ صحافی سچ نہ لکھنے پر سرخرو ہوتا ہے تاہم ہمارے اہم اور بے غرض صحافیوں کی زندگی اس بات کی گواہ رہی ہے کہ صداقت کے لیے انھوں نے قید برداشت کی۔ انھوں نے اپنی سچائی کی بنا پر لکھی گئی تحریروں سے نہ صرف جذبۂ قومیت، جذبۂ آزادی اور رائے عامہ کو بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا بلکہ یہ ثابت کیا کہ دار وگیر کے کیسے ہی سائے سر پر منڈلا رہے ہوں، آزادی کے بغیر صحافت کا تصور ممکن نہیں۔ ایک بار پھر البیر کامیو کے خیالات اور اس کے تجزیے سے آگاہ ہونا چاہیے جو اس نے 1960 میں 'Resistance, rebellion and death' میں لکھا تھا:

"Freedom of press is perhaps the freedom that has suffered most from the gradual degradation of the ideal of liberty... A free press can of caouce be good or bad but most certainly without freedom it will never be anything but bad."

جب صحافی کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آزادیِ رائے اور فکر اصل میں ہمارے سماج اور ثقافت کی طرف ہمارا نہایت موثر قدم اور اخبار اور صحافت اس کی طرف صداقت کا چراغ روشن کرتا ہے تو پھر سچ کہنے والے معتوب تو ہوں گے ہی، دارو

گیر، قید و بند، ضبطی اور اسیری کے ستم سہنے پڑیں گے۔ بنگال کے حوالے سے بھی اگر ہم غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کئی صحافی سچ بولنے کی سزا بھگتتے رہے ہیں اور معتوب ہوتے رہے ہیں۔ اس کی اپنی ایک معتبر تاریخ ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مولوی محمد باقر نے دہلی سے جب 'دہلی اخبار' کی اشاعت شروع کی، جنگِ آزادی کی کھلی حمایت کی بنا پر انھیں گرفتاری کے سخت آزار جھیلنے پڑے اور گولی کھانے کے حکم سے بھی گزرنا پڑا۔ اسی طرح صحافت کے معیار اور مزاج اور قومی شعور کی بیداری میں اہم رول ادا کرنے کے لیے بنگال کے صحافیوں نے بھی اپنا رول ادا کیا۔ بنگال کی صحافت کی بنیادیں تو اٹھارہویں صدی کی آٹھویں دہائی میں مستحکم ہونے لگی تھیں لیکن اصل سفر تو انیسویں صدی کی تیسری دہائی یعنی 1822 میں شروع ہوا۔ یہ وہ پرآشوب دور تھا جب اجنبی قوم کے High Handed Politics، جبر و تشدد اور ظلم و ستم کا بازار گرم تھا۔ اپنے مادرِ وطن سے محبت کرنے والے پابندِ سلاسل ہونے سے خوف نہیں کھاتے۔ پہلا ہفتہ وار اردو اخبار 'جامِ جہاں نما' 27 مارچ 1822 کو منشی ہری ہردت اور ایڈیٹر سدا سکھ رائے کی سرپرستی میں نکلا تھا۔ اس کے بعد بنگال سے بہت سارے اخبارات وقفے وقفے سے نکلتے رہے۔ ایسے بھی اخبارات تھے جن کی عمر مختصر ترین رہی لیکن اس انقلاب کا ڈنکا تو پہلے اخبار کی اشاعت کے ساتھ سنا گیا تھا اور جس کی صدا کے سائے میں صحافت کو اپنا سفر طے کرنا تھا۔

لارڈ ہیسٹنگ کے عہدِ حکومت کے خاتمے پر جان ایڈم عارضی طور پر گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کر دیے گئے۔ اس گورنر نے صحافت کی روح کو کچلنے کے لیے 18 دسمبر 1823 میں پریس آرڈیننس جاری کیا۔ اب حکومت کی مداخلت کا باب کھلتا ہے اور اخبار کی اشاعت کے لیے لائسنس کی ضرورت پڑتی ہے۔ 'بنگال گزٹ' کے مدیر، ناشر اور مالک جیمس آگسٹس ہکی کو اپنے دو صفحے کے اخبار کے لیے حکومت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی آزادی سے پہلے سارے ہندوستان میں سنسر شپ کا عتاب اور اس کا سایہ گھنا تھا۔ واضح رہے کہ 'بمبئی گزٹ' کے ایڈیٹر کو بھی ہندوستان بدر کیا گیا تھا اور Calcutta Chroncle کے اجازت نامے منسوخ ہوئے تھے۔ حکومت کو پہلے یہ یقین ہونا چاہیے کہ اخبار کی پالیسی حکومت مخالف پالیسی تو نہیں ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے خلاف رائے زنی کرنا آسان نہیں تھا۔ 'بنگال گزٹ' میں وارن ہیسٹنگز کے سلسلے میں اہانت آمیز تحریر اس بات کا ثبوت ہے کہ حق گوئی و بے باکی حکومت کبھی بھی برداشت نہیں کرتی۔

دورانِ تحریک آزادی بھی انگریزوں کے سفاکانہ رویے کا ثبوت ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں رقم ہے اور جب ایسا رویہ حکومت کی طرف سے صحافیوں کے خلاف مسلسل رہتا ہے تو طرزِ سخن اور طرزِ تحریر میں ایک طرح کی بیماری، بے چینی اور جنبش پیدا ہوتی ہے۔ قومی شعور کو بیدار کرنے میں صحافیوں کا، خاص طور پر بنگال کے صحافیوں کا نمایاں رول رہا ہے۔ پریس، اخبار کی ضبطی، پھانسی وغیرہ کا ذکر آ چکا ہے اور سرپھرے صحافیوں کو اس کی سزا جو بھگتنی پڑی اس کا بھی ذکر اوپر کیا گیا لیکن جب جب بیڑیاں سخت ہوئیں، شہادتیں ہوئیں تحریر کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ اخبارات کے تند اور تلخ لہجے حکومتوں کے تختے الٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں بھی اور ساری دنیا میں بھی، حق گوئی نیز صفائی کے ساتھ خبروں کو عوام کے پاس پہنچا کر رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے صحافی کمربستہ اور پابجولاں ہوتے ہیں۔ ایسے لمحوں میں بنگال کی تاریخ میں کئی نام ابھر کر سامنے آتے ہیں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور عبدالرزاق ملیح آبادی کا نام روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ روایت بنگال کے پہلے اردو روزنامہ اخبار 'اردو گائیڈ' اور 'جامِ جہاں نما' سے شروع ہوئی تو پنچ ناموں کے دور سے ہوتی ہوئی 'الہلال'، 'البلاغ'، 'پیغام' اور 'ہمدرد' وغیرہ تک رواں رہی۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ 1878 میں لارڈ لٹن نے اخباروں پر سنسر شپ اور پابندیاں عائد کرتے ہوئے ایک 'ورنا کیولر پریس ایکٹ' پاس کیا۔ انگریزوں کے ظالمانہ رویے کی ہولناکیوں نے ہمارے صوبے کے صحافیوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ تلخ اور ترش آوازوں کو کچلنے کے لیے اس ایکٹ کے ذریعے صحافت کو پابہ زنجیر کیا گیا۔ ہر مواد کو شائع کرنے سے پہلے سرکاری سطح پر یہ یقین دلانا پڑا کہ مخالفت یا احتجاج کی راہ حکومت کے خلاف فراہم نہیں کی گئی ہے لیکن ایسے ماحول میں اہم اخبارات اور رسائل جاری ہوئے۔ ہفت روزہ 'گوہرِ آصفی' 1890 میں نکلا جس کے مدیر نصیر حسین تھے۔ پھر 'خورشید عالم' بخشی کمپنی کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا۔ ماہنامہ 'گلدستہ'، 'نیرنگِ عالم'، رسالہ 'خادم الاسلام' اور پھر مولانا آزاد کی سرپرستی میں ہفت روزہ 'المصباح' بھی جاری ہوا۔ اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنگال میں نئے آرڈیننس اور ایکٹ جو بنیادی طور پر Draconion تھے، کے باوجود اردو ہفت روزہ اخبارات و رسائل نے برطانوی سامراج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اگرچہ وہ اپنے مقصد میں بہت کامیاب نظر آتے ہیں، تاہم صحافت کو بیسویں صدی میں انقلابی رخ دینے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی اہم ہستیوں نے صحافت کی دنیا میں قدم رکھ کر ایک طرح سے ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل مچا دی۔ اردو صحافت کا مزاج اور معیار یکسر بدل گیا۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پیش پیش تھے۔ یہ صحافت کے نئے رنگ و روغن سے آشنا لوگوں کا سلسلہ تھا جنھوں نے اپنی تحریروں سے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ ان کی تحریروں سے انگریزوں کے بھی دل دہل گئے۔ اور ان کا عتاب بجلی بن کر گرتا رہا لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ ان صحافیوں نے ملک کو غلامی کی زنجیر سے آزاد کرنے اور صداقت کا پرچم بلند کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور نہ ہی اجنبی حکومت نے ان پر قہر برسانا چھوڑا۔ صحافیوں کو جیل کی کال کوٹھری میں بھیجا گیا۔ قید و بند اور دار و گیر کی صعوبتوں کے ساتھ ساتھ جرمانے اور اخبار کی ضبطی کو بھی جھیلنا پڑا مگر صحافت کو پابندِ سلاسل نہ تب رکھا جا سکا تھا نہ اب۔ وہ خطرناک قانون اور حکومت کے سنگین اقدام کے سامنے سرنگوں نہ ہوئے۔ 1910 کے پریس ایکٹ کے تحت ہر اس اخبار کو خصوصاً بنگال میں مقدمہ، ضبطی اور جیل کی صعوبتوں کو سہنا پڑا جنھوں نے سچ لکھنے کی جرأت کی تھی۔ اس قانون کے خلاف مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مولانا آزاد کی

صدارت میں 13 جولائی 1912 کو 'الہلال' کا اجرا ہوا تھا۔ اس ہفتہ وار نے اپنی تحریروں اور رپورٹوں سے جو انقلاب برپا کیا اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ اجنبی راج کے خلاف آوازیں لوگوں کے دلوں میں اتر گئیں۔ مولانا نے 'الہلال' میں صاف صاف لکھا تھا جو کسی بھی زبان کے صحافی کے لیے قابل تقلید ہے:

''پس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی اور سونے کا سایہ بھی اس کے لیے سم قاتل ہے۔ جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں، امیروں کے عطیوں کو قومی اعانت، قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور ایمان کو بے چین کریں، بہتر یہ ہے کہ وہ دریوزہ گری کے جھولے گلے میں ڈال کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں کے گشت لگائیں اور گلی کوچہ میں 'کام ایڈیٹر' کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں......''

مولانا ابتدا ہی سے ''میدانِ کارزار کے موجود ہونے کا احساس رکھتے تھے۔ صحافت میں تقریباً 4 دہائیوں کا عرصہ ایک مشن کے طور پر گزارا اور 'موم بتی کی طرح اپنے خونِ جگر اور اپنی ہڈیوں کا روغن جلا کر اپنا فرض انجام دیا۔'' انھوں نے صحافت کو نئے رجحان، نئے امکان سے آشنا کیا۔ بار بار ان کو عتاب سے گزرنا پڑا۔ 'الہلال' اور 'البلاغ' کو جبر و تشدد، ضبطی، زباں بندی اور کیا کچھ نہ سہنا پڑا اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، مولانا کو جیل کا سفر بھی کرنا پڑا لیکن اگر آپ ان کے مشمولات کو آج بھی دیکھیں تو آپ کو احساس ہوگا کہ انھوں نے ہر موضوع کے ساتھ انصاف کیا۔ کیا قومیت، کیا بین الاقوامیت، مولانا نے اپنے طرزِ عمل اور اپنے طرزِ فکر سے اپنے رسالے کو ایڈیسن اور اسٹیل کے مشہور زمانہ 'Spectator' کے تقریباً ہم پلہ کر دیا تھا اور قید و بند کی بھی پرواہ نہ کی۔ اس برگزیدہ دانشور کا انداز سب کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ ایسا دانائے رازِ صدی کا سینہ چیر کر سامنے آتا ہے جب ان پر قید و بند کی صعوبتیں جاری رہیں تو ان کے کام اور مشن کو عبدالرزاق ملیح آبادی نے آگے بڑھایا۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی اردو صحافت نگاری کو اعلیٰ مرتبے پر فائز کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی سچائی، اپنی علمی لیاقت اور گونا گوں صلاحیت کی وجہ سے مولانا آزاد کے دستِ راست بننے سے پہلے مولانا ملیح آبادی اپنی صلاحیت کا لوہا منوا چکے تھے۔ مصر میں علامہ رشید رضا کی صحبت نے جن کی 'علمیت اور خطابت کی سحر انگیزیوں' کا ان پر بے حد اثر تھا، انھیں مزید علم سے لیس کیا اور تجربے کو استحکام بخشا۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز بلا کی ذہانت اور صالح تربیت کے ساتھ کیا۔ کئی ملکوں کا دورہ کیا۔ ان کی تحریر میں ان کے علم کی آنچ کے ساتھ ساتھ حقیقت اور سچائی کا لہو بھی دوڑتا تھا۔ لہٰذا جب وہ ہندوستان لوٹے تو ساتھ ہی پولس کمشنر کا احکام بھی پہنچا کہ ''اپنے بیٹے پر سخت نظر رکھو۔ اس کے اندر باغیانہ جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔''

مولانا کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے، وہ اپنے طرز کے منفرد صحافی تھے۔ ان کی زندگی میں ایک بے مثال قلندرانہ شان تھی۔ زندگی بھر مصالحت سے گریز کیا۔ صحافت میں بالکل جداگانہ روش اختیار کی اور اپنی سادہ و پرکار نثر سے ایسا جادو کیا کہ بقول مولانا حامد انصاری وہ ''اپنے طرز کے موجد تھے'' ان کو بچپن ہی سے مطالعے کا حد درجہ شوق تھا اور اسی شوق اور شغف نے انھیں بچپن میں ہی اہم ترین کتابوں سے متعارف کرایا۔ ان کی فکر اور ان کے اسلوب پر مولانا شبلی کا اثر دکھائی دیتا ہے اور ان کی طبیعت میں بغاوت ابتدا سے ہی تھی۔

واضح رہے کہ وہ ہندوستان آنے سے پہلے مکہ میں بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ مولانا آزاد کے رفیق کار ہونے سے پہلے وہ کئی اخبارات نکال چکے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر سے ملاقات، سید جمال الدین افغانی کے خیالات و افکار سے متاثر خلافت کی تحریک کے منصوبے سے رغبت نے ان کی کلکتہ میں آمد کی راہ ہموار کی اور مولانا آزاد نے انھیں ہفتہ وار 'پیغام' کی ذمے داری سونپی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ 'پیغام' کلکتہ کا واحد اخبار تھا جس نے پرنس آف ویلز کی کلکتہ آمد کا بائیکاٹ کیا تھا۔ خود مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی زبان میں سنیے:

''پرنس آف ویلز آ رہا تھا اور 'پیغام' کلکتہ میں آگ ابل رہا تھا۔ انگریزوں کا سب سے بڑا گڑھ کلکتہ تھا اور وہ پرنس کا بائیکاٹ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے گورنمنٹ 'پیغام' کی آواز کو بند کرنے پر تلی ہوئی تھی۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

''جانتا تھا حکومت جلد گرفتار کر لے گی کیونکہ کلکتہ میں 'پیغام' ہی اکیلا اردو اخبار تھا جو پرنس کے بائیکاٹ کی زور شور سے تبلیغ کر رہا تھا بلکہ حقیقت میں پیغام برطانوی راج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی آتشیں دعوت دیتا تھا...... کلکتہ میں سب سے پہلے حکیم سعید الرحمان گرفتار ہوئے...... پرنس کے آنے کے سلسلے میں دو ہی گرفتاری ہوئی تھی۔ ایک ملیح آبادی کی اور دوسرے پروفیسر جتیندر لال بنرجی کی۔ اس کے بعد سلسلہ شروع ہو گیا۔''

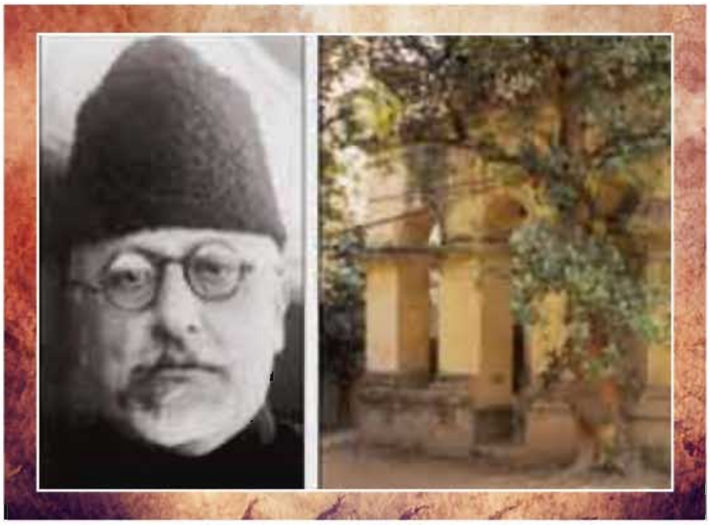

اخبار 'پیغام' نے قومی جذبے کی بیداری کے علاوہ حکومتِ وقت کی کوتاہیوں اور اس کے ظلم و ستم کو طشت از بام کیا اور ان ساری باتوں کے عوض مولانا گرفتار ہوئے۔ دو سال کی قید ہوئی۔ بڑے نشیب و فراز سے گزرے اور مولانا آزاد نے بھی اس گرفتاری کے لیے خصوصی نوٹس لکھے لیکن ان کی تحریر کا جادو چلتا رہا۔ پیغام کے نام سے ایک اور اخبار مولانا ملیح آبادی کی ادارت میں نکلا۔ اس طرح 'الہلال' (ثانی) کی تربیت و تدوین میں بھی مولانا ملیح آبادی نے اپنی ذکاوت اور فہم و فراست کا ثبوت دیا۔ مولانا نے اپنا صحافتی سفر بیرونِ ملک سے شروع کیا تھا اور لکھنؤ سے کلکتہ تک انھوں نے اردو صحافت کی دنیا میں اپنا لوہا منوایا۔ بے خوفی کے ساتھ ہندوستان کے رہنے والوں کو محبت اور یگانگت نیز اتحاد کی تعلیم دی۔ آج ہم ترجمہ در ترجمہ کے دور سے گزر رہے ہیں اور الیکٹرانک خبروں کو اپنی خبر بنا کر صحافت کے معیار اور مزاج پر ضربیں لگا رہے ہیں لیکن بقول مولانا بازار صحافت میں وہ 'زیاں و نقصان' کے لیے آئے تھے، صلے و تحسین نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار تھے۔'' ماضی قریب میں پچھلی حکومت کے دورِ اقتدار میں 'اخبارِ مشرق' کو حکومت کا ستم سہنا پڑا تھا۔

عتاب خواہ کتنا ہی حوصلہ شکن کیوں نہ ہو، ظلم کی میعاد مختصر ہوتی ہے۔

■

Dr. Zaheer Anwar., 10/1, Aheeri Pokhar, First Lane, Kolkata - 700019 (W.B)

صالحہ رشید

فارسی صحافت کا ارتقا اور ہندوستانی فارسی ادب میں اس کے نقوش

صحافت عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں اخبار نویسی۔ لفظ صحافت کے ساتھ کئی مربوط الفاظ ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ مثلاً صحیفہ جس کے لغوی معنی اخبار، کتاب یا رسالہ، صحافی یعنی اخبار نویس یا اڈیٹر۔ صحف اور صحائف صحیفہ کی جمع ہیں۔ صحّاف جلد ساز یا کتب فروش، صحفی بمعنی ذاتی مطالعہ سے علم حاصل کرنے والا۔ صحیفہ سے ایک فارسی ترکیب وضع کر لی گئی ہے صحیفہ نگار بمعنی اخبار نویس۔ صحف فارسی میں حرف دوم یعنی ح پر ساکن کے ساتھ بھی مستعمل ہے۔ اسی طرح خبر عربی لفظ ہے۔ اللہ خبیرٌ بصیرٌ سے ہم سب واقف ہیں۔ خبر کے معنی واقفیت یا آگاہی، خبر یعنی واقعہ یا حدیث، اس کی جمع اخبار ہے۔ اسی سے فارسی ترکیب خبردار جس کے معنی واقف یا آگاہ۔ خبر نگار فارسی جدید میں نامہ نگار، خبرگذاری، خبروں کی ایجنسی اور خبر چین بمعنی مخبر استعمال ہورہا ہے۔ ان تمام الفاظ اور تراکیب سے واضح ہے کہ صحافت کا تعلق آگاہی سے ہے اور صحافت میں واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ صحافت ہر لمحہ پیش آنے والے واقعات کی عکاسی پھر ان کے پس منظر سے ابھرنے والے نظریات کی ترویج و اشاعت کا نام ہے۔ تازہ خبریں اور حالات حاضرہ پر مختلف قسم کے مضامین جمع کر کے انھیں ایک خاص مدت یا وقفے سے شائع کرنا صحافت ہے۔ صحافت بنیادی طور پر اخبار نویسی اور رسالہ نگاری کے عمل کا نام ہے۔ صحافت ایسی تحریر کو کہتے ہیں جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ سیاسی، سماجی، ثقافتی، سائنسی، قومی، بین الاقوامی، غرض ہر قسم کے خیالات و افکار و معاملات اس میں شامل ہوتے ہیں۔ یہاں صحافت کے دو مقصد کارفرما ہوتے ہیں، اطلاعات کی فراہمی نیز رائے عامہ کی تشکیل۔ اس میں کسی ادیب کا ادب، مفکر کا خیال، مبصر کا تبصرہ، فلسفی کا فلسفہ، سائنسی ایجاد، لطائف، اصلاحی مضامین وغیرہ تمام چیزیں جگہ بنا سکتی ہیں۔ جس طرح صحافت زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح صحافی ہمعصر تاریخ نویس ہے۔ وہ عوام کی آنکھیں، کان بے چین ضمیر سب کچھ ہے۔

مشرق میں اخبار نویسی کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنے تہذیب و تمدن کے نقوش۔ یہاں ہر دور میں حکمرانوں کا شیوہ رہا کہ وہ اپنی رعایا سے ربط وضبط بنائے رکھتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے احکام رعایا تک پہنچائیں اور ان کے حالات سے خود باخبر رہیں۔ ایران جیسی زبردست مملکت جہاں داریوش اور کوروش جیسے پادشاہ ہوئے اور جنھوں نے ایرانی تہذیب و تمدن کو بلندی تک پہنچایا، انھیں اس بات کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے احکام رعایا تک پہونچیں۔ اس وقت خبر رسانی کے وسائل محدود تھے۔ خبر ایک کان سے دوسرے کان تک پہونچائی جاتی تھی اور یہ کام بے شمار لوگوں کے ذریعہ انجام دیا جاتا تھا۔ ان خبر رسانوں کو عموماً چشم و گوش شہر یاران کہا جاتا تھا۔ خبر رسانی کا یہ طریقہ بہت مؤثر اور معتبر نہ ثابت ہوا کیونکہ بسا اوقات خبریں ایک کان سے دوسرے کان، ایک شخص سے دوسرے شخص اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچتے پہنچتے اپنا اصل مفہوم کھودیتی تھیں۔ لہٰذا زبانی خبر رسانی کو ایسی شکل دینے کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے خبر اپنی اصل صورت میں برقرار رہے۔ اس ضرورت کے تحت ایرانیوں نے حضرت عیسیٰ سے تین ہزار سال قبل یعنی ماد بادشاہوں کے دور میں بابل کا میخی خط اختیار کیا اور اسی خط میں اپنے احکام و فرامین چٹانوں پر کندہ کرادیے۔ انھیں ہم کتبے کہتے ہیں۔ ان کی مثال قدیم ایران میں ہخامنشی بادشاہوں کے فرمان، بیستون، الوند، استخر، شوش، ایشیای کوچک اور مصر میں چٹانوں پر کندہ کیے گئے ہیں۔ ان میں بادشاہوں کے نام، ان کے خاندان، ان کی قلم رو میں آنے والے ممالک، ان کی فتوحات اور دیگر کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے بڑا کتبہ بیستون میں داریوش کا ہے۔ اس میں تقریباً چار سو سطریں ہیں۔ داریوش نے اس کتبے میں اپنی سلطنت میں امن و عدل قائم کرنے، دشمنوں کی سرکوبی، اپنی قلم رو میں آنے والے ممالک، ان کی فتوحات اور دیگر کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اہورامزدا کی تعریف، ناپاکی اور جھوٹ کی مذمت بھی درج ہے۔ داریوش سے قبل اس کے دادا ایارمنہ اور کوروش اعظم کے بھی ایک یا دو سطر میں لکھے ہوئے کتبے موجود ہیں۔ داریوش کے بعد بھی یہ روایت قائم رہی اور اس کے نشانات بھی موجود ہیں مثلاً اردشیر اول اردشیر دوم، کوروش خرد اور اردشیر سوم وغیرہ کے کتبے۔ ان میں بہترین

کتبے تخت جمشید، نقش رستم، نقش رجب، دشت مرغاب، کرمان شاہ سے قریب کوہ بیستون، ہمدان سے قریب کوہ الوند میں واقع ہیں۔ ایران سے باہروان اور نہرسویز کے قریب داریوش کے کچھ کتبے ملے ہیں۔ ان تمام میں سب سے اہم اور مفصل بیستون اور تخت جمشید کے کتبے ہیں۔ شاپور بن اردشیر کے بارے میں نقش رستم اور خرابہ شاپور کے کتبوں سے ثابت ہے کہ اس نے قیصر روم کو شکست دے کر ایران کا اثر مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا۔ اس کے علاوہ فراعنہ مصر کے قوانین و احکام، ان کے جشن اور تیوہاروں کے حالات، قدیم عراق میں حمورابی کے قوانین اور ہندوستان میں اشوک (232بی سی ای سے 269بی سی ای) کی لاٹ کے کتبے آج تک محفوظ ہیں۔ ان سب کا مقصد فقط ایک تھا عوام کو اپنے احکام اور کار گزاریوں سے واقف کرانا۔ توراۃ میں پارسیوں اور مادیوں کے قوانین کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایران قدیم میں تاریخ نویسی کا بھی رواج رہا اور مؤرخ ابتدا سے ہی واقعات کے ثبت وضبط کی خدمات انجام دیتے رہے۔ کنزیاس یونانی اردشیر کے دربار کا مؤرخ تھا۔ اس نے ایران کے حالات پر ایک کتاب لکھی۔ اسے لکھنے کے لیے اس نے ایرانی روزنامچوں سے استفادہ کیا۔ قدیم ایران میں روزنامچہ لکھنے کا رواج تھا۔ پادشاہ وزیر اور امیر ایسے لوگوں کو ملازم رکھتے تھے جو ملکی واقعات قلم بند کرتے نیز غیر ملکوں سے آنے والی اطلاعات بھی لکھ لیتے۔ پھر مستند ذرائع سے ان کی تصدیق وتوثیق ہوتی اور اس کے بعد انھیں محفوظ کرلیا جاتا۔ آئین مہ آبادی میں تاکید تھی کہ رعایا کو امن، چین وآرام سے رکھنا بادشاہ کا فرض ہے۔ وزیر سب سے بڑا مہندس اور حکیم ہوا کرتا تھا اور تمام عمال سرکاری اس کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ خاص ماتحتوں میں دواستوار یعنی امین اور دوشدہ بند یعنی وقائع نویس ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ منصب وزارت کے مخصوص معین تھے۔ خبر رسان روند کہلاتے تھے۔ ہر شہر میں فرہنگ روز یعنی کوتوال ہوتا تھا جو سراغ رسانی اور واقعہ نگاری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ساسانی بادشاہ نوشیرواں جو حکم صادر کرتا تھا وہ قلم بند کرلیا جاتا تھا۔ اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بعد اسلام اس کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ اس کی افادیت کی بنا پر اس کا فارسی ترجمہ جلال الدین طباطبائی نے کیا۔ طباطبائی شہزادہ مرادبخش پسر شاہ جہان کے اہل دربار سے تھے۔ اسی شہزادے کے حکم پر انھوں نے نوشیروان کے احکام اور اقوال کو جمع کر کے اس کی شرح بھی کی اور اس کا نام توقیعات کسریٰ رکھا۔ توقیع عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مہر کے ہیں۔ طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص بادشاہ کے سامنے عوام کا مسئلہ پیش کرتا تھا جسے مرفوع کہتے تھے۔ پھر بادشاہ اس مسئلہ کے حل کے لیے جو فرمان جاری کرتا تھا، اسے توقیع کہتے تھے۔ مثلاً:

مرفوع: قلت وعدۂ ملک باوجود کثرت عطا، بہ موجب کدامین علت است؟

توقیع: پادشاہ صاحب خزانہ کہ اوراز ہیچ کس خوف واز ہیچ جار جانباشد باید کہ وعدہ کم کند وعطا بسیار نماید۔

نوشیروان کے عہد میں ولادت حضرت رسولؐ واقع ہوئی۔ ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم عربوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ حضورؐ نے دین اسلام کی تبلیغ کے لیے دوسرے ممالک کے بادشاہوں کو خطوط لکھے۔ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت عمر خطابؓ نے خبر رسانی کے نظام کو مزید تقویت بخشی۔ امیر معاویہؓ نے ڈاک اور خبر رسانی کا انتظام کیا اور باقاعدہ محکمہ قائم کیا۔ یہ محکمہ دیوان البرید کہلاتا تھا۔ صاحب البرید سلطنت کے حالات و واقعات کی اطلاع خلیفہ کو پہونچاتا تھا۔ خلیفہ ہارون رشید کے ایرانی وزیر یحییٰ برمکی نے نظام برید کو نئی طرز پر قائم کیا۔ بغداد کو حکومت کے دوسرے خطوں سے جوڑنے کی غرض سے اچھی سڑکیں بنوائیں تاکہ گھوڑے آسانی اور تیزی سے ڈاک لے جاسکیں۔

ہندوستان میں خبر ناموں کے اس نظام کو متعارف کروانے والے غزنوی ہیں۔ ابوالفضل بیہقی (19) انیس برس تک غزنوی سلاطین کے دیوان رسائل کا منشی رہا۔ اس نے تیس (30) جلدوں میں غزنویوں کی تاریخ لکھی۔ یہ تاریخ مسعودی کے نام سے مشہور ہے۔ بیہقی کے مطابق سلطان محمود غزنوی کی حکومت میں اخبار واطلاعات، رسل ورسائل کے ساتھ جاسوسی کا بھی ایک مستقل شعبہ تھا۔ کبوتروں سے بھی خبر رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ غزنویوں کے عہد میں قاصد بھی ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں قاصدوں کی بروقت آمد سے مسعود غزنوی کے بیٹے ابراہیم اور فرخزاد دونوں کی جان بچی اور فرخزاد تو تخت نشین بھی ہوا۔ منہاج السراج اپنی مشہور تاریخ طبقات ناصری میں جو ابتداء آفرینش سے لے کر 658ھ تک کے حالات پر مبنی ہے، لکھتا ہے، معتبر اشخاص فلاں واقعہ کے راوی ہیں، جب غوریوں نے غزنی کو برباد کیا تو اس کی روداد خبر رسانوں نے مرتب کی اور منہاج سراج نے اس خبر نامے سے استفادہ کیا۔ عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی معروف بہ وصاف حضرت نے تاریخ وصاف 1328 میں لکھی۔ تاتاری لشکر کا ذکر کرتے ہوئے وہ جرائد، مضامین، صحائف اخبار جیسے الفاظ انتہائی روانی سے استعمال کرتا ہے۔

بینندگان جرائد احوال روزگار و دانندگان مضامین صحائف اخبار...

مسلمانوں نے ہندوستان میں داخل ہوتے ہی اخبار و اطلاعات کی نشر واشاعت کا کام زمانے اور حالات کے مطابق شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی مملکت کے ہر ہر حصے میں اعلانیہ اور خفیہ خبر نویس مقرر کیے اور ان کے ذریعے وہ اپنی قلمرو کے ہر حصے کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ سلطان ناصر الدین محمود، بلبن، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق اور شیر شاہ سوری نے اس امر میں کافی دلچسپی دکھائی۔ سلطان ناصر الدین محمود کے کچھ امرا نے ملک کے باغیوں کو حملے کی دعوت دی لیکن کچھ بیدار اور وفادار اخبار نویسوں کو یہ بات معلوم ہوگئی۔ انھوں نے بڑی سرعت سے بادشاہ کو اس سازش کی اطلاع دے دی۔ بادشاہ نے وقت رہتے اقدام کیا اور امرا کی چال ناکام ہوئی۔ ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ کبھی کبھی خبر عوام تک پہونچانے کے لیے مساجد کے منبر کا استعمال کیا جاتا تھا اور کبھی ڈھول بجا کر شہر میں منادی کی جاتی تھی۔ محمد بن تغلق کے زمانے میں محکمۂ ڈاک بہت مضبوط ہوگیا تھا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق دہلی سے ملتان کی مسافت پندرہ دن کی ہے لیکن خبر رساں پانچ دن میں ہی خبر پہونچا دیتے ہیں۔ یہاں ڈاک کو برید کہتے ہیں۔ برید دو قسم کی ہوتی ہے (1) سوار برید (2) پیدل برید۔ پیدل برید کا سلسلہ بہت دلچسپ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق ہر گاؤں کے باہر ایک بر.جی ہوتی ہے جس پر ہر کارے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں دو گز لمبی ایک لاٹھی ہوتی ہے۔ اس کے ایک سرے پر گھنگھرو بندھا ہوتا ہے۔ ہر کارے کے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں ڈاک ہوتی ہے۔ وہ تمام راستے گھنگھرو بجاتا چلتا ہے۔ اس کی آواز سن کر اگلی بر.جی کا ہر کارہ فوراً تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح ڈاک جلدی پہونچتی ہے۔ شمس سراج عفیف تاریخ فیروز شاہی میں فیروز شاہ تغلق کے عہد کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ فیروز شاہ کی فوج کو چھ ماہ تک ایک ہی مقام پر قیام کرنا پڑا۔ دہلی سے رابطہ بالکل منقطع ہوگیا۔ ایک دن بادشاہ نے فوج میں اعلان کیا کہ سب اپنے متعلقین کو خط لکھیں۔ چنانچہ فوجیوں نے خط لکھ دیے۔ یہ خط ایک اونٹ کا بار تھے اور اتنے خطوط دہلی روانہ کیے گئے۔ تاریخ داؤدی کی رو سے سکندر لودی عوام کی بہبودی کی خاطر منڈیوں کے بھاؤ پر نگاہ رکھتا تھا۔ اس کے لیے اس نے مخصوص خبر رساں مقرر کر رکھے تھے۔ اس معاملے میں وہ بدعنوانی برداشت نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان کے قدیم بادشاہوں میں چندر گپت موریہ خفیہ معلومات اکٹھا کرتا تھا۔ وہ اس قسم کی معلومات خفیہ ذرائع سے یکجا کرتا تاکہ صحیح نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو۔ چندر گپت جس نامہ نگار کے بیان میں غلطی دیکھتا اسے سخت سزا دیتا۔ برنی سلطان بلبن کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ اس کے ایک جاگیر دار نے شراب کے نشے میں اپنے ملازم کو اتنا پیٹا کہ اس کی موت ہوگئی۔ یہ واقعہ بدایوں کا ہے۔ کافی دنوں بعد سلطان بلبن بدایوں گیا تو ملازم کی بیوہ نے

رورو کر سلطان سے فریاد کی۔ سلطان بلبن نے حکم دیا کہ اس جاگیردار کو ملازم کی بیوہ کے سامنے اس طرح زدوکوب کرو کہ وہ ہلاک ہو جائے دوسری طرف وہاں پر مامور اخبار رساں کو بلا کر شہر بدایوں کے دروازے پر لٹکا کر پھانسی دے دی کیونکہ اس نے اس واقعہ کی اطلاع سلطان کو نہیں بھیجی تھی۔

شیر شاہ سوری نے خبر رسانی کے انتظام کو دوسروں سے بہتر طریقے پر کیا۔ اس کے لیے اس نے عمدہ سڑکیں، ڈاک چوکیاں اور سرائے بنوائیں۔ اس نے رہتاس میں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ وہاں سے سونار گاؤں (بنگال) تک، شہر آگرہ سے برہان پور یعنی دکن کی حد تک، آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ تک اور شہر دہلی سے روہتک، ہانسی، سرسہ سے ملتان تک اور شہر لاہور سے ملتان تک سڑکوں کا جال بچھا دیا۔ ہر دو کوس کے فاصلے پر ڈاک چوکی اور بارہ کوس کے فاصلے پر ایک عمدہ آرام دہ سرائے تعمیر کروائی۔ ان سرائے کی تعداد سترہ سو ہے۔ ہر سرائے اور ڈاک چوکی پر دو دو گھوڑے تیار رکھے جاتے تھے تاکہ ڈاک جلدی بھیجی جا سکے۔

مغلوں نے دیگر شعبوں کی مانند اخبار نویسی اور اخبار رسانی پر بھی خاص توجہ دی۔ طبقات بابری کا مصنف شیخ زین بابر کا معتمد تھا۔ اس نے ایک جنگ سے متعلق مراسلہ بابر کو بھیجا۔ یہ مراسلہ بابر کو اتنا پسند آیا کہ اس نے لفظ بہ لفظ توزک میں شامل کر لیا۔ شیخ زین لکھتا ہے ''مظفر و منصور افواج شاہی کے کان ہر وقت سلطان ابراہیم والی جنگ کے واقعات پر لگے ہوئے تھے کیونکہ خبریں پے در پے موصول ہو رہی تھیں۔''

غیاث الدین ابن ہمام الدین معروف بہ خواند میر (1475 تا 1535) عہد ہمایونی کا سب سے بڑا اخبار نویس اور مؤرخ گزرا ہے۔ اس کا لقب امیر اخبار تھا۔ اس نے ایک کتاب ہمایوں نامہ لکھی جس میں ہمایوں کے دور کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔ شیخ زین کی طبقات بابری اور جوہر کی تذکرۃ الواقعات میں بھی ایک مختصر مدت کے اخبار نویسوں کی خبریں اور واقعات درج ہیں۔ اکبر کے زمانے میں ہر ضلع میں وقائع نگار یا واقعہ نویس تعینات تھے۔ ان کے بھیجے ہوئے واقعات اور خبروں پر ہی شہنشاہ اپنے فیصلے صادر کرتا تھا۔ اکبر نے اس کام پر چار ہزار ہرکارے لگا رکھے تھے لیکن شاہی ڈاک کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور وہ پانچ دن میں ہی پہنچ جاتی تھی۔ شہنشاہ اکبر کا دور آتے آتے خبروں کا دائرہ خاصا وسیع ہو گیا تھا۔ اب خبریں مملکت کے خاص خاص واقعات اور جنگوں کی خبروں تک محدود نہیں تھیں بلکہ شہنشاہ و امرا کے احکام و فرامین، ان کے مشاغل، دربار کے حالات، شکار کی تفصیلات، حکمت و دانائی کی باتیں، کہانیاں، لطیفے، مالیہ، اراضی کی معافی کے اعلانات، عرضیوں پر احکام، افسروں اور اہلکاروں کی تقرری، ان کے تبادلے کے فرمان، رخصت کی منظوریاں، صلح اور جنگ کی خبریں، خاص لوگوں کی وفات کی خبر، فوجی گھوڑوں کی ہلاکت کی اطلاع، رحم کی درخواستیں، جان بخشی کی عرضی پر احکام، دربار عام کی روداد، آفات ارضی و سماوی، کاشت اور فصل کی اطلاع شامل ہوتی تھی۔

ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ واقعہ نویس مقرر کیے جاتے تھے تو تقرری کے وقت انھیں ہمیشہ سچ بات لکھنے کی ہدایت دی جاتی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ جہاں تک ہو سکے امرا کو ناراض نہ ہونے دو اور ہر بیان پوری تصدیق کے ساتھ قلمبند کرو۔ واقعہ نویس اپنی تمام خبروں کو محفوظ کر لیا کرتے

شیر شاہ سوری نے خبر رسانی کے انتظام کو دوسروں سے بہتر طریقے پر کیا۔ اس کے لیے اس نے عمدہ سڑکیں، ڈاک چوکیاں اور سرائے بنوائیں۔ اس نے رھتاس میں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ وھاں سے سونار گائوں (بنگال) تک، شہر آگرہ سے برھان پور یعنی دکن کی حد تک، آگرہ سے جودہ پور اور چتوڑ تک اور شہر دھلی سے روھتک، ھانسی، سرسہ سے ملتان تک اور شہر لاھور سے ملتان تک سڑکوں کا جال بچھا دیا۔ ھر دو کوس کے فاصلے پر ڈاک چوکی اور بارہ کوس کے فاصلے پر ایک عمدہ آرام دہ سرائے تعمیر کروائی۔ ان سرائے کی تعداد سترہ سو ھے۔ ھر سرائے اور ڈاک چوکی پر دو دو گھوڑے تیار رکھے جاتے تھے تاکہ ڈاک جلدی بھیجی جا سکے۔ مغلوں نے دیگر شعبوں کی مانند اخبار نویسی اور اخبار رسانی پر بھی خاص توجہ دی۔

تھے اور وقت پڑنے پر جمع کی گئی خبروں سے اہم معلومات مہیا کراتے تھے۔ ایک مرتبہ جہانگیر کو ایک متعینہ مدت تک کیے گئے شکار کے اعداد و شمار درکار تھے۔ اہلکاروں اور اخبار نویسوں نے اپنی محفوظ خبروں کے خزانے سے اسے یہ اطلاع بہم پہنچائی۔ عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں ایک ایسی خبر نقل کرتا ہے جو غیر سیاسی ہے۔ یہ موسم کا مزاج بگڑنے کی خبر ہے۔ ''سمندر کی تیزی و تندی کے باعث کوئی ایک ہزار لدے ہوئے جہاز اور خالی جہاز غرق ہو گئے۔ جہازوں کے مالک مفلس و نادار ہو گئے۔ جس علاقے پر سمندر کی لہریں پھر گئیں وہ نمک سے بھر گیا اور اراضی ناقابل کاشت ہو گئی۔''

اورنگ زیب عالمگیر کا عہد آتے آتے خبر نامے اخبار کہلانے لگے۔ خوافی خان منتخب اللباب میں یوں رقمطراز ہے۔ 'شہنشاہ کو احمد آباد کے اخباروں سے معلوم ہوا کہ شہزادہ محمد مراد بخش نے اپنے نام کا سکہ و خطبہ رائج کر دیا ہے۔

یہ خبر بھی اخبار سے ہی معلوم ہوئی کہ جب سلیمان شکوہ ہردوار پہنچ رہا تھا اس نے سنا کہ اس کے مقابلے پر ایک فوج بھیجی گئی ہے، چنانچہ وہ سرینگر کے پہاڑوں کو بھاگ گیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں خبریں ضرورت کے تحت پکار کر بھی سنائی جاتی تھیں۔ اسی کے زمانے میں اخبار ہاتھ سے لکھے گئے جو امرا اور حکام کو ارسال کیے جاتے تھے۔ اسی عہد میں قلمی اخبارات کی اشاعت کے بھی نشان ملتے ہیں۔ یہ اخبار شاہی فوج کو مہیا کرائے جاتے تھے۔ اورنگ زیب نے اخبار کو پوری آزادی عطا کی تھی۔ ایک مرتبہ بنگال کے ایک اخبار اورنگ زیب اور اس کے پوتے مرزا عظیم الشان کے رشتوں پر تنقید کی لیکن بادشاہ نے اخبار سے اس پر کوئی سوال نہ کیا۔ رقعات اورنگ زیب عالمگیر سے ایک عبارت پیش ہے جو اس عہد کے اخبار، طریقۂ خبر رسانی اور بدعنوانی پر جاری بادشاہ کے فرمان پر روشنی ڈالتی ہے۔

''فرزند عالی جاہ! بہ اظہار جاسوسان معلوم شد کہ شاہراہ از بہادر پور تا خجستہ بنیاد خالی از خطر نیست۔ قطاع الطریقان مال بیوپاریان و مسافران بہ غارت می برند و مترددین بی ایمنت نمی توانند آمد و رفت نمود۔ ہرگاہ در قرب لشکر ما شما این حال بودہ باشد، وائے بر حال طریق دور دست و معلوم می شود کہ منہیان اخبار معتبر بہ آن فرزند نمی رسانند۔ از آنجا کہ غفلت و بے پروائی خلاف طریق ریاست و جہان بانی است۔ کاتبان جدید بہ تہدید تعین نمایند و عملۂ پیشین را بہ سزا رسانند۔ فوجی مستعد مقرر سازند کہ استیصال مفسدان از بیخ و بن کردہ شاہراہ از شر جماعت رہزنان پاک سازند۔ ننگ بے عملی تا کے گوارا توان کرد۔'' غرضکہ فارسی کتابوں میں خاص طور سے تاریخ میں، اطلاعات اور اخبار نویسوں کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ مسلم سلاطین بالخصوص مغلوں کا عہد آتے آتے خبروں کی فراہمی، ان کی بہم رسانی اور اشاعت کا کام کافی ترقی کر گیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں قلمی اخبار کی اشاعت اس کا ثبوت ہے۔ اورنگ زیب عہد مغلیہ کا آخری باوقار بادشاہ رہا۔ اس کے بعد مغل سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ انھوں نے اپنی ضرورت کے مطابق چھاپا خانہ لگایا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فارسی زبان صدیوں سے خاص و عام کی زبان ہونے کے باوجود دم توڑ رہی تھی لیکن بجھتی شمع کی لو کو ایک بار پھر بھڑکنا تھا۔ یہ لو فارسی صحافت کے عروج کی صورت میں آخری بار بھڑکی اور دنیا کا پہلا فارسی اخبار 20 اپریل 1822 کو شائع ہوا۔ اس کا نام مرآۃ الاخبار تھا۔ اس کے بانی راجا رام موہن رائے تھے۔

■

Dr. Saleha Rasheed, C-160, G.T.B. Nagar
Karaily, Allahabad-211016

قوانین صحافت کمپنی کے عہد میں

محمد شکیل

ایسٹ انڈیا کمپنی کے وجود سے جہاں لامتناہی نقصانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہیں فن طباعت وصحافت میں مفید اضافے بھی ہوئے۔ چنانچہ موجودہ صحافت کا سنگ بنیاد بھی اسی کا رہین منت ہے۔ یہ تعمیری اقدام نہیں تھا بلکہ کمپنی کے بعض معتوب اور شورہ پشت (نافرمان) ملازمین نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ انھیں میں ولیم بولٹس بھی تھے جو کمپنی کی ملازمت کے باوجود نجی تجارت کے مرتکب تھے۔ یہ جرم بالآخر ترک ملازمت کا باعث ہوا۔ اور موصوف نے کمپنی کے ارباب حل وعقد سے بیزار ہوکر اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ کمپنی کی سیاہ کاری اور نہفتہ راز منظر عام پر آسکیں۔

(نادر علی خان، ہندوستانی پریس (1556 تا 1900)، ص 244، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، 1990)

ولیم بولٹس اخبار جاری کرکے کمپنی کے مظالم وجملہ عیوب کو عوام الناس کے سامنے لانا چاہتے تھے جس کا ادراک وہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن ابھی بولٹس کی آرزوئیں پایہ تکمیل کو بھی نہ پہنچی تھیں اور ان کے اخبار کا خواب اشتہار سے آگے بھی نہ بڑھا تھا کہ انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔ ولیم بولٹس کی جلاوطنی کے بعد اب اس کام کو آگے بڑھانے اور اس خلا کو (جو ولیم بولٹس کی جلاوطنی سے پیدا ہوئی تھی) پر کرنے کے لیے 'جیمس آگسٹس ہکی' سامنے آئے۔ اور اپنی بے باکی اور ہمت وحوصلہ کی وجہ سے اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ 29 جنوری 1780 میں ہکی اپنا انگریزی ہفت روزہ اخبار ''ہکیز بنگال گزٹ' یا 'کلکتہ ایڈورٹائزر' کے نام سے جاری کرکے ہندوستانی صحافت کے امام ومقتدا کہلائے۔ اس طرح ہندوستان میں انگریزی زبان کے ذریعے صحافت کا آغاز ہوا۔ مگر ابھی دو سال کا عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہندوستان کا یہ پہلا اخبار بھی 1782 میں کمپنی کے ظلم وستم کا شکار ہوکر بند ہو گیا۔ لیکن اب بولٹس اور ہکی کے حوصلوں کو پروان چڑھانے والا جم غفیر کمپنی کے ظلم وستم کا نشانہ بننے اور سختیوں کو جھیلنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اور اخبار کے ذریعے مختلف لوگ مختلف جگہوں سے کمپنی کے ظالمانہ رویے کے خلاف احتجاج بلند کر رہے تھے جس کو روکنا اب کمپنی کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ لارڈ ولزلی (Lord Wellesley) نے 1799 میں سنسر شپ آف پریس ایکٹ (Censorship of press Act) لاگو کر دیا۔ جس کے تحت اخبارات پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ اس ایکٹ کے لاگو ہونے کے بعد صرف وہی اخبارات شائع ہو سکتے تھے جو کمپنی بہادر کی نظر میں معتبر تھے۔ اس کے باوجود اخبارات شائع ہوتے رہے، اور ان اخبارات کے مالکان ومدیر کمپنی کے ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں کلکتہ، ممبئی کے علاوہ مدراس، صحافت کے افق پر تیسرا بڑا شہر بن کر ابھرا اور انگریزی، تمل، تیلگو کے علاوہ شمال مغرب کے صوبوں میں ہندی اور اردو زبان میں بھی اخبارات شائع ہونے لگے۔ چنانچہ گورنر جنرل باجلاس کونسل نے 9 اپریل 1807 کو کلکتہ کے سات اخبارات میں سے چھ کے نام امتناعی احکامات جاری کیے اور اخبارات ومطابع پر مزید پابندیاں بڑھا دی گئیں اور تمام پبلک جلسے ممنوع کر دیے گئے لیکن ان قیود کا نتیجہ یہ ہوا کہ ممنوعات کی اشاعت اخبارات کے بجائے اشتہارات کے ذریعے عام ہو گئی۔ غرضیکہ جتنی پابندیاں اخبارات پر بڑھتی رہیں اخباروں کی تعداد میں اتنا ہی اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ اخبارات کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کے لیے 1823 میں 'جان ایڈم' نے لائسنسنگ ریگولیشن ایکٹ (Licensing Regulation Act) جاری کیا۔ جس کو آئینی حیثیت حاصل تھی۔ اس ریگولیشن کے اہم نکات یہ ہیں:

(1) گورنر جنرل باجلاس کونسل سے لائسنس لیے بغیر کوئی اخبار یا رسالہ شائع نہیں کیا جا سکتا ہے۔

(2) لائسنس کی درخواست پر مالک ومدیر اور اخبار وناشر کا نام اور دفتر کی کیفیت کا اندراج ضروری ہے۔

(3) کسی بھی وقت لائسنس کو منسوخ یا ضبط کیا جا سکتا ہے۔

(4) بلا اجازت اخبار جاری کرنے پر چار سو روپیہ جرمانہ اور پریس حکومت کی طرف سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

(5) قانون صحافت کی خلاف ورزی کرنے پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

(6) کوئی بھی اخبار اس وقت تک شائع نہ کیا جائے گا جب تک حکومت کا سکریٹری اس کے تمام اندراجات کا معائنہ نہ کر لے۔

مذکورہ آئین کے نفاذ سے ایوان صحافت میں زلزلہ آ گیا۔ اور اخباروں کی تعداد میں کمی کے امکانات ظاہر ہونے لگے اور یہ سارے قوانین وضوابط اس لیے تھے کہ ذہین اور دیسی باشندوں کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔ تاکہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناانصافیوں اور غلطیوں کا پردہ چاک کرنے سے باز آ جائیں۔ مگر ہزاروں قوانین کی بندشوں اور جلاوطنی کی سزاؤں اور بہت سے اخبارات کی ضبطی اور جرمانے کے باوجود یہ سلسلہ نہ رکا بلکہ روزافزوں ترقی کی راہ پر گامزن رہا۔

6 فروری 1835 کو کلکتہ کے 9 ممتاز اخبار نویسوں نے جن میں چھ انگریز اور تین ہندوستانی تھے لارڈ ولیم بینٹنک (Lord William Bentinck) کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کی جس کے ابتدائی حصے میں 'جان ایڈم' کے نافذ کردہ قوانین کا موثر انداز میں رد کیا گیا تھا۔ اور قوانین کو منسوخ کرنے کی سفارش کی گئی تھی کہ ان پابندیوں کو منسوخ کرکے اخبارات کے لیے ایک نیا قانون مرتب کرکے رائے عامہ کے لیے مشتہر کیا جائے اور ڈاک محصول میں کمی کی جائے۔ مگر ان کی یہ عرضی مسترد کر دی گئی اور لائسنسنگ ریگولیشن بدستور قائم رہا۔ چنانچہ حالات بدلے اور ان کی جگہ چارلس مٹکاف (Sir Charles Metcalfe (acting) گورنر جنرل ہوئے

جو آزادیٔ صحافت کے خواہاں اور حامی تھے، اور لائسنسنگ ریگولیشن کی تنسیخ کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔ غرضیکہ انھوں نے سارے ضوابط کو منسوخ کر کے 1835 میں پریس ایکٹ (Press Act) نافذ کردیا جس کی رو سے اخبارات پر حسب ذیل پابندیاں رہ گئیں:

(1) اخبار جاری کرنے کے لیے صرف ایک ڈکلیریشن کی ضرورت ہوگی اگر مقام اشاعت تبدیل کیا جائے تو نیا ڈکلیریشن داخل کرنا ہوگا۔

(2) پرنٹر اور پبلشرز اخبار میں چھپے ہوئے سارے مواد کے ذمے دار ہوں گے۔

(3) اخبار کے ہر شمارے پر مطبع پرنٹر اور پبلشرز کا نام اور مقام اشاعت درج کیا جائے گا۔

(4) ان قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر پانچ ہزار تک کا جرمانہ اور دو سال تک کی سزا دی جائے گی۔

مٹکاف کے ان قوانین پر 1857 تک عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ فروری 1857 میں کارتوسوں کا مسئلہ چنگاری کے روپ میں ظاہر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اخبارات نے اس خبر کی تشہیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسئلے کی نوعیت اور اہمیت کے پیش نظر زور قلم آزمایا گیا، اور مردہ دلوں میں حب الوطنی کی تپش اور غیرت ملی کی سوزش پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ حتیٰ کہ 1857 کا وہ عظیم سانحہ پیش آیا جسے انگریز مورخین غدر اور ہندوستانی پہلی جنگ آزادی کے نام سے جانتے ہیں۔

سارا ملک خانہ جنگی کے شعلوں سے جل رہا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔ چنانچہ ارباب حل وعقد نے محسوس کیا کہ پریس کی آزادی سم قاتل ہے۔ اگر بروقت کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی تو عنان حکومت جاتی رہے گی۔ اس لیے 1857 میں کیننگ (The Viscount Canning) نے لائسنسنگ ایکٹ (Licensing Act) نافذ کیا۔ جس میں لائسنس کو ضبط یا منسوخ کرنے کا پورا پورا حق کمپنی کو حاصل تھا، اور کتاب، اخبار یا طباعت کی کسی شے کو ضبط کرنے کا حق بھی حاصل تھا۔

1867 میں سرجان لارنس (Sir John Lawrence) نے رجسٹریشن ایکٹ (Registration Act) نافذ کیا۔ جس کے تحت اخبار، پرنٹر، پبلشرز اور اشاعت کی جگہ کا نام پرنٹ کرنا ضروری تھا اور کتاب کی ایک نقل ایک ماہ کے اندر اندر مقامی حکومت کو پیش کرنا ضروری تھا۔ اس کے تقریباً گیارہ سال بعد 1878 میں لارڈ لٹن (The Lord Lytton) نے ورنا کلر پریس ایکٹ (Vernacular Press Act) نافذ کیا۔ جس کے تحت مندرجہ ذیل پابندیاں عائد تھیں:

(1) مقامی پریس کو یہ آزادی نہیں ہے کہ وہ حکومت پر تنقید کرے۔

(2) مجسٹریٹ کا فیصلہ کسی بھی تنازع میں حتمی ہوگا۔

(3) مقررہ رقم سکیورٹی کی ضمانت کے لیے ادا کی جائے گی۔

(4) مجسٹریٹ کو پریس کے اثاثے ضبط کرنے اور مقامی اخبار کو جبراً بند کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

(5) ضبطی کے خلاف 15 دن کے اندر ہائی کورٹ میں اپیل کی جاسکتی ہے۔

یہ سارے قوانین انگلش پریس اور اخبار پر لاگو نہیں تھے۔ اس ایکٹ کے تحت سات ہندوستانی پریس ضبط کیے گئے۔ 1882 میں لارڈ ریپون (Lord Ripon) نے اس ایکٹ کو منسوخ کردیا۔

مقامی پریس کی آزادی اس وقت کا سب سے اہم مسئلہ تھا، مگر انھیں اس بات کا ڈر تھا کہ اگر مقامی پریس کو آزادی دے دی گئی تو حکومت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس لیے ایسی تحریروں کو جس سے مقامی باشندوں میں اتحاد ویکجہتی اور آزادی

کا جذبہ پیدا ہو ہمیشہ دبانے کی کوشش کی گئی، اور انھیں ہی باغی و لائق سزا گردانا گیا اور بہتوں کو تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، پریس کو ضبط کرلیا گیا۔ تاکہ ان کے اندر آزادی کا جذبہ پیدا نہ ہوسکے۔

1908 میں منٹو (The Earl of Minto) نے نیوز پیپر ایکٹ (Newspaper (Incitement to Offences) Act) نافذ کیا جس کے تحت حکمراں طبقے کے خلاف تشدد اور قتل وغارت گری پر اکسانے والے مضامین کے شائع کرنے پر مجسٹریٹ کو پریس کی جائیداد ضبط کرنے کا پورا اختیار دیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کے تقریباً دو سال بعد 1910 میں لارڈ ہارڈنگ (The lord Hardinge of Penshurst) نے انڈین پریس ایکٹ (Indian Press Act) نافذ کیا۔ 1910 سے 1914 تک ہندوستانی صحافت پر زبردست پابندیاں عائد ہوئیں۔ جن میں پچاس کے قریب انگریزی اور دو سو بہتر (272) ورنا کلر اخبارات پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔"

(شعبۂ فاصلاتی تعلیم، یونیورسٹی آف حیدرآباد، کورس نمبر 411، PGDMTU، ص82)

جن میں 52 اردو کے اخبارات تھے۔ 1921 میں تیج بہادر سپروؔ کی صدارت میں سفارش کی گئی، جس کے تحت 1908 اور 1910 کے پریس ایکٹ کو منسوخ کردیا گیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں آزادیٔ صحافت کے سپاہیوں نے جیل کی سختیاں تک جھیلیں، اور آزادی کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ چنانچہ آزادی کی تحریک کو روکنے کے لیے 1930 میں لارڈ آرون (The Lord Irwin) نے انڈین پریس آرڈیننس (Indian Press Ordinance) وضع کیا۔ جس کے تحت ہندوستان میں اٹھنے والی آزادی کی تحریکوں اور جدوجہد کو بغاوت کا نام دے کر پابندی عائد کی گئی۔ اور اس آرڈیننس کے تحت مجسٹریٹ کو اخباروں پر جرمانے اور ضبطی کا پورا پورا اختیار دیا گیا۔ اور اس کے ذریعے ہندوستان میں اٹھنے والی مختلف تحریکوں کو دبانے کی پرزور کوشش کی گئی تھی۔

مگر اب صحافت کی راہ کو جبراً روکنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے کمپنی نے ایک منصوبہ بند حکمت عملی کے ذریعے اخباروں کی سرپرستی کرنے کا فیصلہ کرلیا اور گزشتہ سارے قوانین وضوابط کو منسوخ کر کے اخبارات کو آزادی دے دی۔

چنانچہ اخباروں کی آزادی کے بارے میں کچھ عرصے بعد گورنر جنرل تھامس منرو (Thomos Munro) کا ایک بیان اس بات کو بالکل صاف کردیتا ہے کہ ہندوستان میں اخباروں کی آزادی کے بارے میں انگریز کس طرح سوچتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

"ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر مضبوط کی تھیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی ہے اور نہ کبھی دی جائے گی۔ اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کی انتہائی آزادی کو ہی پسند کرتا۔ لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لیے اس سے زیادہ خطرناک کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی۔ اخباروں کی آزادی اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو نہ ایک ساتھ جمع ہوسکتی ہیں اور نہ مل کر ایک ساتھ چل سکتی ہیں۔"

(غلام حیدر، اخبار کی کہانی، ص64، مطبع قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی)

تھامس منرو کا یہ قول بالکل سچ ثابت ہوا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل وعقد کو جس چیز کا ڈر تھا وہی ہوا۔ اخباروں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں حب الوطنی کا ایسا جذبہ پیدا کیا کہ وہ موت کو غلامی پر ترجیح دینے لگے۔

■

Mohd Shakeel, 82, Aftab Hostel, Aftab Hall, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202001 (UP)

اے ایم صدیقی

اردو صحافت: اجمالی جائزہ

اُردو صحافت نے گزرے ہوئے وقت میں کئی نشیب وفراز دیکھے، انگریزوں کی ہندوستان میں بڑھتی اجارہ داری دیکھی، مغلیہ سلطنت کے چراغ کو بجھتے دیکھا، 1857 کے غدر میں مسلم قوم کی نسل کشی دیکھی، لسانی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی تبدیلی دیکھی' اردو صحافت نے اپنے اس دور میں ہندوستان کی ہر اُس چھوٹی بڑی تبدیلی کو دیکھا، پرکھا اور اپنے دامن میں ان واقعات کو جگہ دی جن سے ہمارا ماضی جڑا ہوا ہے۔ اُردو صحافت جو بتدریج ترقی کی سمت رواں دواں ہے۔ محققین اخبار 'جامِ جہاں نما' کو اُردو کا پہلا اخبار کہتے ہیں جو سنہ 1822 میں جاری ہوا۔

''جام جہاں نما اُردو کا پہلا اور ہفتہ وار اخبار تھا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی مصلحتوں کے تحت نکلوایا اور کبھی اردو کبھی فارسی کبھی دونوں زبانوں میں نکلا۔''

(اُردو صحافت مرتبہ انور علی دہلوی سنہ اشاعت 1987)

انگریز اپنی حکمت عملی کو روبہ عمل لانے کے لیے اخبار 'جام جہاں نما' کو مختلف زبان میں شائع کرواتے رہے۔ ان کے اس عمل سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ انگریز انیسویں صدی کے وسط میں ہونے والی لسانی تبدیلی پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ دوسری یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی زبان و بیان کو اپنی تجارتی و اقتصادی کامیابیوں کے علاوہ اپنی ظالمانہ حکومت کو پروان چڑھانے کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ اس وقت تک مغلیہ سلطنت کی سرکاری زبان فارسی تھی جبکہ بول چال کے لیے اُردو زبان کا استعمال عام تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی مقامی سطح سے قومی سطح تک مفاہمت کرنا چاہتی تھی۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج اور مدراس میں فورسینٹ جارج کالج کا قیام اسی مفاہمت کا ایک حصہ تھا۔

لارڈ ویلزلی فورٹ ولیم کالج کے قیام کے لیے اس قدر بے تاب تھا کہ اس نے ڈائرکٹروں کی منظوری کا انتظار کیے بغیر 10 جولائی 1800 مطابق 17 صفر 1215ھ کو فورٹ ولیم کالج کی باقاعدہ داغ بیل ڈال دی۔ گورنر جنرل کے حکم خاص سے قانونی دستاویز پر کالج کے قیام کی تاریخ 4 مئی 1800 ڈالی گئی جو میسور کی راج دھانی سرنگا پٹنم پر برطانوی افواج کی فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ ہے۔

(فورٹ ولیم کالج کی اُردو خدمات: افضل الدین اقبال)

فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اردو زبان کی وسعت میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ کئی نثری کتابیں جو فارسی زبان میں تحریر تھیں اردو زبان میں منتقل کی گئیں۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں فارسی زبان کی جگہ 'اُردو' زبان عام بول چال کی زبان کی شکل میں تیزی سے اُبھر رہی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہندوستان کی سیاسی تبدیلی بھی تھی۔ طاقت ور مغلیہ حکومت لال قلعہ سے پالم کے علاقہ تک محدود ہوکر رہ گئی تھی۔ لوگوں کے درمیان یہ مثال عام تھی کہ ''شاہ عالم دلی تا پالم''۔ بیسویں صدی کے اس عہد میں اقتدار کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی معاشرتی اور لسانی تہذیب میں بھی تیزی سے بدلاؤ آ رہا تھا۔ مگر اس عہد میں فارسی کے اخبارات نے فارسی زبان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود نے اپنی کتاب 'اُردو صحافت انیسویں صدی میں' میں فارسی اخبارات کے 26 ناموں کو گنوایا ہے۔ جن میں 'جام جہاں نما' بھی موجود ہے۔ فارسی اخبارات کی یہ تعداد سنہ 1822 تا 1899 تک محیط ہے۔ 77 سال کے عہد میں 26 فارسی کے اخبارات منظر عام پر آئے کچھ اخبارات انگریزوں کے عتاب کی نذر ہوئے۔ کچھ معاشی مسائل سے دوچار ہوئے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود انیسویں صدی کی فارسی صحافت کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تقریباً پون صدی کی فارسی صحافت کا جائزہ لیا جائے تو پہلی بات یہ نظر آتی ہے کہ اتنی طویل مدت میں فارسی اخبارات کی تعداد بہت قلیل رہی... 'جامِ جہاں نما' کی شاعت 26 اور 'سراج الاخبار' کی 34 تھی۔ سب سے کثیر الاشاعت 'زبدۃ الاخبار' تھا جس کی 157 کاپیاں چھپتی تھیں کیونکہ اسے امرا اور والیان ریاست کی سرپرستی حاصل تھی۔ اخبارات مہنگے تھے۔ سب سے سستے اخبار کا ماہانہ چندہ ایک روپیہ تھا ورنہ عام طور پر دو روپیہ ماہانہ تھا۔ گویا آٹھ آنے کا ایک اخبار''

(انیسویں صدی میں اُردو صحافت ص 119)

بیشتر فارسی کے اخبارات ہندوستان کے بڑے شہروں سے شائع ہوا کرتے تھے۔'جام جہاں نما' کلکتہ سے 'سراج الا خبار' دہلی سے 'زبدۃ الاخبار' آگرہ شہر سے شائع ہوا کرتے تھے۔ان شہروں میں فارسی جاننے والوں اور بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔مگر اس کے باوجودان اخبارات کی اشاعت بہت معمولی تھی۔آگرہ سے شائع ہونے والا'زبدۃ الا خبار' کی سب سے زیادہ اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ جس اخبار کے سر پر امرا، جاگیر دار، منصب دار، سیٹھ ساہوکاروں کا ہاتھ تھا وہ اخبار نہ صرف اشاعت کی دوڑ میں آگے تھا بلکہ امیر ترین اخبارات کی صف میں شامل ہوتا تھا۔ فارسی اخبارات کی کم اشاعت کا دوسرا بڑا سبب اردو زبان کی تیزی سے ترقی بھی تھی۔ اسی عہد میں مولوی محمد باقر نے 1837 'میں'دہلی اُردو اخبار' کے نام سے اردو اخبار شائع کیا۔ 1857 تک درجنوں اردو اخبارات منظر عام پر آئے۔غدر کے ہنگاموں میں انگریزوں نے مولوی محمد باقر پرغداری کا الزام لگایااورانھیں موت کی سزادی۔مولوی محمد باقر اردو صحافت کے پہلے شہید ایڈیٹر ہیں۔ انگریزوں نے ان پردلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کے قتل میں مدد کرنے کا الزام عائد کیا تھااوراسی کی پاداش میں انھیں موت کی سزا دی گئی تھی۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ مولوی محمد باقر نے غدر سے پہلے اپنے اخبار کے ذریعے انگریزوں کے خلاف خوب لکھااورمجاہدین آزادی کی کھل کرتائیدکی۔

کتاب 'اُردوصحافت اُنیسویں صدی میں' دلی اردو اخبار کے آخری شمارے کا ایک حوالہ پیش کیا گیاہے جس میں غدر کاایک چھوٹا سا نقشہ پیش کیا گیاہے۔

''چاردن سے دن رات خوب لڑائی توپ وتفنگ کی ہورہی ہے۔کفار نے کئی مورچے بنائے۔ادھر سے بھی کئی مورچے جدید بنے۔ چونکہ اخبار سوائے شہر کے باہر تونہیں جاتا کہ ضروری تفصیل کے واسطے ناظرین وواقفین کے لازم ہو اور شہر کے لوگ خودروزمرہ بہ چشم خوددیکھتے ہیں توکچھ ضرور تفصیل نہیں معلوم ہوتی''

مولوی محمد باقر اپنے اخبار کے ذریعے قارئین تک غدر کی تمام خبریں پہنچانے کے لیے ہرممکن کوشش کررہے تھے اور مجاہدینِ آزادی میں جوش وجذبہ پیدا کرنے میں کوئی کسرنہیں چھوڑی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب دلی کی سڑکوں اورلال قلعے پر مجاہدین اور انگریزوں کے خلاف زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔دلی کے لوگ دلی کی گلیوں میں برپا ہونے والی اس قیامت صغرا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انھی ہنگاموں میں دلی کالج کے پرنسپل بھی مارے گئے۔محققین کے مطابق مولوی محمد باقر نے پرنسپل ٹیلرکواردو پڑھائی تھی اور ان دونوں کے درمیان بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔مگر انگریزوں نے غدر کے بعدمولوی محمد باقر پر پرنسپل ٹیلر کے قتل میں مدد دینے کا الزام لگایا۔انگریزوں نے اس الزام کے ذریعے غدر سے متعلق اپنے اخبار میں بے باک صحافت کا بدلہ لیااور مولوی محمد باقر کوسرعام گولی ماردی۔اتنا ہی نہیں ان کے بیٹے محمد حسین کے نام بھی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا مگر وہ دلی سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔مولوی محمد باقر کا پورا گھر لوٹ لیا گیا۔غدر کے بعد مسلمانوں کو جن مصیبتوں او رتکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں مولوی محمد باقر اور ان کا گھرانہ سب سے آگے تھااور یہ مصیبتیں ان کے حصے میں کچھ

آگرہ سے شائع ہونے والا 'زبدۃ الاخبار' کی سب سے زیادہ اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ جس اخبار کے سر پر امرا، جاگیر دار، منصب دار، سیٹھ ساہوکاروں کا ھاتھ تھا وہ اخبار نہ صرف اشاعت کی دوڑ میں آگے تھابلکہ امیر ترین اخبارات کی صف میں شامل ہوتا تھا۔ فارسی اخبارات کی کم اشاعت کا دوسرا بڑا سبب اردو زبان کی تیزی سے ترقی بھی تھی۔ اسی عہد میں مولوی محمد باقر نے 1837 'میں 'دھلی اُردو اخبار' کے نام سے اردو اخبار شائع کیا۔ 1857تک درجنوں اردو اخبارات منظر عام پر آئے۔ غدر کے ھنگاموں میں انگریزوں نے مولوی محمد باقر پر غداری کا الزام لگایااورانھیں موت کی سزادی۔ مولوی محمد باقر اردو صحافت کے پھلے شھید ایڈیٹر ھیں۔ انگریزوں نے ان پر دلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کے قتل میں مدد کرنے کا الزام عائد کیا تھا اور اسی کی پاداش میں انھیں موت کی سزادی گئی تھی

زیادہ ہی آئیں۔ دلی کے ایک اور اردو اخبار 'صادق الا خبار' کے ایڈیٹر سید جمیل الدین ہجرکوتین سال کی سزاسنائی گئی۔ان پر مجاہدین آزادی کی حمایت کرنے، انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔غدر کے بعد حالات اس قدر پیچیدہ اورتباہ کن ہوئے کہ نہ صرف مسلم قوم کے حقوق اوراختیارات تلف کیے گئے بلکہ صحافت پربھی مختلف الزامات کے ذریعے پابندی عائد کی گئی۔

''لکھنوکا 'سحرسامری' بھی 'طلسم لکھنو' کی طرح جرأت مندو بے باک اخبارتھا۔بارک پور میں دیسی سپاہیوں کی بغاوت، ایران سے فوج کی پیش قدمی اور ہندوستان میں پھیلنے والی شورش وبے چینی کے بارے میں اس نے بھی پے در پے خبریں شائع کیں۔ 'عمدۃ الاخبار' بریلی تو جنگ چھڑتے ہی روہیل کھنڈ کے انقلابی قائد خان بہادر خان کا حامی ہوگیا تھا۔'دہلی اردو اخبار' کی طرح اس نے بھی اپنا نام تبدیل کرلیا اور 'فتح الا خبار' کے نام سے شائع ہونے لگا۔مجاہدین آزادی کی حمایت میں اس نے خبریں چھاپیں۔ نتیجے میں جب بریلی شہر پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہواتومطبع کوضبط کرکے اخبار بند کردیا گیا۔'حبیب الاخبار' بدایوں بھی مجاہدین کا حامی تھا جس کی پاداش میں ایڈیٹرکوسزاملی اور پریس ضبط ہوگیا۔'اخبار مرتضائی' پشاوربھی حریت پسند اخبار تھا۔ چنانچہ بعد میں مدیر مرتضائی کو باغیانہ مواد کی اشاعت کی بنا پر جیل بھیج دیا گیااور اخبار بند ہو گیا۔'مرتضائی' پرالزام تھا کہ اس نے 19 مئی 1857 کے شمارے میں ایک غلط اور اشتعال انگیز رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا تھا کہ قلات غلزئی رجمنٹ نے بیرونی چوکیوں پر اپنے افسروں کوقتل کردیا ہے۔''

(اردوصحافت انیسویں صدی میں ڈاکٹر طاہر مسعود ص389 تا390)

1857 کے غدر کے دوران ہندوستان کے تمام اردو اخبارات مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی تائید میں اور انگریزوں کے خلاف نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔اردو کے ایڈیٹر اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ غدر میں ناکامی اردوصحافت اور خودان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی۔ مگراس کے باوجود بھی بلاخوف وخطر اردوصحافت کا بے باک انداز اس کی شجاعت،حوصلہ مندی، ہندوستان سے بے پناہ محبت اور آزادی کی خواہش کوپیش کرتا ہے۔چونکہ مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر اس جنگ کے روحِ رواں تھے اسی لیے نہ صرف انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کوقید کیا بلکہ نام نہاد مغلیہ سلطنت کا خاتمہ بھی کردیا۔غدر کی کامیابی کے بعد انگریزوں نے اردوصحافت اور مسلمانوں سے دل کھول کر بدلا لیا۔کئی علمائے دین، دانشوراور بے قصور افراد کوانگریزوں نے پھانسی پر چڑھا دیا۔خلیق انجم نے فاطمہ عالم علی کی کتاب 'یاد بخیر' کا ایک اقتباس رقم کیا ہے۔جس میں فاطمہ عالم علی اپنے دادا کی شہادت کاواقعہ بیان کرتی ہیں:

''جب دہلی میں غدر ہواتو اس وقت ہمارے دادا (قاضی علی) مرادآباد کے قاضی تھےاور ہمارے والد کی عمراس وقت تیرہ سال تھی۔ دہلی کے قلعہ میں کہرام برپا تھا۔اس قیامت میں ایک شہزادہ قلعہ سے بھاگ کر مرادآباد کی طرف آنکلا،نفسا نفسی کا عالم تھا کوئی شہزادے کو پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔ ہمارے دادا کو جب معلوم ہواتو انھوں نے شہزادے کواپنے یہاں چھپالیا۔انگریزوں کے پٹھو ہرطرف پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نے خبر کردی کہ مرادآباد کے قاضی نے شہزادے کو پناہ دے کرغداری کی ہے۔شہر میں کھلبلی مچ گئی ہمارے دادا کے

دوست احباب گھبرائے ہوئے آئے اور کہا" قاضی جی آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ اب آپ کی خیر نہیں خدا کے لیے روپوش ہوجایئے۔ آپ پر غداری کا الزام لگ چکا ہے"، مگر قاضی جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا میں نے غداری نہیں وفاداری کی ہے۔ اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ ہمارے دادا مسجد میں عصر کی نماز ادا کر رہے تھے کہ انگریز ان کو پکڑ کر لے گئے اور آناً فاناً میں پھانسی دے دی۔ ادھر پھانسی ہوئی ادھر دادی کو مع بچوں کے گھر سے نکال کر مکان اور جائیداد ضبط کر لی۔ انگریزوں کے ظلم وستم سے ہر شخص خائف تھا"

(قاضی عبدالغفار: ایک ممتاز نثر نگار مرتبہ خلیق انجم ص 9)

شہید قاضی علی صاحب کو انجام کی فکر نہیں تھی۔ شہزادے کو پناہ دے کر انھوں نے مغلیہ سلطنت سے اٹوٹ محبت اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ حالانکہ انھیں اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ اس وفاداری کے بعد ان پر اور ان کے اہل خانہ پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹیں گے۔ مگر قاضی علی صاحب نے نہ صرف اپنی جان کو مغلیہ سلطنت پر قربان کر دیا بلکہ ان کا پورا گھرانہ بے یارو مددگار ہوگیا۔ اس تمام ہنگامے میں انگریزوں نے مسلم قوم کو اپنی تخریبی کارروائیوں کا محور بنایا۔ مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں، سخت سے سخت سزائیں دی گئیں اور ان کے خاندانوں کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا گیا۔ ان کی مدد کرنے والوں کے خلاف بھی سخت تادیبی کارروائی کی گئی۔

غدر کی آگ جن جن ریاستوں اور شہروں میں پھیلی وہاں پر اردو اخبارات کی اشاعت پوری طرح بند ہوگئی۔ مگر ان مقامات پر اردو اخبارات شائع ہوتے رہے جہاں پر غدر کے ہنگامے برپا نہیں ہوئے۔ اس زہریلی فضا کا اثر اردو اخبارات پر بھی پڑا۔ دلی تو پوری طرح اُجڑ چکی تھی اور وہاں کوئی بھی اردو اخبار باقی نہیں تھا۔ انگریزوں کے سخت قوانین نے اردو صحافت اور اس کی حکمت عملی کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود کے مطابق 1858 سے 1860 کے دو برسوں میں ممبئی، کلکتہ، لکھنؤ، مدراس، جون پور، اجمیر، کان پور، بنگلور، کوٹہ، سورت، فتح گڑھ سے گیارہ اخبارات جاری ہوئے۔ ان میں اودھ اخبار، شمس الاخبار، طلسم حیرت، قاسم الاخبار اور شعلہ طور جیسے اخبارات شامل تھے جن کا شمار آگے چل کر ممتاز اخبارات میں ہوا۔ 1860 تک حالات معمول پر نہیں آئے تھے۔ انگریزی سرکار کی انتقامی کارروائیاں جاری تھیں۔ لہٰذا اس دوران جتنے اخبارات نکلے، انھوں نے اپنی پالیسی نہایت محتاط رکھی۔

'اودھ اخبار' تو اعلانیہ انگریزی حکومت کا حامی اور مجاہدین آزادی کا مخالف تھا۔ 'شعلہ طور' جیسا اخبار بھی مجاہدین آزادی کی گرفتاریوں، مقدموں اور سزاؤں کی خبریں شائع کرتا رہا لیکن کسی تبصرہ کے بغیر۔ اس زمانے کے حالات ہی ایسے تھے کہ خوشامد اور احتیاط کی پالیسی کے سوا اخبارات کے لیے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مندرجہ بالا تبصرے میں اردو صحافت کی بے بسی اور بے کسی کی جھلک ملتی ہے۔ انگریزوں نے اردو صحافت کو بستر مرگ پر پہنچا دیا تھا۔ پورے ہندوستان میں اردو صحافت کو مکمل آزادی نہیں تھی۔ شمالی ہند انگریزوں کے تسلط کا شکار تھا تو دوسری جانب خودمختار ریاست 'ریاستِ حیدرآباد' میں بھی صحافت کو آزادی نہیں تھی۔ برطانیہ حکومت کو ریاستِ حیدر آباد میں آزادی تحریک، ستیہ گرہ جیسے حالات کا سامنا نہیں تھا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی ریاست حیدرآباد سے بے فکر ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی کے پیش نظر یہاں کے اُمرا وسلاطین کو زیادہ اختیارات نہیں دیے گئے تھے۔ افضل الدین اقبال صاحب نے اپنی کتاب میں انگریزوں کی گھبراہٹ کو پیش کیا جو صحافت کے نام سے تھراتی تھی۔

"انگریز سامراج نے ہندوستان کی دیسی ریاستوں کو پس ماندہ بنا کر رکھا تھا۔ تعلیمی ترقی تو کجا برطانوی ریزیڈنٹ مسٹر سیڈل ہام نے شاہ انگلستان کے یاروفادار حضور نظام سکندر جاہ آصف ثالث فرماں روائے مملکت حیدرآباد (1829-30) کو انگلستان کی بنی ہوئی ایک چھوٹی چھاپنے کی مشین (پرنٹنگ پریس) تحفتاً پیش کی تو دنیا جانتی ہے کہ گورنر جنرل وائسرائے ہند لارڈ منٹو نے برطانوی ریزیڈنٹ سے جواب طلب کیا' کہ پرنٹنگ پریس جیسی مشین بادشاہ کو کیوں دی گئی؟۔

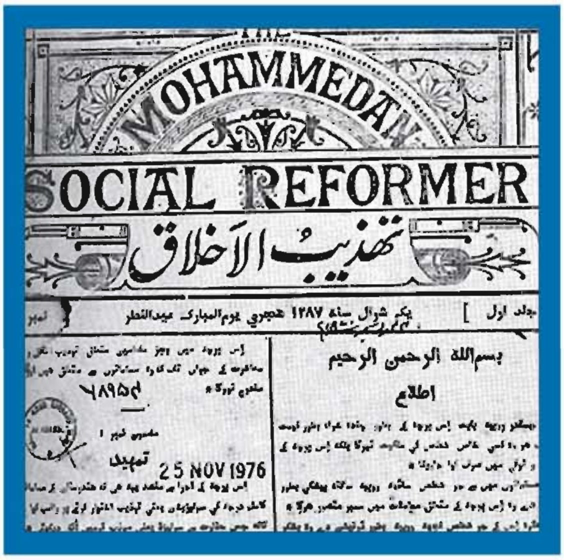
MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق
جلد اول
یکم شوال سنہ ۱۲۸۷ ہجری یوم المبارک عیدالفطر
بسم الله الرحمن الرحيم
اطلاع
تمہید
25 NOV 1976

(ڈاکٹر افضل الدین اقبال: ریاست حیدرآباد میں اُردو صحافت کا آغاز وارتقا ص: 200)

آصف جاہ ثالث کے دور میں ریاست حیدرآباد ایک نام نہاد خودمختار ریاست بن کر رہ گئی تھی جہاں پر ایک بادشاہ کا کردار محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ دکن میں صحافتی آزادی تو دور انگریز آزادی رائے سے بھی خائف تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گھبراہٹ کی دو بڑی وجوہات تھیں اول یہ کہ شمالی ہند میں صحافت نے ہی عوام کو انگریزوں کے خلاف نبرد آزما کر دیا تھا اور اب انگریز ایسی کسی بھی صورت کے لیے تیار نہیں تھے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی آصفیہ حکومت کو اظہارِ آزادی دینے کے سخت خلاف تھی۔ دکن میں آصفیہ سلطنت کمزور تھی جبکہ یہاں پر جاگیردارانہ نظام مضبوط تھا۔ مگر اس کے باوجود غدر کے تین سال بعد یہاں صحافت کی ابتدا ہوئی۔ محمد اعجاز الدین حامد نے اپنی کتاب 'حیدر آباد دکن کے اردو اخبارات' میں 'آفتاب ہند' کو دکن کا پہلا اردو اخبار قرار دیا:

"مملکت آصفیہ حیدرآباد دکن کے صدر مقام حیدرآباد کے قریب سکندرآباد سے اخبار' آفتابِ ہند' شائع ہونا شروع ہوا۔ اس اخبار کے مالک قاضی محمد قطب تھے۔ جسے انھوں نے 1860 سے جاری کیا تھا۔"

شمالی ہند کے مقابلے دکن میں صحافت کی ابتدا دیر سے ہوئی اور اس کی ترقی کی رفتار شمالی ہند کے بہ نسبت کم ہی تھی۔ دوسری جانب شمالی ہند میں سر سید احمد خاں نے اردو صحافت کو کمربستہ کرنے کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں۔

شمالی ہند کی دم توڑتی اردو صحافت میں سرسید احمد خاں نے نئی جان پھونکی۔ سرسید کی کاوشوں اور محنت نے اردو صحافت کو پھر سے زندہ جاوید بنا دیا جس کے جانبر ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ سرسید احمد خاں کی ہی کوششوں سے اردو صحافت دوبارہ کمربستہ ہوئی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئی۔ سرسید احمد خاں نے غدر کے بعد کئی بے قصور مسلمانوں کو سزاؤں سے بچایا، مسلمانوں کے تئیں انگریزوں کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کامیاب کوششیں کیں، مسلمانوں کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے کتابیں لکھیں، اخبارات شائع کیے اور مصلحت کی بنیاد پر انگریزوں سے قربت بڑھائی۔ اس قربت نے اس وقت کے بعض مسلم حلقوں میں غم وغصے کو ہوا دی۔ سرسید پر کفر کے فتوے جاری کیے گئے اور ان پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ مگر سرسید قوم کی ترقی اور بقا کے لیے ڈٹے رہے۔ 30 مارچ 1866 کے دن سرسید نے اپنا پہلا اخبار سائنٹفک

سوسائٹی شائع کیا۔ ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

سائنٹفک گزٹ میں ایک کالم اردو میں ہوتا اور دوسرا انگریزی میں تاکہ مسلمان اور انگریز بیک وقت ان مسائل سے آگاہ ہوسکیں جو ان کے پیش نظر تھے۔ اس رسالے کے ذریعے سرسید نے مسلمانوں کی آواز کو حکمراں طبقے تک پہنچانے کی کوشش کی تھی اور پھر اپنے اصلاحی خیالات کی ترویج و اشاعت کے لیے سرسید نے اپنا مشہور رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ اس رسالے کا مقصد 1857 کی تباہ حال قوم کو سماجی، اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے دوبارہ زندگی بخشنا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقاء اس رسالے میں روزمرہ کے اہم مسائل پر بڑے سلجھے ہوئے اور عالمانہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس رسالے نے 1857 کی بغاوت کے بعد مسلمانوں کی بازآبادکاری میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔'' (ڈاکٹر محمد علی اثر علی گڑھ تحریک)

سرسید احمد خاں نے مسلم قوم کی زبوں حالی اور جدید تعلیم سے مسلمانوں کو واقف کروانے کے لیے اردو صحافت کا سہارا لیا۔ اخبار سائنٹفک گزٹ انگریزی اور اردو میں مواد شائع کرتا جس کا اہم مقصد مسلمانوں میں تعلیمی رغبت کو بڑھانا، دنیا میں ہو رہی تبدیلیوں سے مسلمانوں کو واقف کروانا اور انھیں جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلم معاشرے میں اردو داستانیں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں اور ان داستانوں میں مافوق الفطری عناصر کی بھرمار ہوتی تھی۔ جہاں مغرب نے ہوائی جہاز کی ایجاد کرلی تھی وہیں شمالی ہند میں پڑھی جانے والی اردو داستانوں میں ہوا میں اُڑنے والی قالین اردو قارئین کو مدہوش کرنے کے لیے کافی تھے۔ سرسید احمد خاں نے اپنے اخبار 'سائنٹفک گزٹ' میں اردو اور انگریزی مواد کے ذریعے مسلمانوں کو خواب غفلت اور خیالی زندگی سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی۔ اخبار اور رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں ایک جانب مسلمانوں کو جدید تعلیم اور انگریزی زبان کی اہمیت سمجھائی گئی تو دوسری جانب انگریزوں کو مسلمانوں کی زبوں حالی اور قوم کی وفاداری کے واقعات سے انگریزوں کو واقف کروایا گیا۔ سرسید احمد خاں نے انگریزی زبان کی اہمیت پر زور دیا اور قوم کی ترقی کے لیے انگریزی زبان کو ناگزیر قرار دیا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود رقمطراز ہیں:

''اخبار تو قوم نے ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن رسالے کی شدید مخالفت ہوئی۔ اخبار کی وجہ سے سرسید رہنما اور مصلح قوم قرار پائے لیکن رسالے کی وجہ سے کافر، ملحد، نیچری اور کرسٹان کہلائے۔''

(اردو صحافت انیسویں صدی میں ڈاکٹر طاہر مسعود ص410)

اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے سے قبل سرسید احمد خاں نے اپنی ذمے داری پوری طرح نبھا دی تھی۔ نورالحسن نقوی کے مطابق سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں انگریزی سرکار کی غلط پالیسی کو بغاوت کا پیش خیمہ قرار دیا جبکہ ایک اور کتاب 'لائل محمڈن آف انڈیا' سے یہ بات ثابت کی کہ مسلمان انگریز سرکار کے بدخواہ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال کے مطابق کتاب 'اسباب بغاوت ہند' کے کچھ نسخوں کو انگلستان بھیجا گیا اور 1873 میں اس کا بہتر اور مکمل ترجمہ برطانوی پارلیمان کے سامنے پیش ہوا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں آصفیہ مملکت نے اردو صحافت پر اپنی فراخدلی دکھائی۔ حضور نظام آصف جاہ سابع نے اردو اخبارات کی ترقی و ترویج کے لیے مالی امداد فراہم کی۔ ''اعلی حضرت حضور نور میر عثمان علی خاں بہادر بند گان عالی اخبارات و رسائل سے ذاتی و خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ بیسیوں اخبارات کی آپ نے سرکاری خزانے کے ذریعے اپنے دست خاص سے مالی مدد کی اور دوسری طرف اخبارات و رسائل کی اشاعت کے سلسلے میں سرکار کی جانب سے دیے جانے والے اجازت نامے کے جملہ طریقوں کو نہایت سہل اور سادہ انداز میں مروج کیا تاکہ ایک معمولی سی حیثیت رکھنے والا عام آدمی بھی اخبار شائع کر کے اپنے شوق کو پورا کرسکے۔''

سرسید احمد خاں کی ان کوششوں سے اردو صحافت پر مثبت اثر پڑا۔ اسی کا اثر تھا کہ 1880 میں پریس ایکٹ کی تنسیخ کردی گئی۔ ڈاکٹر طاہر مسعود لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے 1880 میں برطانیہ میں لبرل پارٹی برسر اقتدار آگئی اور گلیڈ اسٹون جنھوں نے ورنیکولر پریس ایکٹ کی مذمت کی تھی، وزیراعظم بن گئے۔ وائسرائے لارڈ رپن کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس ایکٹ کو منسوخ کردے۔ چنانچہ 7 دسمبر 1881 کو منسوخی کا بل بغیر کسی بحث و تمحیص کے منظور کر لیا گیا۔ ورنیکولر پریس ایکٹ کے خاتمے کے بعد صحافت ایک بار پھر زندہ ہوگئی''

(انیسویں صدی میں اردو صحافت ڈاکٹر طاہر مسعود ص465)

ورنیکولر پریس ایکٹ کا مقصد اخبارات پر کنٹرول کرنا تھا۔ انگریزی سرکار کے خلاف لکھے گئے باغیانہ مضامین کی نشاندہی کرنا اور ان کے ایڈیٹرس کو سخت سزا دینا اس ایکٹ کے تحت ممکن تھا۔ مگر اس ایکٹ کی منسوخی کے بعد خاص کر اردو صحافت کی آزادی میں اضافہ ہوا۔ دوسری جانب سرسید احمد خاں کی کوششوں سے اردو صحافت میں سائنسی، معلوماتی، اور دلچسپ مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ اس کے علاوہ اردو صحافت میں سیاسی تبصرے بھی انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو صحافت نے کئی سیاسی مسائل کو اُجاگر کیا اور اپنی ذمے داریوں کو بخوبی نبھایا۔ بھارت چھوڑو تحریک، ستیہ گرہ کے علاوہ گاندھیائی دور میں اردو صحافت نے بیباکی سے لکھا۔ جہاں ایک طرف شمالی ہند میں اردو صحافت ایک بار پھر ہر میدان میں اپنی ذمے داریاں بخوبی نبھا رہی تھی تو دوسری جانب جنوبی ہند میں بھی اردو صحافت میں نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں آصفیہ مملکت نے اردو صحافت پر اپنی فراخدلی دکھائی۔ حضور نظام آصف جاہ سابع نے اردو اخبارات کی ترقی و ترویج کے لیے مالی امداد فراہم کی۔

''اعلی حضرت حضور نور میر عثمان علی خاں بہادر بندگان عالی اخبارات و رسائل سے ذاتی و خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ بیسیوں اخبارات کی آپ نے سرکاری خزانے کے ذریعے اپنے دست خاص سے مالی مدد کی اور دوسری طرف اخبارات و رسائل کی اشاعت کے سلسلے میں سرکار کی جانب سے دیے جانے والے اجازت نامے کے جملہ طریقوں کو نہایت سہل اور سادہ انداز میں مروج کیا تاکہ ایک معمولی سی حیثیت رکھنے والا عام آدمی بھی اخبار شائع کر کے اپنے شوق کو پورا کرسکے۔''

(محمد اعجاز الدین حامد حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات۔ از ابتدا تا 1947 ایک جائزہ، ص17)

نظام آصف جاہ سابع نے نہ صرف اردو اخبارات و رسائل کی مالی مدد کی بلکہ صحافت کی زبان میں نئی تبدیلیاں کی۔ حضور نظام کا مقصد رعایا کو دنیا کی تیز رفتار ترقی اور ریاست کی تعلیمی پالیسی کے بارے میں واقف کروانا تھا اور یہ تب ہی ممکن تھا جب صحافت میں آسان و سہل زبان کا استعمال کیا جاتا۔ آصف جاہ سابع کی ان کوششوں نے دکن اور خاص کر حیدرآباد میں اردو صحافت کی دنیا میں ایک نئی روح پھونکی، جس کے دیرپا نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

■

Abdul Mogni Siddiqui, Ph.D Research Scholar (Urdu), Hyderabad Central University - 500046 (AP)

محمد اکبر

راشد الخیری کی صحافتی خدمات

راشد الخیری کا تعلق ایک علمی اور مذہبی خانوادے سے تھا۔ اس لیے مذہبی کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہونا لازمی تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت میں ان کے دادا عبدالقادر کا خاص رول رہا ہے۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے ان کا دل اسکول سے اچاٹ ہوگیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد راشد الخیری کے دادا بھی اس دنیا سے چل بسے۔ چنانچہ راشد الخیری باپ دادا کی شفقت سے محروم ہونے کے بعد اپنے چچا ڈپٹی کلکٹر کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔ اس وقت وہ اناؤ میں تھے۔ راشد الخیری نے اسکول جانا بند کردیا اور نویں جماعت ہی میں تعلیم چھوڑ دی اور سارا دن کھیل تماشوں میں گزارنے لگے۔ اتفاق سے ان کے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد چند دنوں بعد حیدرآباد دکن سے آئے تو ان کی دادی نے کہا:

''ابی میاں نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے میں تمھارے سپرد کرتی ہوں، انھیں پڑھاؤ، داماد نے دریافت کیا، کیا پڑھاؤں ساس نے کہا حدیثیں پڑھاؤ، قرآن شریف کا ترجمہ پڑھاؤ تاکہ یہ اپنے دادا کی طرح مولوی بنے، قرآن اچھا پڑھتا ہے آواز بھی اچھی ہے اپنے باپ کی طرح وہ حافظ ہے اسے قاری بناؤ مولوی بنے یا قاری کچھ تو بناؤ باپ دادا کے نام کا بٹہ تو نہ لگے۔''

(سوانح عمری علامہ راشد الخیری، عصمت جولائی اگست 1964 ص 71,72)

دادی کی فرمائش پر ان کے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد کی نگرانی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ علمی اور ادبی زندگی میں اس وقت نیا موڑ آیا جب نذیر احمد کی تشویق پر وہ لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہوئے۔ نذیر احمد کی زیر نگرانی چند دنوں کی تعلیم وتربیت نے راشد الخیری کے اندر پوشیدہ تخلیقی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ انھوں نے اردو، انگریزی اور فارسی کی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا، جس کی وجہ سے ان کی علمی اور تخلیقی صلاحیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ان کے علمی اور ادبی ذوق کو مزید جلا بخشنے میں ان کے پھوپھی زاد بھائی مولوی اشرف حسین کی صحبت نے اہم رول ادا کیا ہے۔ راشد الخیری کا مطالعہ بہت وسیع اور مشاہدہ بہت تیز تھا اور حافظہ بھی اللہ نے غضب کا عطا کیا تھا، جو چیز ایک بار پڑھ لیتے وہ کبھی ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالراشد میں ہم کو اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ترقی کا مادہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے۔ غرض مولوی عبدالراشد نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کررہے ہیں وہ ان کے فطری خیال ہیں۔ ان میں خداداد مادہ تھا کہ انھوں نے انگریزی سیکھی۔ انھوں نے جو کچھ سیکھا اپنے سے سیکھا۔ اس نسل میں، میں انھیں ان کے خیالات اور سلف اسٹڈی کے لحاظ سے سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔''

(ایضاً، ص 78)

راشد الخیری کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے ناول 'حیات صالحات' سے ہوتا ہے جو 1997 میں پہلی بار شائع ہوا حالانکہ اس سے پہلے بھی انھوں نے ایک نامکمل عشقیہ ناول 'احسن میمونہ' لکھا تھا مگر اپنے پھوپھا کی ناراضگی کی وجہ سے اس ناول کے تمام مسودات کو نذر آتش کردیا۔ اس سلسلے میں راشد الخیری لکھتے ہیں کہ:

''سب سے پہلے میں نے ایک فضول قصہ 'احسن میمونہ' لکھا تھا جو بریلی کے ایک اخبار میں چھپا تھا، بڑے پھوپھا ابا کو معلوم ہوا تو بہت خفا ہوئے اور کہا ایسے لغو قصے لکھتے ہو جیسی کتابیں میں لکھتا ہوں ایسی کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے مراۃ العروس، توبۃ النصوح کا مطالعہ کیا تو خیال پیدا ہوا ایسی کتابیں لکھنی کون سی بڑی بات ہے میں لکھ سکتا ہوں چنانچہ صالحات شروع کردی۔ جب انھوں نے صالحات دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔'' (ایضاً، ص 99)

ڈپٹی نذیر احمد صالحات کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں:

''اپنی کتابوں کے علاوہ قصص میں یہ پہلی کتاب ہے جو میں نے شروع سے آخیر تک پڑھی ہے اگر مجھ کو یقین کامل نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ صالحات میری لکھی ہوئی ہے اور یہ مسودہ چوری گیا۔'' (ایضاً، ص 99)

راشد الخیری کے دوسرے استاذ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی صالحات کی تصنیف پر حوصلہ افزائی کی تھی۔ راشد الخیری نے دوسری کتاب 'منازل السائرہ' لکھی جو ایک شاہکار تصنیف کہلائی۔ اس ناول کے سبب مولانا کو اردو میں چارلس ڈکنز کے نام سے یاد کیا گیا۔ ان کی شہرت کا آفتاب بلندیوں پر پہنچ گیا اور ایک معروف ادیب کی حیثیت سے ان کا شمار کیا جانے لگا۔ اخبارات نے حوصلہ افزا کلمات شائع کیے۔ مولانا حسرت موہانی، مولوی بہادر علی، سید کرامت حسین جج ہائی کورٹ اور شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن نے تعریفی خطوط بھیجے۔ ڈپٹی نذیر احمد اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''مجھے امید ہے میرا بھتیجہ میرا نام میرے بعد قائم رکھے گا۔''

راشدالخیری کی ادبی حیثیت اب مستحکم ہوچکی تھی۔ علمی وادبی حلقوں میں ممتاز ادیب کی حیثیت سے ان کا شمار کیا جانے لگا تھا۔ رسائل کے اڈیٹران سے تقاضے کرکر کے مضمون حاصل کرنے لگے تھے۔ شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن لاہور اور شیخ محمد اکرام سے علامہ کے دوستانہ مراسم تھے۔ 1903 ہی سے راشدالخیری کی تخلیقات مخزن میں شائع ہونے لگی تھیں۔ 1907 میں شیخ عبدالقادر رسالہ مخزن کو لاہور سے دہلی لے آئے تو راشدالخیری سے روابط اور گہرے ہوگئے۔ شیخ عبدالقادر مولانا کی تحریروں سے متاثر تھے۔ مولانا محمد عبدالراشد کے نام سے اس رسالے میں دلچسپ قصے اور ادبی مضامین لکھنے شروع کیے اور اپنی ادبی شہرت اور عظمت اس حد تک مسلم کرلی کہ شیخ عبدالقادر کے شریک کار ہوگئے۔ ڈیڑھ دوسال مخزن کو ایڈٹ بھی کیا۔ آپ کی صلاحیت پر ایڈیٹر مخزن کو اتنا بھروسہ ہوگیا کہ جب وہ ولایت جانے لگے تو مخزن کا سارا کام راشدالخیری کے ذمے کر گئے، مولانا نے بھی اس انہماک کے ساتھ کام کیا کہ مخزن کی شہرت کو چار چاند لگایا۔ چونکہ راشدالخیری سرکاری ملازم تھے جس کی وجہ سے وہ خود رسالہ نہیں نکال سکتے تھے، مگر ان کے مضامین کو پڑھ کر بعض عورتوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر مخزن سے الگ ایک رسالہ نکالا جائے تو عورتوں کے جذبات اور ان کی ضروریات کو بہتر انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا 1908 میں شیخ محمد اکرام جو مخزن کا پورا کام سنبھالتے تھے ان کی نگرانی میں عصمت کا پہلا پرچہ شائع ہوا تو اس کی ذمے داری میں راشدالخیری شریک کار رہے۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے مسز محمد اکرام کا نام شائع ہوا۔ پہلا پرچہ دیکھ کر ہی تعلیم یافتہ خواتین اس کی گرویدہ ہوگئیں، پہلے ہی سال میں 'عصمت' کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو اس سے پہلے کسی زنانہ پرچے کو میسر نہ ہوئی تھی۔ عصمت کو جاری کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ عورتوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کیا جائے۔ کیونکہ اس زمانے میں خواتین مضمون نگاری بہت کم تھی۔ جدید تعلیم بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور اخبار ورسائل کا مطالعہ کرنے والے گھرانے بڑے بڑے شہروں میں بھی بہت تھوڑے تھے۔ جن خاندانوں میں تعلیم کا تھوڑا بہت چرچا تھا ان میں بھی ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو اخبارات اور رسائل کا لڑکیوں کی نظر سے گزرنا درست نہ سمجھتے تھے۔ اخبارات اور رسائل میں عورتوں کا نام شائع ہونا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم، اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں پر دو چار لوگوں کے مضامین شائع ہورہے تھے۔ مگر قوم کی طرف سے ان پر پھبتیاں اڑائی جاتیں اور فقرے کسے جاتے یہاں تک کہ ان کو گالیاں دینے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ ایسی حالت میں کس کی شامت آئی تھی جو ہمت کرتا۔ مگر راشدالخیری نے اپنے مخصوص رنگ میں بڑے موثر مضامین تحریر فرمائے، وہیں نہایت عام فہم زبان میں خانہ داری، بچوں کی پرورش، حفظان صحت وغیرہ پر چھوٹے چھوٹے مضامین عورتوں کے فرضی ناموں سے بھی لکھے تاکہ عورتوں میں مضمون نگاری کا رجحان پیدا ہو۔ عصمت کی اشاعت کا ابھی دوسرا سال ختم بھی نہ ہوا تھا کہ شیخ عبدالقادر نے 1909 میں مخزن کو پھر لاہور لے جانے کا فیصلہ کیا اور شیخ محمد اکرام جو عصمت کی دیکھ بھال کررہے تھے بیرسٹری کے لیے لندن جانے کی تیاری کرنے لگے تو عصمت کا جاری رہنا ناممکن ہوگیا تو راشدالخیری نے اپنی نوکری کو عصمت پر قربان کردیا۔ پھر عصمت میں ایڈیٹر کی حیثیت سے علامہ کا

مولانا اشرف گورگانی مرحوم　قاری سرفراز حسین مرحوم　مولوی اشرف حسین مرحوم　علامہ راشدالخیری

نام شائع ہونے لگا۔ کئی نازک مراحل بھی آئے۔ مالی بحران کا شکار بھی ہوئے۔ آبائی مکان بھی اس کی نذر ہوا لیکن اپنے مشن اور مقصد کے لیے عصمت کو جاری رکھا۔

راشدالخیری کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا یعنی مسلم خواتین کی اصلاح، چنانچہ انھوں نے اپنے رسالے عصمت کے ذریعے معاشرتی خرابیوں کی اصلاح، تعلیم نسواں کی حمایت، عورتوں کے اندر سلیقہ شعاری، ہنرمندی، نیز عورتوں کو ان کے فرائض کا احساس دلایا، اس کے لیے ایسے موثر اور سبق آموز افسانے اور مضامین لکھے کہ گھریلو عورتوں میں انقلاب برپا کردیا۔ عصمت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شادی شدہ عورتوں اور کنواری لڑکیوں کے لیے کتابیں شائع کی جائیں اس میں عصمت کو کافی کامیابی ملی۔ اس سلسلے میں راشدالخیری نے 1909 کے رسالے میں ایک اشتہار دیا جو اس طرح سے تھا:

''خواتین کے واسطے عصمت میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح اور بہبودی ملحوظ ہے۔ کنواری لڑکیوں کو عصمت بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب، بہن بھائیوں کی خدمت، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انھیں کیا تیاری کرنی ہے جو دقتیں ان کو پیش آئیں گی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے، ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہیے، بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری، گھر کے حساب کتاب اور بچوں کی پرورش میں عصمت سے مدد ملے گی عصمت انھیں بتائے گا جس آمدنی کو بے غل وغش خرچ کررہی ہیں ان کو کس محنت ومشقت سے پیدا کی گئی ہے، جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کردیے ہیں، ان کی ذمے داریاں ان پر کیا ہیں، عصمت انھیں بتائے گا کہ انھیں گھر کس طرح کرنا ہے، روپیہ کا مصرف کیا ہے اور خاندان کے ساتھ کس طرح بسر کرنی ہے۔''

(عصمت راشدالخیری نمبر، جولائی اگست 1936ص 11,12)

عصمت کے خریداروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ عصمت کی جو روش شروع میں تھی اس میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا اس کے مقاصد ہر پرچے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عورتوں کے کیا فرائض ہیں وہ کس طرح اپنی زندگی کو خوشگوار بناسکتی ہیں بہ حیثیت بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کیا کیا ذمے داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں۔ بچوں کی پرورش میں مشورے، روپیہ کے خرچ میں ہدایتیں غرض یہ کہ مختلف حیثیتوں میں عورت کے فرائض پر ہر رسالے میں کافی تعداد میں مضامین ملتے ہیں۔ راشدالخیری نے عصمت کے ذریعے نہ صرف خواتین کو ان کے فرائض کی طرف متوجہ کیا بلکہ مردوں کو بھی ان کے فرائض کو یاد دلایا۔ حقوق نسواں کے متعلق علامہ نے کافی مضامین لکھے ہیں مغرب کی کورانہ تقلید کی عصمت نے ہمیشہ مخالفت کی اور اس کے ساتھ ہی اسلامی روایات کو زندہ رکھنے پر زور دیا انھیں اصولوں پر عصمت نے ترقی نسواں اور بیداریِ نسواں کی کوشش کی۔ راشدالخیری کی صحافتی زندگی کے آغاز کا بنیادی مقصد ہی اصلاح نسواں، فرائض نسواں اور حقوق نسواں جیسے نصب العین کا حصول تھا۔

گویا راشدالخیری نے عصمت کے ذریعے عورتوں میں زندگی کی روح پھونک دی وہ نہ صرف اپنے فرائض کو سمجھنے لگیں بلکہ ان کو اپنے حقوق کا احساس ہوگیا اور وہ مضامین بھی لکھنے لگیں۔

راشدالخیری کے مزاج میں، لاابالی پن تھا۔ انھیں اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کتنے عظیم المرتبت مصنف بن گئے ہیں لوگ ان کے مضامین اور کتابیں پڑھنے کے لیے چشم براہ رہتے

تھے مگر وہ سب سے بے پرواہ صرف اس وقت لکھتے تھے جب ان کا جی چاہتا تھا۔ عصمت کے سلسلے میں ملا واحدی لکھتے ہیں:

’’ایسا آدمی کاروبار نہیں کرسکتا۔ تاہم عصمت کو مولانا نے کسی نہ کسی طرح گھسیٹا۔ رسالہ عصمت مولانا کا کاروبار نہ تھا۔ ایک لگن تھی جو مولانا سے خدمت کرا رہی تھی، لگن نہ ہوتی تو اس زمانہ میں عصمت کی قسم کا رسالہ نکالنا ویسے بھی کھیل نہ تھا۔ زنانہ رسالے نکالنے والوں کو خطرناک دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حقوق نسواں کی حمایت میں مولانا کو توقتل تک کی دھمکی دی گئی۔ اخبار رسالے زنان خانوں میں گھس نہیں سکتے تھے۔ کسی لڑکی کا نام چھپا ہوا نظر آجاتا تو ناک بھنویں چڑھ جاتی تھیں۔ اس لگن کی خاطر مولانا نے سارا زیور ختم کیا۔ دو مکان بیچے... وہ لگن تھی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت۔ عورتوں کو اس قابل کردینا کہ مرد انھیں اپنا سا انسان سمجھیں۔‘‘ (ایضاً ص195)

عصمت بہت آب و تاب سے جاری ہوا تھا۔ مضامین کے اعتبار سے تو بہترین ادبی رسالہ تھا ہی گھریلو مضامین کے لحاظ سے بھی بہت کامیاب تھا۔ معرکتہ الآرا مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ غرض عصمت کا شمار ہندوستان کے بہترین باتصویر رسالوں میں ہوتا تھا۔ اس کے متعلق راشد الخیری نے تحریر فرمایا:

’’میں نے جس وقت عصمت رازق میاں کے سپرد کیا تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اپنی آنکھوں سے عصمت کو اس قدر کامیاب دیکھ سکوں گا کہ اس کی اشاعت ہندوستان کے کسی زنانہ پرچہ سے کم نہ ہوگی اور ملک کے بہترین اہل قلم اس کی نامہ نگاری میں مصروف ہوں گے اور پیچیدہ سے پیچیدہ زنانہ مسئلہ عصمت کے ذریعے سے طے ہوگا۔ 1929 عصمت کا نہایت کامیاب سال ہے اس لیے نہیں کہ ہر مہینہ کا پرچہ پابندی وقت سے ٹھیک 30 تاریخ کو شائع ہوا بلکہ اس لحاظ سے کہ باوجود مالی ترقی کے یہ مواقع موجود ہونے کے بعض اشتہارات کی توقع سے بہت زیادہ اجرت پیش کی گئی اور یہ نہ ہوا کہ سرکاری اشتہارات اس میں شائع ہوسکیں عصمت نے نہایت استقلال سے کام لیا اور ان اشتہارات سے پرہیز کیا جو خواتین کے واسطے کچھ مفید نہیں ہیں۔۔۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی کہ بھرتی کے مضامین سے اس کے اوراق پاک رہے۔‘‘

(سوانح عمری علامہ راشد الخیری، عصمت جولائی اگست 1964 ص232,233)

اشتہارات سے اخبارات و رسائل کو بہت معقول مدد ملتی ہے۔ اور بعض پرچوں کی آمدنی تو مستقل خریداروں کے چندہ سے اتنی نہیں ہوتی جتنی اشتہارات کی اجرت سے، عصمت کا ہمیشہ یہ اصول رہا کہ خواہ کتنی ہی زیادہ اجرت پیش کی جائے اگر وہ عصمت کے معیار پر پورا نہیں اترتا تو اسے قبول نہیں کیا جاتا اور کسی صورت میں شائع نہیں کیا جاتا عصمت دن بہ دن ترقی کرتا جارہا تھا اس کے مضمون نگاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ عصمت نے کئی درجن لکھنے والیاں پیدا کیں جنھوں نے مختلف موضوع پر دلچسپ مضامین کافی تعداد میں شائع کرائے۔ راشد الخیری نے لڑکیوں کو لکھنے کی ترغیب دینے اور ان میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لیے جو کوشش کی وہ یقیناً کبھی فراموش نہ کی جاسکے گی۔ چھوٹے چھوٹے مضامین بہت آسان زبان میں مسلسل کئی سال تک فرضی زنانہ ناموں سے صرف اس لیے لکھے کہ انھیں پڑھ پڑھ کر لڑکیاں لکھنے کی کوشش کریں۔ علامہ چاہتے تھے کہ عورتیں زیور تعلیم سے آراستہ ہوں تاکہ ان کے اندر مذہب اور معاشرت کا شعور پیدا ہوسکے۔ وہ اپنی ذمے داریوں اور فرائض سے آگاہ ہوسکیں اور اپنے حقوق کے تئیں بیدار رہیں اور اسلام نے عورتوں کا جو مرتبہ مقرر کیا ہے وہ انھیں حاصل ہو۔

راشدالخیری نے 1911 میں تمدن نامی رسالہ جاری کیا۔ جس میں خواتین کے حقوق کی حمایت میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حقوق نسواں اور آزادی نسواں کی حمایت کے لیے یہ رسالہ زیادہ موزوں ہے۔ اسی لیے راشدالخیری نے تمدن کا اجرا فرمایا۔ اپریل 1911 میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا اس کے معیار کو دیکھ کر ادبی حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا گیا کہ مخزن کے لاہور جانے سے جو خلا پیدا ہوگیا تھا ’تمدن‘ اس کی تلافی کردے گا۔ ’تمدن‘ نے پہلے ہی سال میں ملک کے مایہ ناز اہل قلم کی اعانت حاصل کرلی تھی۔

راشد الخیری نے 1911 میں تمدن نامی رسالہ جاری کیا۔ جس میں خواتین کے حقوق کی حمایت میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حقوق نسواں اور آزادی نسواں کی حمایت کے لیے یہ رسالہ زیادہ موزوں ہے۔ اسی لیے راشد الخیری نے تمدن کا اجرا فرمایا۔ اپریل 1911 میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا اس کے معیار کو دیکھ کر ادبی حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا گیا کہ مخزن کے لاہور جانے سے جو خلا پیدا ہوگیا تھا ’تمدن‘ اس کی تلافی کردے گا۔ ’تمدن‘ نے پہلے ہی سال میں ملک کے مایہ ناز اہل قلم کی اعانت حاصل کرلی تھی جن میں مولوی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولوی سید احمد، احمد علی شوق قدوائی، مولانا شاد عظیم آبادی، اشرف حسین حکیم ناصر، ڈاکٹر مشرف الحق، سید رؤف علی، مولانا طباطبائی اور شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی جیسے باکمال لوگ مستقل مضمون لکھتے رہے۔ ظاہر ہے جس پرچے کو ایسے ایسے باکمال مضمون نگار میسر ہوں اس کی کامیابی میں کسے شبہ ہوسکتا ہے۔ تمدن کی اشاعت پہلے ہی سال میں بارہ سو تک پہنچ گئی تھی جب کہ عصمت اس وقت نو سو چھپ رہا تھا۔ تمدن کا ادبی معیار کافی بلند تھا۔ لیکن صرف اس وجہ سے کہ تمدن نے اپنے سب سے بڑے مقصد حقوق نسواں پر مسلمان مردوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ جہاں تمدن کے بلند معیار اور علمی و ادبی مضامین کو سراہا گیا۔ وہیں تمدن کے قدردانوں کے دلوں میں یہ بات کھٹکتی رہی کہ تمدن ہماری حکومت کو کمزور کرنے کے لیے جاری کیا گیا اور ہمارے عیش و آرام میں خلل ڈالنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ خریداروں کی تعداد دوسرے ہی سال سے گھٹنی شروع ہوگئی۔ مالی مشکلات کا ہر ہر قدم پر سامنا رہا یہاں تک کہ 1912 میں پرچے کی اشاعت میں بے قاعدگی شروع ہوئی اور خریداروں کی تعداد میں اور بھی کمی ہونے لگی۔ حقوق نسواں کی حمایت میں چاروں طرف سے لعن طعن شروع ہوا مگر راشد الخیری ازل ہی سے مسلمان عورت کے غصب کردہ حقوق، حقیقی درد لے کر دنیا میں آئے تھے۔ بدتر سے بدتر الفاظ ان کی اس قوم نے جس پر وہ قربان تھے انھیں عطا کیا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنی دھن سے باز نہیں رہے اور ان کے استقلال اور استقامت میں فرق نہ آیا۔ ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

’’مگر کیا کیا جائے تمدن کی توقعات پوری نہ ہوئیں اور صرف اس وجہ سے کہ وہ حقوق نسواں کا مطالبہ کرتا ہے عزیز نہ ہوسکا، رفتار زمانہ متقاضی ہے کہ اب تمدن اس خیال کو دور کرے وقت کا ساتھ دے اور اپنے کام سے کام رکھے مگر معصوم بچیوں کی تصویر آنکھ کے سامنے ہے۔۔۔ جو میکے میں ناز و نعم سے پلیں اور سسرال پہنچتے بے دام کی غلام بن گئیں، سوکن کا جلاپا، ساس نندوں کے طعنے، شوہر کی حکومت، کس کس کا رونا رویا جائے، ایک نہیں سیکڑوں ہزاروں لڑکیاں ایسی موجود ہیں جن کے نازک دل شادی نے چھلنی کردیے، طرّہ یہ کہ اگر ایک مردانہ پرچہ حقوق نسواں کی آواز منہ سے نکالے تو لوگ اس کا گلا گھوٹنے کو تیار ہوجائیں۔ شہید مغرب کے نام سے جو مضمون لکھا گیا اس میں حقوق نسواں کے متعلق جو الفاظ اس قلم سے نکلے اور ان پر جو کچھ شورش ہورہی ہے اس کو دیکھ کر خدا کی شان یاد آتی ہے جس مذہب نے علی الاعلان یہ حکم دیا تھا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گی جیسا مردان کے ساتھ۔ آج اس کے پیرو ایسے شخص کو جو صرف ان حقوق کا

مطالبہ کرتا ہے جو شرع اسلام نے عطا کیے مار ڈالنے کی دھمکی دیتے ہیں۔"

(عصمت راشد الخیری نمبر، جولائی اگست 1936ص 16)

1915 میں تمدن کے خریداروں کی تعداد گھٹ کر ڈھائی سو تک رہ گئی تھی۔ ترقی کے مواقع اب بھی موجود تھے۔ صرف مولانا اس کی روش بدل دیتے تو تمدن پھر عصمت سے آگے نکل جاتا مگر انھوں نے یہ گوارہ نہ کیا کہ تمدن کی روش کو بدل دیں ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کر رہے تھے پھر بھی ان کے پایۂ ثبات میں کسی طرح کی لغزش نہیں آئی۔ اسی حالت میں تمدن نکل رہا تھا۔ نومبر 1915 کے عصمت میں راشد الخیری رقمطراز ہیں:

"تمدن پہلا مردانہ پرچہ تھا جس نے حقوق نسواں کی حمایت میں آواز بلند کی۔ اس وقت کوئی مردانہ پرچہ حقوق نسواں کا حامی قوم میں موجود نہ تھا اور مجھے یقین کامل ہے کہ آئندہ بھی دس بیس برس تک موجود نہ ہوگا۔ تمدن کا شائع ہونا تھا کہ مجھ پر چاروں طرف سے لعن طعن شروع ہوئی ہیں میں نے اپنی طرف سے منت سماجت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ رو رو کر کہا۔ گڑگڑا کر عرض کیا کہ بیٹیوں کے باپ بہنوں کے بھائی۔ ماؤں کے بیٹے۔ قوم کی بچیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھیں مگر حقوق نسواں کی حمایت میں ایسا گناہ کبیرہ تھا کہ میرا قصور معاف نہ ہوسکا۔ یہ میری غلطی ہی سہی کہ میں نے تمدن کے آخری سانس تک اپنی بدنصیب بہنوں کی ہمدردی نہ چھوڑی مگر مجھ کو چار برس میں چار شخصوں کے سوا ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو تمدن کے وجود کو ضروری سمجھتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت کی آمدنی تمدن پر صرف ہوئی وہ کافی نہ ہوئی تو جو کچھ میرے پاس رہ گیا تھا وہ بھی تمدن کی نذر ہو....... میں اپنی محترم بہنوں اور بچیوں سے التجا کرتا ہوں خواہ ان کو ایک خریدار بھی میسر نہ ہو مگر وہ حقوق نسواں کی حمایت میں ایک مردانہ پرچہ ضرور جاری رکھیں۔" (ایضاً ص 17)

مردوں نے عورتوں کے حقوق کے مطالبے کو پسند نہیں کیا اور تمدن کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا تو ان کے بچپن کے دوست قاری سرفراز حسین کے صاحبزادے عباس حسین نے ضد کی کہ تمدن انھیں دے دیا جائے جب قاری صاحب نے انھیں یقین دلایا کہ تمدن اپنے اصلی مقصد حقوق نسواں سے غافل نہ رہے گا تو راشد الخیری آمادہ ہوگئے۔ مروت راشد الخیری کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ دوسروں کی پاسداری اور لحاظ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کسی کی دل آزاری دیکھی نہ جاتی تھی۔ دوسروں کے فائدے کے سامنے اپنا نقصان تک بھول جاتے تھے۔ تمدن کی اشاعت لاکھ گر گئی تھی لیکن اس پر ہزاروں روپیہ لٹایا تھا خون جگر سے اسے سینچ رہے تھے اور بہت سی توقعات اس سے وابستہ تھیں اس کی علاحدگی معمولی بات نہ تھی۔ تمدن جولائی 1915 کے شمارہ میں لکھتے ہیں

"میں نے تمدن پر جس قدر محنت کی ہے میرا ہی دل جانتا ہے مشکل تھا کہ میں اس کو جدا کروں مگر بالک ہٹ میرے ارادوں پر غالب آگئی اور میاں عباس آج تمدن لیے لکھنؤ براج رہے ہیں۔ ناظرین تمدن سے مجھے امید ہے وہ عزیز عباس سلمۂ کو مجھ سے زیادہ مدد دیں گے تا کہ وہ زبان اردو اور حقوق نسواں کی معقول خدمت کے قابل ہو۔" (ایضاً ص 16)

راشد الخیری نے تمدن کو اپنے دوست قاری سرفراز حسین کے صاحبزادے قاری عباس حسین کو دینے کے بعد عصمت پر توجہ دینی شروع کی مگر ابھی رسالہ اپنی اصل شان پر نہ پہنچا تھا کہ 1915 میں لڑکیوں کے لیے ایک ہفتہ وار رسالے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے 'سہیلی' کا اجرا فرمایا سہیلی دھیرے دھیرے مقبول بھی ہو رہا تھا کہ 1916 میں دفتر عصمت میں آگ لگی جس کی وجہ سے پورا دفتر جل کر خاک ہو گیا پھر سہیلی جاری نہ رہ سکا۔ 1916 کی آتشزدگی سے عصمت کی اشاعت میں بھی خلل پڑا اور کاروباری لحاظ سے بہت نقصان ہوا۔ جیسا کہ رازق الخیری نے عصمت میں لکھا ہے:

"سہیلی بند ہوا۔ کتب خانہ ختم ہوا۔ اور بڑے بڑے قیمتی مسودے راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہ رہے۔ ادھر آتشزدگی نے ہوش اڑا دیے تھے اور ادھر جنگ عظیم کی وجہ سے کاغذ کی قیمت پر آگ پڑ رہی تھی۔ بڑے اچھے اچھے کامیاب پرچے کاغذ اور دوسرے سامان طباعت کی گرانی نے بیٹھا دیے تھے۔ ہندوستان ہی نہیں ولایت تک چیخ اٹھے تھے۔" (ایضاً ص 18)

1917 میں راشد الخیری نے تصانیف کا سلسلہ شروع کردیا، کتابوں کا بہت معقول معاوضہ لیتے تھے نصف درجن سے زیادہ کتابیں لکھ دیں ان کی جو آمدنی ہوئی اس کا ایک بڑا حصہ عصمت پر صرف کیا گیا پھر دھیرے دھیرے پرچہ کی اشاعت وقت پر آ گئی اور اشاعت میں بھی ترقی ہونے لگی 1917 کے آخیر تک عصمت پھر بارہ سو تک چھپنا شروع ہو گیا تھا۔

عصمت کا معیار بلند ہو چکا تھا اور اب وہ چھوٹی بچیوں کے مطلب کا پرچہ نہیں رہا تھا عصمت میں ویسے تو ہر موضوع کے مضامین کافی شائع ہوتے تھے۔ مگر مذہبی مضامین کی تعداد بہت کم تھی۔ بالآخر راشد الخیری نے یہ طے کیا کہ مسلمان بچیوں کے لیے ایک مذہبی رسالہ جاری کیا جائے جو تربیت گاہ کا پرچہ ہو۔ چنانچہ 1927 میں ماہنامہ بنات جاری کیا گیا اس کی ادارت اور انتظامات وغیرہ کا کام اپنے بیٹے رازق الخیری کے سپرد کیے تھے۔ اس رسالے کی حیثیت تربیت گاہ بنات کے آرگن کی تھی۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان بچیوں میں مذہبیت پیدا ہو اس میں بنات کو کافی کامیابی ملی۔ راشد الخیری ہر ماہ تین مستقل عنوانات احکام نسواں، قرآن مجید کے قصے، غلبہ رواج اور مذہبی تاریخ کے تحت مضامین تحریر فرماتے تھے اکتوبر 1935 میں راشد الخیری نے اس کی ادارت اپنے چھوٹے صاحب زادے صادق الخیری کے سپرد کردی۔ مولانا کے انتقال کے بعد بھی ان کے صاحبزادے نے اسے مالی خسارے کے باوجود ان کی یاد گار کے طور پر جاری رکھا۔

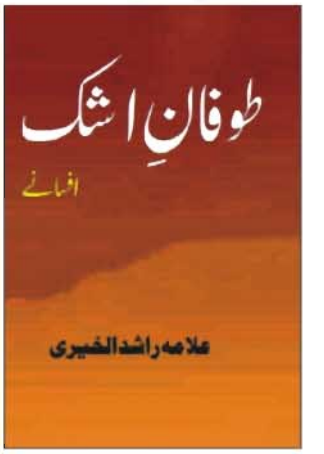

راشد الخیری نے 'جوہر نسواں' نامی رسالہ جاری کیا جس کا صرف ایک مقصد تھا کہ لڑکیوں کو سلیقہ شعار ہنر مند بنایا جائے اور ان میں دستکاری کا شوق پیدا کیا جائے۔ ستمبر 1934 میں جوہر نسواں کی پہلی اشاعت سے ہی دستکار خواتین میں اس کی دھوم مچ گئی انھوں نے محسوس کیا کہ ایسے رسالے کی ہندوستانی بیبیوں کو واقعی ضرورت تھی۔ رسالے کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی تھی کوئی دن ایسا نہیں تھا کہ اس کی تعریف میں خطوط نہ آتے ہوں۔

راشد الخیری اردو کے بڑے ادیب اور صاحب طرز مصنف تھے انھوں نے مستقل تصانیف کے علاوہ رسالوں کی ایڈیٹری سے بھی طبقہ نسواں اور اردو ادب و زبان کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ ان کی صحافت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ وہ مضمون نگاروں کی قلمی اعانت کے کبھی محتاج نہیں رہے ضرورت کے وقت ہر قسم کے مضامین رسالے کے لیے خود لکھتے تھے۔ جن عورتوں کو قلم پکڑنا بھی نہیں آتا تھا، راشد الخیری کی تحریروں نے انھیں اہل قلم بنا دیا۔

■

Dr.Mohd Akbar, Guest faculty Dept.of Urdu, Jamia Millia Islamia New Delhi 11002

محمد رضوان خان

تیرہویں صدی
ادب لطیف کا نمائندہ رسالہ

ادبِ لطیف ایک ایسا رویہ ہے جو اپنے ذہن وفکر کی توانائی اور خیالات کی بلند آہنگی کی بنا پر رجحان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ادب لطیف سے مراد ایسا ادب ہے جس میں خیالات کو لطیف بنا کر پیش کیا گیا ہو۔ جو اسلوب کی جدت، تراکیب کی شگفتگی اور الفاظ کی مینا کاری کے ساتھ خوب صورت طرز ادا اور حسن اظہار سے معمور ہو، جو ادب کو اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کسی بھی فکر و رجحان کی بہتر اشاعت وتبلیغ میں اخبار و رسائل کا اہم رول ہوا کرتا ہے۔ کیوں کہ ماہ نامے ہفتہ وار اور روز نامے، عوام اور خواص کی دل چسپی کا اہم مظہر ہوتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ رسائل وجرائد کے مدیران اگر خود صاحب قلم ہونے کے ساتھ فکری طور پر کسی مخصوص رجحان کے حامی ہوں تو پھر اس کی ترسیل کا کام آسان ہو جاتا ہے اور فکری ابلاغ میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ تیرہویں صدی (دہلی) دل گداز (لکھنؤ) مخزن (لاہور) صلائے عام (دہلی) نقاد (آگرہ) نیرنگِ خیال (لاہور) نگار (لکھنؤ، کراچی) اور ہمایوں (لاہور) کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ میر ناصر علی، عبدالحلیم شرر، سر عبدالقادر، دل گیر، حکیم یوسف حسن، نیاز فتح پوری، یلدرم، مہدی افادی، سلطان حیدر جوش اور میاں بشیر احمد نے اپنے رسائل کی مدد سے ادب لطیف کے فروغ میں اہم کردار انجام دیا۔ مذکورہ بالا رسائل کے مدیران کا اختصاص یہ ہے کہ ان کا شمار ادب لطیف کے اولین معماروں میں ہوتا ہے۔ بایں حال سرسید کی علی گڑھ تحریک اور ان کا تہذیب الاخلاق آب وتاب کے ساتھ فکری مشن پر چھایا ہوا تھا۔ ان حالات میں Compatative کے طور پر کام کرنا یقینا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ادب ونظریات کی ترویج واشاعت کے کئی دور گذرے ہیں اور ان میں ادبا وشعرا کو کئی پڑاؤ سر کرنے پڑے ہیں۔ یہ اپنے تشکیلی دور سے آج تک مختلف رجحانات، تحریکات، اسالیب اور نظریات کے سہارے ہم تک پہنچے ہیں۔ ایک دور تشکیلی ہے۔ اس میں کئی ادبی اور لسانی تحریکوں نے جنم لیا ہے۔ علی گڑھ تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق اور تحریک ادب اسلامی نے اپنے اپنے طور پر زبان اور اصنافِ ادب کے فروغ کے لیے راہیں ہموار کیں، تاہم ہنوز اردو زبان وادب نے تمام ارتقائی منازل طے نہیں کیے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ بات بھی خاطر نشان رہنی چاہیے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں ہی ہندوستانی معاشرت اور سیاست کا منظر نامہ تبدیل ہوتا نظر آ رہا تھا، کیوں کہ مغل حکومت کے زوال کے بعد ملک کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ لہٰذا انھوں نے تجارتی مقاصد کو بروئے کار لاتے ہوئے غاصبانہ ذہنیت کے ساتھ تقریباً ملک بھر میں قبضہ کر لیا۔ نتیجے کے طور پر مغربی افکار ونظریات کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع میسر آیا۔ اس کے ردِ عمل میں تین اہم فکری رجحانات وجود میں آئے۔ انیسویں صدی میں سید احمد بریلوی اور سرسید احمد خان، دیانند سرسوتی اور راجہ رام موہن رائے، لارڈ ولزلی اور ڈلہوزی کے افکار ونظریات ہندوستان کے منظرنامے پر مرتب ہوئے۔ چوں کہ سید احمد بریلوی نے مسلم قوم کے جذبۂ جہاد کو متحرک کیا، دیانند سرسوتی نے قدیم آریائی سماج کے احیا کی کوشش کی، جب کہ راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خان نے روشن مستقبل کے پیش نظر زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے اور جدید علوم وفنون کے حصول کی صلاح دی۔ سرسید احمد خان کی تحریک کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب پورا ملک غلامی، محکومی اور جمود وتعطل میں گھرا ہوا تھا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو علوم وفنون کے سہارے ترقی کے راستے بتائے اور مستقبل کی راہ ہموار کی۔ اس طور پر یہ مسلمانوں کے لیے ایک فکری اور عملی تحریک بھی تھی، جس نے دونوں اعتبار سے نشاۃِ ثانیہ کا اہم فریضہ انجام دیا۔ چونکہ مسلمان اس وقت سیاسی، معاشی اور فکری اعتبار سے زوال کا شکار ہو چکے تھے، لہٰذا سرسید احمد خان نے، جن کی ذات جدیدیت اور قدامت دونوں کے امتزاج سے عبارت تھی، مسلمانوں کے روشن مستقبل کے خاکے میں مغربی علوم سے رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ چوں کہ علی گڑھ تحریک کی محرک 1857 کی جنگ آزادی ہے، جس نے مسلمانوں کو بدتر حالت گذارنے پر مجبور کیا، ایسے میں علی گڑھ تحریک کے لیے ایک بڑا چیلنج تھا۔ چوں کہ مسلمان تعلیمی اور معاشی دونوں اعتبار سے محکوم ہو چکے تھے۔ علی گڑھ تحریک جن بنیادوں پر قائم تھی اس کا نصب العین، طریقۂ کار اور مقصد بالکل واضح تھا۔ اس کا سب سے فعال زاویۂ نظر ادبی تھا اور اس کے تحت نہ صرف اردو زبان کو وسعت ملی، بلکہ اردو ادب کے اسالیبِ بیان اور روحِ معانی بھی متاثر ہوئے۔ چوں کہ سرسید اور ان کے رفقا کا نظریہ ادب کے تعلق سے یہ تھا کہ ادب برائے زندگی ہو، یعنی ادب مقصد، اجتماعیت، ارضیت اور ضرورتِ حال کے مطابق ہو۔ ادب ہماری زندگی پر کچھ اس طرح اثر انداز ہو کہ ہمارے اخلاق وعادات واطوار، اور ہمارے ثقافتی، معاشرتی اور تہذیبی احوال کی اصلاح ہو۔ ادب کے ذریعے ہمارا ذوق پراگندہ نہ ہو، بلکہ ذوقِ سلیم پیدا ہو اور ادب سے انبساط کے ساتھ ذہنی آسودگی بھی میسر آئے۔ ان مقاصد کو ہم اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں: مقصدی، اخلاقی اور اجتماعی۔ مگر رفتہ رفتہ مقصدیت کا غلبہ اس حد تک بڑھ گیا کہ ادب کی لذت، چاشنی اور اس کا اثر جاتا رہا اور نتیجے

کے طور پر سپاٹ ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ یہ اثر بالکلیہ نثر و نظم دونوں پر پڑا۔ اس کے نتیجے میں یعنی ردِ عمل کے طور پر رومانی تحریک وجود میں آئی۔ رومانوی تحریک دراصل یورپ میں اٹھی تھی جس کا مقصد ادب برائے ادب تھا، ادب برائے زندگی نہ تھا۔ ادب کسی ایسے مقصد کے تحت نہیں لکھا جانا چاہیے جس کے نتیجے میں ادب کی حلاوت و لذت مغلوب ہو جائے بلکہ اسے ذہنی مسرت حاصل کرنے کے لیے تخلیق کیا جائے، جو کسی بھی طرح کے مقاصد سے ماورا ہو۔ نثری ادب پر رومانوی تحریک کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ اس کا زیادہ اثر تنقید پر پڑا اور وہ بھی تاثراتی تنقید پر، یعنی وہ ادب کی دوسری نثری اصناف پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ لہٰذا رومانوی تحریک کے ساتھ ہی ادبِ لطیف کا رجحان پروان چڑھا اور یہ رجحان بھی سرسید تحریک کے مقصدی اور افادی ادب کے غلبے کا ردِ عمل تھا۔ اور اس کے میر کارواں محمد حسین آزاد، میر ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر تھے۔ ان حضرات کا نظریہ تھا کہ جذبۂ تخیل کو دبانا انصاف بر مبنی عمل نہیں ہے، بلکہ اس جذبے کو راہ یاب کرنا چاہیے۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ علی گڑھ تحریک کی نثر خشک کلاسیکیت بر مبنی ہے، لہٰذا انھوں نے خشک کلاسیکی نثر کا طلسم توڑا اور ادب کی خارجی مادیت کا رخ داخل کی رومانیت سے مملو کر دیا۔ ادبِ لطیف کے رجحان سے جڑے مصنفین میں شرر کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اردو نظم کی جامد ہیئت کو توڑ کر نظم نگار کے خیالات کو ردیف و قافیے کی پابندی سے آزاد کیا اور نظم معریٰ کی داغ بیل ڈالی کیوں کہ شرر، سرسید کے پابند فکری اظہار سے ماورا ہو کر آزادروی اور جذبہ و خیال کی جوئے تیز کے ساتھ اپنے زاویۂ فکر کے اظہار کو ہی رومانی زاویہ تصور کرتے ہیں، لہٰذا ان کا ماننا ہے کہ شاعر کو اپنے جذبے اور اظہار خیال میں ردیف و قافیے کا اسیر نہیں ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے ہم دیکھیں تو شرر نے اپنی رومانیت پسندی کو نہ صرف اصناف نثر میں ظاہر کیا، بلکہ شاعری میں بھی برتنے کی کوشش کی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ادبِ لطیف کا یہ رجحان سرسید کی زندگی ہی میں رونما ہونے لگا تھا اور اس کا دائرہ کار محدود نہ تھا۔ وہ اس طور پر کہ محمد حسین آزاد نے لاہور سے، میر ناصر علی نے دہلی سے اور شرر نے لکھنؤ سے اپنے اپنے طور پر اس رجحان کی ترویج و اشاعت شروع کر دی۔ لہٰذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید تحریک کے ردِ عمل کے طور پر ادبِ لطیف کا رجحان پروان چڑھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس کا اثر ادب کی تمام اصناف پر، بطورِ خاص نثر پر پڑا۔ ادبِ لطیف نے 1935 تک اپنے اثرات قائم کیے اور ادب کی متعدد نثری اصناف پر لکھنے والے تیار ہو گئے۔ اس رجحان نے بھی جب مقصد کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا تو اس کے ایک طے شدہ منصوبے (جسے ترقی پسند تحریک اپنا منشور قرار دیتی ہے) اور اعلانیہ طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے ادب کو سماج کا ترجمان بنانے کی پر زور حمایت کی اور اس وقت کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے بحران کو ادب کا موضوع قرار دیا۔ گویا ادب برائے ادب کو ایک مرتبہ نئے منشور کے ساتھ ادب برائے زندگی سے وابستہ کر دیا گیا۔ لیکن یہ وابستگی ایک خاص سیاسی نظریے کی تشکیل آفریدہ تھی۔ لہٰذا 1960 کے آتے آتے جدیدیت کے نام پر ایک رجحان نمودار ہوا جس نے ترقی پسندیت کو اکھاڑ پھینکا۔ اس تمہیدی گفتگو کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ادبِ لطیف سے قبل تحریکوں اور رجحانات کا پس منظر ہمارے پیش نظر رہے کہ ادبِ لطیف کے فکری اور اسلوبیاتی رجحان کی وضاحت اپنے ماقبل اور ہم عصر فکری رویے کے ذکر کے بغیر بہتر طریقے سے شاید نہیں کی جاسکتی تھی۔

رومانوی تحریک دراصل یورپ میں اٹھی تھی جس کا مقصد ادب برائے ادب تھا، ادب برائے زندگی نہ تھا۔ ادب کسی ایسے مقصد کے تحت نہیں لکھا جانا چاہیے جس کے نتیجے میں ادب کی حلاوت و لذت مغلوب ہو جائے بلکہ اسے ذہنی مسرت حاصل کرنے کے لیے تخلیق کیا جائے، جو کسی بھی طرح کے مقاصد سے ماورا ہو۔ نثری ادب پر رومانوی تحریک کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ اس کا زیادہ اثر تنقید پر پڑا اور وہ بھی تاثراتی تنقید پر، یعنی وہ ادب کی دوسری نثری اصناف پر اثر انداز نہ ہوسکی۔ لہٰذا رومانوی تحریک کے ساتھ ہی ادب لطیف کا رجحان پروان چڑھا اور یہ رجحان بھی سر سید تحریک کے مقصدی اور افادی ادب کے غلبے کا ردِ عمل تھا۔

میر ناصر علی دہلوی (1993-1847) سید نصیر الدین محمد المنصور الدین ناصر علی کا گھرانہ علم و ادب میں ممتاز تھا۔ ان کے آبا و اجداد ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا شمار سرسید احمد خان، آزاد، حالی اور شرر کے ہم عصروں، میں ہوتا ہے۔ وہ دہلی کے ایک ایسے مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے جن کا محبوب مشغلہ ہندوستان میں عیسائی مشنریوں سے مذہب اسلام کی حقانیت کے موضوع پر مناظرے کرنا تھے۔ میر صاحب نے والد صاحب کو بتائے بغیر انگریزی تعلیم حاصل کی اور اتفاق سے انھی پادریوں سے انگریزی پڑھی جو ان کے والد سے مناظرے کرتے تھے۔ انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ پچیس سال تک سرکاری ملازمت کی۔ گورنمنٹ کی طرف سے انھیں خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بہت بڑا تھا۔ انھوں نے ایک پریس بھی مطبع ناصری کے نام سے قائم کیا تھا۔ سرسید اور حالی کے تہذیب الاخلاق کے جواب میں انھوں نے پہلے 1876 میں آگرہ سے 'تیرہویں صدی' نکالا جو 1880 میں 'زمانہ' کے نام سے شائع ہونے لگا۔ 1885 میں 'افادہ ایام' کی شروعات کی اور 1888 میں اسے بند کر کے 'ناصری' کی اشاعت شروع کی اس رسالے کے قلم کاروں میں مرزا حیرت دہلوی کا نام بھی تھا۔ ان کا رسالہ 'صلائے عام' تقریباً بیس سال تک شائع ہوتا رہا اور بہت مقبول ہوا۔ اس رسالہ میں بیش تر مضامین ان کے اپنے ہوتے تھے۔ ساری عمر کی پونجی انھوں نے اس میں لگا دی تھی۔

میر ناصر علی نے سرسید احمد خان کے نیچری عقائد پر اپنے مخصوص انداز میں سخت تنقید کی البتہ وہ ان کی تعلیمی تحریک سے صد فیصد متفق اور اس کے پر جوش حامی تھے۔ نیاز فتح پوری نے میر صاحب کو اردو کا پہلا اور آخری انشائیہ نویس کہا ہے۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کے دور میں اس اسلوب کو زندہ رکھا جس کا تعلق اردو نثر کی دیرینہ روایت سے تھا۔ میر ناصر علی کی وفات دہلی میں ہوئی وہ بڑے انشاء پرداز تھے اور فلسفیانہ موضوعات پر لکھتے تھے۔ اپنی طویل ادبی زندگی میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ فارسی میں قر سید نصیر الدین محمد المنصور الدین ناصر علی قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی تھی جس پر انھیں ترکی کے سلطان کی طرف سے خلعت ملی تھی۔

چوں کہ سرسید تہذیب الاخلاق میں علی گڑھ تحریک اور اپنی نیچری فکر کو حاوی رکھتے تھے، جس کے نتیجے میں ان دونوں موضوعات پر بیش تر مضامین ہوتے تھے۔ میر ناصر علی کو اس بات سے شدید اختلاف تھا، کیوں کہ وہ رومانی اور جمالیاتی فکر واحساس کے حامل تھے، اس لیے لوگوں کے ذہن پر نیچر کے گہرے اثر کو پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نیچر سے مجھے نفرت ہے تو اس لیے کہ اس میں عالمِ خیال کا پتہ نہیں، نگاہ سے آگے تصوّر کا کام نہیں۔ یہ تو جو سامنے ہے وہیں تک ساتھ۔ خیال سے واسطہ نہیں۔ انسان اسے لے کر کیا کرے۔ بندگانِ نیچر سے کون کہے کہ دنیا کی مصیبتیں انسان اسی عالمِ خیال کی بدولت برداشت کر سکتا ہے۔'' (رسالہ 'تیرہویں صدی، 1298)

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میر ناصر علی کو سرسید کے نظریۂ نیچر سے کس حد تک اختلاف تھا۔ ساتھ ہی اس سے 'تیرہویں صدی' کے نئے فکر و اسلوب کا ترجمان ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حقیقت سے چشم پوشی قطعی ممکن نہیں

ہے کہ تیرہویں صدی نے نئے فکر واحساس اور اسلوب و بیان کی نشاۃ ثانی کی ہے۔ اس رسالے نے مختصر مدت میں لوگوں کے اذہان کو بدل ڈالا فکر کو اپنا ہمنوا بنایا اور اسلوب کو تازگی بخشی جس کے نتیجے میں بیش تر قلم کاروں نے ادب لطیف کے نئے فکری رجحان اور اسلوب کی تازگی وشگفتگی کو برتنا شروع کر دیا۔ چوں کہ 'تیرہویں صدی' 1879 میں شائع ہوا تھا اور نامناسب حالات کے تحت چند سالوں کے اندر بند بھی ہو گیا، اسی دوران 1887 میں عبدالحلیم شرر نے 'دل گداز' شائع کیا، جو شرر کے حیدرآباد چلے جانے کے سبب بند ہو گیا، مگر جلد ہی دوبارہ حیدرآباد سے شائع ہوا۔ پھر نامساعد حالات کے بنا پر اسے مستقل بند کرنا پڑا، مگر شرر نے جب لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی تو ایک بار پھر 'دل گداز' کو لکھنؤ سے شائع کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ 'دل گداز' کے بند ہونے اور شائع ہونے کا سلسلہ جاری رہا، جب کہ حیدرآباد کو دکن کا سیاسی مرکز ہونے کے ساتھ ادبی مرکز کی بھی حیثیت حاصل تھی اور یہی حیثیت اودھ میں لکھنؤ کو حاصل تھی۔ دفتری زبان فارسی اور بول چال کی زبان اردو تھی، لہٰذا اس دور کے دو اہم مراکز سے رسالے کا شائع ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر رسالہ 'تیرہویں صدی' کے چند سالوں میں بند ہو جانے کے بعد دوبارہ شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس وجہ سے قلم کاروں پر 'تیرہویں صدی' کے مقابل دل گداز کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ چونکہ رسالہ 'تیرہویں صدی' نے ابتداءً زمین تیار کرنے کا کام کیا، فکر پیدا کی، رجحانات کو عام کیا، لوگوں کے دل و دماغ میں اس فکر و رجحان کو ایک سطح تک عام کر دیا۔ اب مسئلہ تھا اس فکر کے استحکام کا، جسے بعد کے رسالوں نے بخوبی انجام دیا۔ اس اعتبار سے بعد میں ادب لطیف کے لکھنے والوں پر 'دل گداز' کا کچھ زیادہ ہی اثر دکھائی دیتا ہے۔ ویسے 'تیرہویں صدی' ادب لطیف کا اولین فکری نمائندہ رسالہ ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ تیرہویں صدی کے متصلاً بعد 'دل گداز' شائع ہوا، جب کہ شرر نے 'تیرہویں صدی' کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اور برسوں دیکھا پرکھا تھا، تو کیا یہ بعید ہے کہ اس رسالہ کا شرر کے ذہن و فکر پر کچھ اثر نہ پڑا ہوگا؟ ممکن ہے اس کے زیر اثر شرر نے اس فکر کی ترجمانی کے لیے Extention کے طور پر 'دل گداز' جاری کیا ہو، تا کہ اپنے طور پر اس رسالہ کے بند ہونے کے بعد اس فکر کی ترسیل کا کام جاری رہے۔ امکان کی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے 'دل گداز' شائع کیا ہوگا، مگر اتنا تو ضرور ہے کہ شرر 'تیرہویں صدی' سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ہوں گے۔ کیوں کہ ان کا منفرد اسلوب ہر جگہ پہچانا جاتا تھا۔ اسی اسلوب میں شرر نے کئی مضامین لکھے جو تیرہویں صدی میں شائع بھی ہوئے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شرر کی فکر کو مستحکم کرنے میں اس رسالہ کا اہم ہاتھ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شرر کا یہ اسلوب نمایاں بھی نہ ہوتا۔ شرر کا ایک مضمون جو 'تیرہویں صدی' میں شائع ہوا تھا اس کا ابتدائی حصہ دیکھیے:

''اسلوب میں عالم خیال عجیب نعمت ہے۔ زندگی اس کے بغیر الجھن اور ہستی اجیرن معلوم ہوتی ہے۔ وہ فرش مخمل عیش ہے جس پر سوتے چلے جایئے۔ وہ دامن یار ہے جسے پکڑ کر نہ چھوڑیے۔ شوق اس کے بغیر بیکار اور آرزو گنہگار ہے۔ ادائے مغاں کا لطف اس میں، شیوۂ شاہداں کی کیفیت اس میں۔ وہ ساز ہے جس کے بغیر کوئی اچھا، اچھا نہیں لگتا۔ یہی نشاط ہے جو خالص ہے اور جسے انسان اپنا کہہ سکتا ہے۔ بدمستی شبینہ اسی سے جاتی ہے۔ خواب سحر گہی کا مزہ اسی کی بدولت ہے۔''

(رسالہ 'تیرہویں صدی'، 1298)

میر ناصر علی کا رسالہ 'تیرہویں صدی' 1296 (1879) میں شائع ہوا اپنے عہد میں نکلنے والے رسائل میں یہ رسالہ

مگر رسالہ 'تیرہویں صدی' کے چند سالوں میں بند ہوجانے کے بعد دوبارہ شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس وجہ سے قلم کاروں پر 'تیرہویں صدی' کے مقابل دل گداز کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ چونکہ رسالہ 'تیرہویں صدی' نے ابتداء زمین تیار کرنے کا کام کیا، فکر پیدا کی، رجحانات کو عام کیا، لوگوں کے دل ودماغ میں اس فکر و رجحان کو ایک سطح تک عام کر دیا۔ اب مسئلہ تھا اس فکر کے استحکام کا، جسے بعد کے رسالوں نے بخوبی انجام دیا۔ اس اعتبار سے بعد میں ادب لطیف کے لکھنے والوں پر 'دل گداز' کا کچھ زیادہ ہی اثر دکھائی دیتا ہے۔ ویسے 'تیرہویں صدی' ادب لطیف کا اولین فکری نمائندہ رسالہ ہے۔

بہت سی خصوصیات کی بنا پر امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک نئے ذہنی و فکری رجحان کا علم بردار تھا۔ اس کے خیالات نئے تھے۔ احساسات جمالیاتی اور روحانی تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اسلوب میں بھی جدت ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ رسالہ تیرہویں صدی سے ایک نئے ادبی دور کی ابتدا ہوتی ہے، یہ رسالہ اپنے نئے رنگ خیال اور متنوع فکری اسلوب کی بنا پر کافی مقبول ہوا جس کے اثر سے اس دور کے بڑے بڑے مصنفین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ عبدالحلیم شرر کی تحریروں میں شاعرانہ اور عاشقانہ اسلوب کی جو چاشنی دکھائی دیتی ہے دراصل وہ اسلوب تیرہویں صدی کی ہی دین ہے۔ یہ رسالہ دو حصوں پر مشتمل رہتا تھا۔ پہلے حصہ میں میر ناصر علی دہلوی کی، فکر انگیز تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں جو اسلوبیاتی اور جمالیاتی اسلوب نگارش سے مملو ہوا کرتی تھیں۔ اور دوسرے حصے میں دوسرے اہل قلم کی تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں اس حصے میں اکبر الہ آبادی اور امجد علی شہری مستقل لکھنے والوں میں تھے۔ ناصر علی شاعرانہ نثر کے سب سے پہلے ادیب شمار کیے جاتے ہیں اور رسالہ 'تیرہویں صدی' سب سے پہلا رسالہ۔ اس رسالہ کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں اور شائع ہونے والے مضامین میں اسلوب کی جدت آفرینی، شگفتہ تراکیب اور الفاظ کی مینا کاری پائی جاتی تھی۔ جس سے یہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں فنی لوازمات کا کس حد تک لحاظ رکھا جاتا تھا۔ شاعرانہ نثر اور حسن وعشق کی رنگینیاں، لطافتوں کے ساتھ شعریت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کس قدر کی جاتی تھی۔ اس رسالہ میں شائع ہونے والے مضامین اور اسلوب کے تعلق سے یہ کہنا کافی ہوگا کہ شرر کی تحریروں میں جو شاعرانہ اور عاشقانہ اسلوب نظر آتا ہے اسی اسلوب میں لکھے گئے مضامین تیرہویں صدی میں شائع ہوتے تھے۔ لہٰذا دور حاضر میں ایسے ادب کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جس میں لطافت خیال کے ساتھ نزاکت خیال بھی بدرجۂ اتم موجود ہو، کیوں کہ ادب لطیف صرف اسلوب ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے خاص طرز کا فلسفہ بھی رکھتا ہے اور اپنے منفرد انداز نظر کے ساتھ ادب میں کارفرما ہوتا ہے۔ اسی مشن اور مقصد کے ابلاغ کے لیے ادب لطیف کے علم برداروں نے مختلف رسائل و جرائد شائع کیے، تا کہ بہتر اور پُر زور ذریعے سے اس کی افہام اور ترسیل کی جائے۔ ان میں رسالہ تیرہویں صدی، دل گداز، صلائے عام، ہفتہ وار محشر، ہفتہ وار مہذب، ماہنامہ الفرقان، ماہنامہ دل افروز اور ماہنامہ مورخ وغیرہ اہم ہیں، مگر ان میں سب سے زیادہ شہرت دوام 'صلائے عام' اور 'دل گداز' کو حاصل ہوئی، جس کا آج بھی ادب لطیف کے اہم اور سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔

مستفادات

1. انشائے لطیف، ل۔ احمد اکبرآبادی
2. اردو ادب میں رومانوی تحریک، ڈاکٹر محمد حسن
3. کلاسیکیت اور رومانیت، علی جاوید
4. اردو نثر میں ادب لطیف، ڈاکٹر عبدالودود خان
5. اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید
6. اردو ادب، ڈاکٹر سید عبداللہ
7. علی گڑھ تحریک، آل احمد سرور
8. ذوق اور شعور ادب، سید احتشام حسین
9. اردو جامع انسائکلو پیڈیا جلد دوم

■

Mohd Rizwan Khan, Dept. of Urdu, University of Delhi, Delhi-07, Mob:9810862283

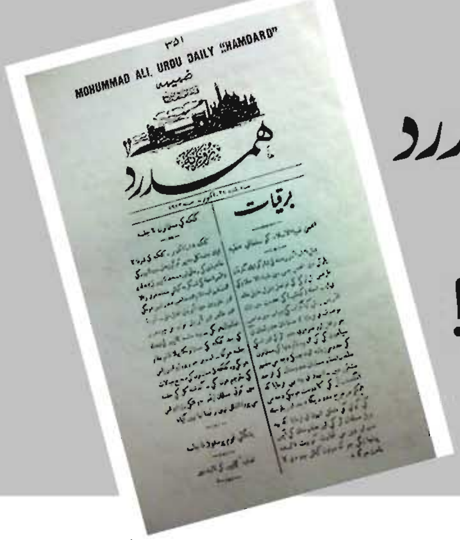

روزنامہ 'ملت' 'ہمدرد' کا نقش ثانی...!

محمد شرافت علی

دہلی کی اردو صحافت کا تذکرہ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار 'ہمدرد' کا قصہ بیان کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، یہ ایک مسلمہ سچائی ہے، مگر اس سے بھی بڑی حقیقت یہ ہے کہ 'ہمدرد' کی اشاعت کا سلسلہ بند ہوجانے کے بعد جس اخبار کو 'ہمدرد ثانی' کے لقب سے نوازا گیا اور جس نے دہلی کی اردو صحافت کو استحکام عطا کرنے کی عملی کوشش کی، اُس اخبار کے نام اور کام دونوں سے آج اردو صحافت کی دنیا ناواقف ہے۔ جس کی بنیادی وجہ صرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ 'ہمدرد ثانی' کے بانی سید محمد جعفری، شہرت اور ناموری سے کوسوں دور رہے۔ جس کی بنا پر اُن کی صحافتی خدمات کو گویا ایک طرح سے فراموش کردیا گیا۔

یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ جب مولانا محمد علی جوہر کا 'ہمدرد' بند ہوگیا تو ان کے دست راست محمد جعفری نے سرزمین دہلی سے اسی معیار ومزاج کا ایک اخبار 'روزنامہ ملت' جاری کیا، جس کا مقصد درحقیقت 'ہمدرد' کے قارئین کو ایک معیاری روزنامہ فراہم کراتے ہوئے 'ہمدرد' کے خلا کو پر کرنا تھا۔ چونکہ سید محمد جعفری مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ 'ہمدرد' کی صحافتی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے تھے اور انھیں عملی صحافت کا خاصا تجربہ بھی حاصل تھا، لہٰذا انھوں نے 'روزنامہ ملت' کو معیاری اردو صحافت کا نمونہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ یہ کارنامہ انھوں نے بغیر کسی سرمایہ دار کا شرمندۂ احسان ہوئے بغیر ہی انجام دیا۔ پھر بھی نہایت کامیابی کے ساتھ 'ملت' نے صحافتی ضابطہ اخلاق کی پاسداری کو یقینی بنایا اور سچی خبروں کی فراہمی کا فریضہ بلا کم وکاست انجام دیا۔ اردو داں طبقہ کے درمیان یہ نوزائیدہ اخبار منظر عام پر آتے ہی 'ہمدرد ثانی' سے بھی ملقب ہوگیا۔ قارئین کے ایک طبقے میں 'ملت' کے انداز وآہنگ کو دیکھ کر یہ غلط فہمی بھی پیدا ہوئی کہ 'ملت' کوئی دوسرا اخبار نہیں بلکہ یہ 'ہمدرد' ہی ہے جو نام بدل کر نکالا گیا ہے۔ ہر چند کہ محمد جعفری کے لیے قارئین کا یہ اکرام باعث فخر تھا پھر بھی انھیں اس بات کی وضاحت کرنا پڑی کہ 'ملت' ایک بالکل نیا اور الگ اخبار ہے۔

روزنامہ ملت کا پہلا شمارہ 9 جولائی 1929 کو منظر عام پر آیا۔ جبکہ دوسرا شمارہ ایک دن کی تاخیر کے بعد شائع ہوا۔ دراصل 'ملت' کے کارکنان کی تھکاوٹ اور کئی دنوں کی مسلسل مشغولیت کے باعث 10 جولائی 1929 کو اخبار کے دفتر میں تعطیل کا اعلان کردیا گیا تھا۔ 11 جولائی کو جب 'ملت' کا دوسرا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس کے صفحہ 2 پر قارئین کی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے 'کشکول' کی سرخی قائم کرتے ہوئے 'ملت' اور 'ہمدرد' کے زیر عنوان وضاحتی نوٹ لگایا گیا جس میں اخبار نے لکھا:

''بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہے کہ 'ملت' کوئی دوسرا اخبار نہیں بلکہ یہ 'ہمدرد' ہی ہے جو نام بدل کر نکالا گیا ہے۔ 'ہمدرد' کے ساتھ 'ملت' کو اس طرح وابستہ کرنا 'ملت' کے کارکنوں کے لیے یقیناً باعث عزت ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے کہ 'ملت' کا 'ہمدرد' کے سابق انتظامات وغیرہ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ 'ملت' بالکل نیا اور جدید اخبار ہے۔ ہمدرد کی خریداری، ایجنسی نیز دیگر تمام معاملات سے 'ملت' کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ 'ہمدرد' نے صحافت کا جو بلند معیار پیش کیا تھا 'ملت' اسے قائم رکھنے کی پوری کوشش کرے گا۔ اس سے یہ سمجھنا کہ 'ملت' 'ہمدرد' ہی کا دوسرا نام ہے، درست اور صحیح نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ 'ملت' کے قدرداں، اس کے خریدار اور ایجنٹ صاحبان اس کا خاص طور پر خیال رکھیں گے''۔

(وضاحت بہ عنوان 'ملت اور ہمدرد' شمارہ 2 جلد 1 صفحہ 2 کالم 2)

روزنامہ ملت کا پہلا شمارہ ہی درحقیقت عوام وخواص کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس نے جہاں صحافت کے اعلیٰ معیار ووقار کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی وہیں پہلے شمارہ میں ہی اصول کار کا واضح اعلانیہ بھی جاری کیا گیا۔ یہ قارئین کی نگاہوں میں قابل تحسین ہی قرار نہیں پایا بلکہ اخباری پالیسی، معیار و مزاج اور اصول واطوار کی بنیاد پر عوام وخواص کے درمیان یہ رائے قائم کی گئی کہ 'ملت' 'ہمدرد' کا ہی تبدیل شدہ نام ہے۔

صاحب اخبار محمد جعفری کی فکر کا مرقع کہلانے والا اداریہ کے اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صحافت ایک تحریک اور مشن تھی، ان کے اندر خلوص اور نیک جذبہ تھا جس نے مادی مشکلیں آسان کردیں:

''......دہلی سے ایک جدید روزنامہ کا جاری کرنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن اس کارساز حقیقی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آج ہمیں اس قابل کردیا کہ ہم اپنی برہم شدہ مجلس کو ازسرنو آراستہ کریں۔ چنانچہ گزشتہ دوڈھائی ماہ کی پیہم کوششوں کے بعد اب ہم اس قابل ہوسکے ہیں کہ ملک و ملت کے سامنے اپنی ناچیز خدمات کو ان اوراق کی صورت میں پیش کردیں۔ 'ملت' جن حالات میں جاری کیا جارہا ہے وہ ان تمام حالات سے بالکل مختلف ہیں جن میں عام طور پر اخبارات آئے دن صفحۂ ہستی پر نمودار ہوا کرتے ہیں۔ اُس کے کارکنوں کے پاس نہ تو دولت ہے اور نہ کوئی سرمایہ اور نہ وہ کسی سرمایہ دار کی اعانت کے شرمندۂ احسان ہیں۔ ان کے پاس تو بس خلوص نیت کی دولت ہے اور عزم کار کا سرمایہ۔ وہ خدمت ملک و ملت کا تہیہ کرکے میدان میں آئے ہیں کہ یا تو اُسے سرکریں گے یا پھر خود فنا ہوجائیں گے۔ ممکن ہے اس مادی دنیا میں لوگوں کو اس پر یقین نہیں کہ بغیر کسی بڑے سرمایہ کے ایک اخبار کیوں کر چل سکتا ہے اور انھیں یہ امر محال معلوم ہو کہ صرف ہمت وارادہ ہی کیسے کسی کام کو کامیابی کی حد تک پہنچا سکتا ہے، لیکن حقیقت میں آج بھی دنیا کا کوئی کام عزم وہمت اور نیک نیتی کے بغیر چل نہیں سکتا۔ ہمت و ارادہ کے بعد کامیابی کے دروازوں کا کھُل جانا اور اولوالعزمی کے قدموں میں مال و دولت کا انبار ہوجانا لازمی اور یقینی ہے۔ دنیا میں مخلصانہ محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ یہی وہ عقیدہ

ہے جسے لے کر کارکنانِ 'ملت' صحافت کی پُرخار وادی میں نکلے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اگر پروردگار کا فضل شامل حال رہا تو ہم کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوں گے۔...... صحیح اور سچی خبریں مہیا کرانے والے اخبارات بہت ہی کم ہیں۔ تقریباً ہر اخبار اپنی جماعت یا پارٹی کی حمایت کو مدنظر رکھ کر جہاں تک ہوسکتا ہے ہر چیز کو ایک خاص رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ اس کے قارئین اسی کے موافق رائے قائم کریں۔ 'ملت' کا طریقہ اس سے بالکل جدا ہوگا۔ ...... بہرحال! آج جس سفر کا ہم آغاز کررہے ہیں، بلاشبہ وہ پُرلطف اور آرام دہ سفر نہیں ہے بلکہ اس کی ہر منزل خطرات سے پُر ہے۔ معلوم ہے کہ ہر جگہ ناامیدیاں اور مایوسیاں ہماری راہ میں حائل ہوں گی لیکن جس امید اور نیت سے ہم اس سفر کے لیے کمربستہ ہوئے ہیں، اس کی بنا پر ہمیں کامل یقین ہے کہ قادر مطلق اپنی نصرت فرمائیوں سے ہمیں فائز المرام کرے گا۔''

(اقتباس، اداریہ شمارہ اول روزنامہ ملت مورخہ 9 جولائی 1929)

اخلاصِ نیت کی دولت اور عزم کار کے سرمایہ سے متصف روزنامہ ملت کی قدرافزائی میں قدرداں واقعی پیچھے بھی نہیں رہے جس کا بین ثبوت اخبار کو پہلے ہی شمارہ سے حاصل ہونے والا اشتہاراتی تعاون ہے۔ 8 صفحات پر مشتمل روزنامہ ملت کے پہلے شمارہ کے صفحۂ اول پر 'آقائے مدینہ کی نذر' کے عنوان سے شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ حیدرآباد مناظر احسن کی وہ نعت شریف نذرِ قارئین کی گئی ہے جو موصوف نے حج بیت اللہ اور زیارت بیت الرسول کے سفر کے دوران جہاز پر ذوق وکیف سے بیخود ہوکر رقم کی تھی اور جسے ان کے رفیق سفر مولانا عبدالماجد دریابادی نے بغرض اشاعت 'ہمدرد' کے ایڈیٹر کو بھیجی تھی۔ بدنصیبی یہ تھی کہ جب وہ نعت 'ہمدرد' کے مدیر موصوف کے پاس پہنچی، ہمدرد کی زندگی ختم ہوچکی تھی۔ چنانچہ 'ملت' کے افتتاحی شمارہ میں اسے زینت بخشنا مناسب سمجھا گیا۔ دوسرے صفحہ پر اخبار نے اپنے طویل اداریہ میں وادیٔ صحافت میں قدم بوسی کے اغراض ومقاصد کو بیان کرتے ہوئے اصول کار سے قارئین کو واقف کرایا ہے۔ اسی صفحہ میں 'کشکول' کا عنوان قائم کرتے ہوئے 'گاندھی جی اور دہلی میونسپلٹی' کی سرخی کے تحت میونسپل کے اراکین کے ذریعہ ریلوے اسٹیشن پر گاندھی جی کے استقبال کی خبر شائع کی گئی ہے۔ اخبار نے گاندھی جی کو سپاس نامہ پیش نہ کرنے اور محض خیرمقدم سے کام چلانے کی روش پر بلدیہ کی تنقید کی ہے۔ صفحہ 2 پر ہی 'سرراہے گاہے' سے معنون تحریر میں ظرافت پر مبنی کالم کی اشاعت کی بابت قارئین کے عام مشوروں پر گفتگو مرکوز کی گئی ہے۔ اخبار نے اس مضمون کے آخر میں قارئین کے 'چٹورے مذاق' کی اصلاح کی دعا بھی کی ہے۔ صفحہ 3 کلیتاً خبروں کے لیے مختص ہے جس میں پہلی خبر حج بیت اللہ کی ادائیگی کی ہے جس کے مختلف ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں اور ان سے متعلق تفصیلات کا اجمالیہ بیان کیا گیا ہے۔ اگلا صفحہ بھی خبروں سے پُر ہے جس میں افغانستان کے لیے وسیع القلبی دکھائی گئی ہے۔ صفحہ 5 مکمل طور پر تصاویر سے مزین ہے جس میں ملکی اور غیرملکی تصویروں کو مع کیپشن بہ اہتمام شائع کیا گیا ہے۔ صفحہ 6 پر 'مسلم خواتین کا علمی مرتبہ' کے عنوان سے ایک عمومی نوعیت کا مضمون شامل اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ بمبئی میں منعقد مرکزی خلافت کمیٹی کی مجلس عاملہ کے اجلاس کی خبر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ اجلاس مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں منعقد ہونا تھا تاہم صاحبزادی کی علالت کے باعث وہ بمبئی نہیں پہنچ سکے لہٰذا مولانا شفیع داؤدی کی صدارت میں یہ سہ روزہ جلسہ منعقد ہوا۔ خبر میں جدید مجلس خلافت پنجاب کی اعانت کی اپیل بھی کی گئی ہے۔ دراصل یہ خبر مولانا شوکت علی نے برقی پیغام کے طور پر 'ملت' کو بھیجی تھی جس کی وضاحت سطور بالا میں کردی گئی ہے۔ اسی صفحہ پر 'کیا کشمیر فروخت ہوگا' کی سرخی کے تحت ایک ایسی خبر شائع کی گئی ہے جس میں مہاراج کشمیر اور حکومت برطانیہ کے درمیان تعلقات کی کشیدگی کی اطلاع دی گئی ہے۔ افتتاحی شمارہ کے آخری دو صفحات مکمل طور پر اشتہارات سے آراستہ ہیں، جن میں قاری بک ڈپو اور سید ظہور الحسن وحافظ ابوالحسن قومی پریس کی کتابوں پر رعایت کی بابت قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے، نیز انقلاب افغانستان کی داستان پر مبنی کتابوں کی مسلمہ حیثیتوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے اور قارئین کو رغبت دلاتے ہوئے افغانستان کے انقلاب کی حقیقی صورت حال سے واقفیت کے لیے انھیں تحقیقی کتابیں خریدنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی 'ملت' کے افتتاحی شمارہ کا معیار ومزاج وآہنگ ہی کچھ ایسا تھا جو قارئین کو متوجہ کرنے کا سبب بنا۔ دہلی کے اردوداں طبقے میں اس اخبار کو نہ صرف یہ کہ بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ شمالی ہند کی ریاستوں کے علاوہ جنوبی خطے سے بھی اس کی خریداری کے لیے پیشگی رقوم ارسال کیے جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کی تصدیق 'ملت' کے سرکولیشن رجسٹر سے ہوجاتی ہے۔ اس طرح بہت ہی کم عرصے میں 'ملت' کو اردوداں حلقے میں پذیرائی حاصل ہونے لگی اور ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں 'ملت' کی قابل لحاظ کاپیاں فروخت کے لیے بھیجی جانے لگیں، 'ملت' کے دفتری رجسٹر میں درج احوال وآثار سے بخوبی اس سلسلے میں روشنی پڑتی ہے۔ ہرچند کہ 'ملت' کے عملوں کی کائنات بہت چھوٹی تھی اور بہ مشکل 20 نفوس پر مشتمل ادارتی عملہ بشمول 5 کاتب اخبار کی تیاری کے فرائض انجام دیا کرتے تھے، لیکن اخباری صفحات شاہد ہیں کہ 'ملت' نے معیار کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور نہایت اعتدال پسندی کے ساتھ صحافتی اخلاقیات کو برتتے ہوئے قارئین کے دلوں میں جگہ بنائی۔

اخبار 'ملت' کا مزاج اعتدال پسندانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی خیال، واقعہ، سانحہ یا شخصیت سے عدم اتفاق کی صورت میں منصۂ شہود پر آنے والی تحریروں میں بھی کرخت لہجہ استعمال نہیں کیا گیا۔ خواہ معاملات قومی نوعیت کے ہوں، بین الاقوامی سطح کے یا پھر ملت اسلامیہ ہند سے متعلقہ، ملت کی شائستہ تحریروں سے کہیں یہ گمان نہیں گزرتا کہ اخبار نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہو۔ اختلافِ رائے کے اظہار میں بے باکی مسلّم ہونے کے باوجود پیرایۂ اظہار شریفانہ ہوا کرتا تھا۔ خبروں میں جابجا تلخ وتند تبصروں کی آمیزش دیکھنے کو ضرور ملتی ہے لیکن تنقیدی ظرف خاصا بلند نظر آتا ہے۔ یہی صورت حال مضامین میں بھی جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔ اظہار رائے سے اختلاف کی صورت پیدا ہونے پر ردعمل میں موصول ہونے والی تحریروں کو بھی نمایاں طریقے سے شائع کرنے کی روایت نہایت مستحکم جان پڑتی ہے۔ برطانوی حکمراں کے خلاف تحریری محاذ آرائی اخبار ہذا کا دین دھرم ضرور ہے لیکن فرنگیوں کی مخالفت اور قوم پرستوں کی حمایت کے لیے کھوکھلی نعرے بازی سے 'ملت' کے صفحات پوری طرح پاک۔ قوم پرور طبقے کی حمایت اور حریت پسندوں کی اعانت کا کوئی موقع بھی گنوانا اخبار کی شان استغنا کے خلاف رہا۔

'ملت' کے اداریے سے ملک وملت کے تئیں اخبار کی گہری فکرمندی ظاہر ہوتی ہے۔ خصوصاً فرقہ وارانہ اخوت وبھائی چارگی کی فضا کو مکدر کرنے کی ہر کوشش کے خلاف اخبار سینہ سپر دکھائی دیتا ہے۔ 'ملت' کے 4 جون 1931 کے شمارہ میں کانپور، مرزاپور اور بنارس میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑنے پر اخبار نے انتہائی فکرانگیز اداریہ لکھا ہے۔ اخبار لکھتا ہے:

''کانپور، مرزاپور اور بنارس کے ہندو مسلم فسادات کی یاد لوگوں کے دلوں سے محو بھی نہیں ہوئی تھی کہ محرم کے سلسلے میں مزید فسادات کی خبریں آنے لگیں۔ گزشتہ فسادات سے دونوں ملتوں کے تعلقات پر جو اثر پڑا تھا اور ان میں جو کشیدگی پیدا ہوگئی تھی، ابھی وہی باقی تھی کہ محرم کے جدید فسادات ان میں مزید اضافہ کا باعث ہورہے ہیں۔ کانپور میں ایک معمولی سی بات پر جس طرح سے فساد ہوا ہے وہ اس قدر شرمناک ہے کہ اس کے ذکر سے ہمیں اپنا سر جھکا لینا پڑتا ہے۔ اب جنوبی ہند سے بھی فساد کی خبر آئی ہے لیکن چونکہ وہاں تعزیہ داری کا کچھ زیادہ زور نہیں ہے اس لیے وہاں کے فساد کی ابتدا اسی پرانی صورت میں، مسجد کے سامنے باجہ سے ہوئی ہے جس پر چند سالوں قبل ہندو مسلمان آپس میں خوب جنگ کرچکے ہیں۔ اگر مسجد کے سامنے باجے

پرفسادات کی تاریخ پر غور کیا جائے اور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں متعدد ہندو اور متعدد مسلمانوں کی جانیں ضائع ہو چکی ہیں اور سینکڑوں کو جیل کی سزائیں بھگتنی پڑی ہیں لیکن نہ تو جھگڑا طے ہوا نہ مسجد کے سامنے باجہ بجانے کی ہندوؤں کو آزادی حاصل ہوئی اور نہ مسلمان اسے روک ہی سکے البتہ دونوں قوموں میں لڑائی کے لیے یہ ایک اچھا خاصا بہانا نکل آیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے فسادات عموماً ہندوستان میں اسی زمانے میں شروع ہوتے ہیں جبکہ حکومت کے سامنے کوئی اہم سیاسی اور آئینی مسئلہ پیش ہوتا ہے اور پھر ان کی اس قدر تشہیر ہوتی ہے کہ نہ صرف سارے ملک کی توجہات تمام دیگر مسائل کی طرف سے ہٹ جاتی ہے بلکہ حکومت کے سامنے بھی بس یہی بے حد فرقہ وارانہ مسئلہ سب سے اہم بن جاتا ہے اور اس کی تمام تر کوشش اسی طرف مرکوز ہو جاتی ہے۔"

(اداریہ 'ملت' تاریخ۔ 4 جون 1931)

'ملت' کے اداریہ میں خاص بات نوٹ کرنے کی یہ بھی ہے کہ ہر موقع پر ناصحانہ انداز اختیار کرنا اور ملت اسلامیہ ہند کو شعور سے کام لینے کی تلقین کرنا اخبار اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ خواہ معاملہ ہندو مسلم فسادات کا ہو، مسلم یونیورسٹی سے متعلقہ کسی تنازعہ کے حوالے سے ملت کی رہنمائی کا ہو یا پھر قوم پرستی کی بنیاد پر مسلمانوں کے اتحاد کے شیرازہ کے بکھرنے کو روکنے کی کوششوں کا، اخبار ہذا کے اداریہ میں ایک خاص قسم کی ناصحانہ فکر نمایاں طور پر جھلکتی ہے جو قدم قدم پر اپنے قارئین کو یہ احساس دلاتی ہے کہ کہاں چوک ہوئی، کس مقام پر غلطی کی گئی اور ان غلطیوں سے کیا سبق لینے کی ضرورت ہے؟ اخبار ہذا کے جلد اول کے شمارہ 1 سے جلد نمبر 11 کے شمارہ نمبر 126 تک کے اوراق پلٹتے ہوئے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اخبار نے جذباتیت سے کام لے کر قارئین کو کسی بھی اہم نکتے پر ورغلانے کی تھوڑی بھی کوشش کی ہو بلکہ جا بجا یہ گمان گزرتا ہے کہ 'ملت' نے مسلمانوں میں فرقہ پرستانہ ذہنیت کو پروان چڑھائے جانے پر ان عاقبت نااندیش قائدین کی سخت سرزنش سے بھی دریغ نہیں کیا جو ملت اسلامیہ کی کشتی کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے بعض اوقات جذبات کی رو میں بہہ کر علیحدہ تشخص اور منفرد سوچ کی آبیاری کو 'جزو ایمان' قرار دینے میں لگ جایا کرتے تھے۔ خبروں کی ترسیل کے دوران معاشرے میں اتحاد و اتفاق کے پیغام کو رواج دینے کی سعی بطور خاص کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب 1931 میں مسلم نیوز ایجنسی قائم کرنے کی تحریک مسلم قائدین نے شروع کی تو 'ملت' نے لکھنؤ کے معاصر 'ہمت' کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ فرقہ وارانہ خطوط پر کسی بھی خبر رساں ایجنسی کے قیام کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ یہ تجویز مسلم اکابرین کی پیش کردہ تھی۔ 'ملت' نے اسے قبول کرنے سے صرف اس وجہ سے انکار نہیں کیا کہ اس سے فرقہ واریت کی بو آ رہی تھی بلکہ اس کے دیگر اسباب بھی تھے۔ چنانچہ اخبار مذکور نے 10 جون 1931 کے اداریہ میں معروضات بیان کرتے ہوئے مسلم نیوز ایجنسی کی تحریک کو مسترد کر دیا۔

اس کی وجہیں کیا تھیں؟ آیئے ملّت کی زبانی دیکھیں:

"......فرقہ وارانہ بنیاد پر صرف مسلمانوں کے مفاد اور حقوق کے پروپیگنڈے کے لیے کسی خبر رساں ایجنسی کا چلنا اور اس کا کامیاب ہونا نہ صرف قطعاً ناممکن ہے بلکہ خبر رسانی کے صحیح فرائض کے بھی منافی ہے۔ بقول 'ہمت'" یہ بالکل سچ ہے کہ اگر اس نیوز ایجنسی کے چلانے والوں کا واقعی یہی مقصد ہے تو ایسی خبر رساں ایجنسی کے قائم ہونے سے اس کا نہ ہونا بہتر ہے، ہمیں تعجب ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کے تحفظ کے لیے اس قدر بے قرار اور بے چین ہیں وہ اس قسم کی فرقہ وارانہ ایجنسی کو قائم کر کے مسلمانوں کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں؟ جبکہ بدقسمتی سے ان کے پاس نہ تو اتنے اخبارات ہیں کہ وہ اس ایجنسی کی خبروں کو خرید کر اسے کامیاب بنا سکیں گے اور نہ شاید اس قسم کے مسلمان ہی انھیں بہم پہنچ سکیں گے جو اس ایجنسی کو چلا لیں۔...... ایسوسی ایٹیڈ پریس اور فری پریس سے محض شکایت کی بنا پر، جو ہمارا خیال ہے کہ صرف ایک مخصوص حلقہ کو حال میں کسی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے، کسی دوسری خبر رساں ایجنسی کا چلانا ایک کھلی ہوئی بنیادی غلطی ہے۔ فری پریس کے متعلق البتہ ہم کچھ کہنا نہیں چاہیں گے لیکن ایسوسی ایٹیڈ پریس کا ہمیں گذشتہ سات سال سے 'ہمدرد' اور پھر اس کے بعد 'ملت' میں مسلسل جو تجربہ رہا ہے اس کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی خبریں تمام دیگر اخبارات کے نامہ نگاروں کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتماد اور زیادہ صحیح ثابت ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کسی مقامی نامہ نگار کے متعلق کوئی شکایت نکل آئے لیکن جہاں تک عمومی طریقہ اور پالیسی کا تعلق ہے مسلمان اور اسلامی معلومات کے ساتھ تعصب اور طرفداری کی کوئی مثال بمشکل مل سکے گی۔ دشواری یہ ہے کہ جو لوگ ایسوسی ایٹیڈ پریس کی ایجنسی پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی خبریں کم دیتی ہے، وہ خبر رسانی کے طریقوں اور اس کے انتظامات سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ غالباً انھیں یہ نہیں معلوم کہ خبروں کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے اور وہ کس طرح مرکزی ایجنسی کے پاس آتی ہیں؟ کن کن مقامات پر نمائندے رکھے جاتے ہیں اور کہاں کہاں نامہ نگار مقرر ہوتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ مرکزی دفتر میں اگر معتبر اور باوثوق ذرائع سے کوئی اہم اور دلچسپ خبر پہنچ جائے تو اس کے لیے یقینا یہ ناممکن ہے کہ وہ اس خبر کو نظر انداز کردے اور شاید اس کی مثال بھی نہ ملے گی البتہ جو خبریں ایجنسی تک پہنچ ہی نہ سکیں یا جو غیر معتبر اور غیر معروف ذرائع سے بھیجی جائیں ان کی اشاعت کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ کس طرح کوئی ایجنسی لے سکتی ہے؟ اور پھر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خبر رساں ایجنسیاں خبریں بھیجتی ہیں لیکن اخبار والے یا تو ان میں کانٹ چھانٹ کر دیتے ہیں یا پھر اپنے مقاصد کے خلاف سمجھ کر انھیں مسترد کر دیتے ہیں اور اس وقت عام طور پر انگریزی اخبارات جن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں، جو لوگ ان کی پالیسی پر حاوی ہیں اگر ان میں ایسا ہوتا ہے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔...... بہر حال جہاں تک ایک جدید نیوز ایجنسی کے قیام کا مسئلہ ہے تو وہ یقینا خیر مقدم کرنے کے قابل ہے لیکن اس کے فرقہ وارانہ اور مخالفانہ پہلو کی کسی بھی طرح تائید نہیں کی جاسکتی۔...... نیوز ایجنسی سے پہلے سب سے زیادہ مسلمانوں کو اگر ضرورت ہے تو اخبارات کی ہے تاکہ اس کے بعد اگر کوئی نئی ایجنسی قائم ہو تو یہ اخبارات اس کی حمایت کر سکیں۔ بغیر اخبارات کے ایجنسی کا قائم کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے گاڑی اور گھوڑے سے پہلے ساز تیار کرنا۔"

(اقتباس، اداریہ 'ملت' 10 جون 1931)

اداریہ کے طویل اقتباس سے 'ملت' کی سنجیدگی اور طرز فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 'ملت' کے پہلے شمارہ تک رسائی سے اخبار کے آغاز کی بابت تحقیقی مسئلہ کا حل نکل آیا لیکن اخبار ہذا کب اور کن حالات میں بند ہوا اس کی تفصیلات ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ 'ملت' کا جو آخری شمارہ میرے سامنے آیا، اس میں جلد نمبر 11، شمارہ نمبر 126 درج ہے۔ اس شمارہ کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اخبار کا آخری شمارہ ہے کیونکہ نہ تو اس میں کہیں اخبار کے بند ہونے کی کوئی پیشگی اطلاع ہی شامل اشاعت ہے اور نہ ہی کسی مالی مسئلے سے ادارہ کے دوچار ہونے کا ہی گمان گزرتا ہے۔ اس کے برعکس اخباری صفحات گواہی دے رہے ہیں کہ 'ملت' بلند پروازی کے سفر پر گامزن ہے۔ اخبار 'ہمدرد' کے بعد 'ملت' نے اردو صحافت کو وقار و اعتبار بخشنے کے حوالے سے جو صحافتی خدمات انجام دیں، اس کی مسلمہ حیثیتوں سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں البتہ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اس اخبار کی بابت تحقیق کی زبان خاموش ہے۔

اخبار ہذا کی کچھ فائلوں کو آج بھی محمد جعفری مرحوم کی تیسری نسل 'اجداد کا سرمایۂ علمی' قرار دے کر اسے اپنے پاس محفوظ کیے ہوئے ہے لیکن اس پر زمانہ کے اثرات حاوی ہوتے جا رہے ہیں، جن سے یہ خدشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں جو کچھ بھی سرمایہ محفوظ ہے وہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔

■

Mohd Sharafat Ali, 12 Satluj Hostel, JNU, New Delhi - 67,
Email.:topicresearcher@gmail.com

حامد رضا صدیقی

اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات

انیسویں صدی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے برعظیم کی تاریخ میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس صدی میں وہ فیصلہ کن واقعات پیش آئے جنھوں نے اس خطے کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ انگریزی استعمار کی غلامی اور پھر اس غلامی کی لعنتیں اور برکتیں ساتھ ساتھ ظہور پذیر ہوئیں۔ نیا سیاسی واقتصادی ڈھانچہ، تہذیب وتمدن کے لیے نئے مظاہر، نئی زبان، نیا نظام تعلیم، نئے ذرائع مواصلات، نئی سائنسی کرامات، اجتماعی زندگی میں مغربیت کا عمل دخل اور پھر اس سے پیدا ہونے والی کش مکش اور تصادم یہ سب اس صدی کا تحفہ ہیں۔

خوش قسمتی سے اردو صحافت کا آغاز بھی اسی صدی کے اوائل کا واقعہ ہے۔ چنانچہ جو تبدیلیاں روبہ عمل آرہی تھیں۔ ان کی راہ ہموار کرنے یا ان کا راستہ روکنے میں اردو صحافت نے قابل لحاظ حصہ لیا۔ اردو زبان اپنی فطری دلکشی اور رابطے کی زبان ہونے کی بنا پر ملک گیر حیثیت رکھتی تھی۔ لہٰذا اس زبان میں صحافت کی نشوو نما قدرتی طور پر دوسری زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ہوئی۔ اجرائے اخبار اور تعداد کے لحاظ سے صدی کے اواخر تک اردو صحافت نے دوسری زبانوں کی صحافت کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اردو زبان نے جہاں اردو صحافت پر ترقی کے در وا کیے وہیں اردو صحافت بھی اردو زبان کو مانجھنے، چمکانے اور لکھنے پڑھنے کی زبان بنانے کا وسیلہ بنی۔

ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار 29 جنوری 1780 کو جیمس آگسٹس ہکی نے کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر یا ہکی کی بنگال گزٹ کے نام سے انگریزی زبان میں جاری کیا۔ جو عام طور پر (ہکی گزٹ) کے نام سے مشہور ہے۔ بیالیس سال بعد ہندوستان میں اردو کا پہلا اخبار (جام جہاں نما) جاری ہوا۔ اس عہد میں کئی انگریزی اخبارات نکل چکے تھے مثلاً بنگال (1785) انڈین ورڈ (1791) بنگال ہرکارو (1795) ایشیاٹک مرر، مارننگ پوسٹ، ٹیلی گراف اور اورینٹل اسٹار یہ سبھی 1799 میں نکل رہے تھے۔ مدراس پریسیڈینسی سے مدراس کوریئر (1785) مدراس گزٹ (1795) انڈیا ہیرالڈ (1795) اسی طرح ممبئی پریسیڈینسی سے بامبے ہیرالڈ (1789) بمبئی گزٹ اور بامبے کوریئر (179) جیسے اخبارات نکلتے تھے۔

جام جہاں نما اردو کا اولین مطبوعہ اخبار ہے جو 27 مارچ 1822 کو کلکتہ

سے جاری کیا گیا تھا اس کے اڈیٹر منشی سدا سکھ مرزاپوری اور مالک ہری دت تھے۔ یہ ولیم ہوپکنس پیئرس کے مشن سے چھپتا تھا یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا جو شروع میں گیارہ اور آٹھ انچ تقطیع میں چھ صفحات پر مشتمل تھا اخبار کے ہر صفحے پر دو کالم اور ہر کالم میں عام طور پر 22 سطریں ہوا کرتی تھیں یہ اخبار فارسی ٹائپ میں چھپتا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف حصے یا پہلی جنگ آزادی 1857 سے قبل تک ہندوستان کے مختلف شہروں سے متعدد اخبار جاری ہو چکے تھے۔ اس دوران (خیر خواہ ہند) مرزاپور سے جاری ہوا جو اتر پردیش کا پہلا اخبار ہے اسے ایک پادری نے 1837 میں جاری کیا تھا۔ یہ ایک مذہبی اخبار تھا اس کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔

جدید علوم کے فروغ میں قدیم دلی کالج کی بیش بہا خدمات رہی ہیں اسے قدیم وجدید کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ میں اس کالج کا اہم رول رہا ہے جہاں نادر روزگار شخصیات موجود تھیں 1845 میں اس کالج سے بارہ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار (قران السعدین) جاری ہوا اس کے پہلے اڈیٹر پنڈت دھرم نرائن بھاسکر تھے جو غیرمعمولی استعداد رکھتے تھے اور شائستہ ذوق صحافت کے مالک تھے 23 مارچ 1845 کو قدیم دلی کالج سے ہی فوائدالناظرین منظر عام پر آیا اس کے اڈیٹر ماسٹر رام چندر تھے جو متنوع کمالات اور علمی لیاقت کی وجہ سے انیسویں صدی کی ممتاز شخصیت تصور کیے جاتے تھے۔ انھوں نے درس و تدریس اور تصنیف وتالیف کے ذریعے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ 1847 میں ماسٹر رام چندر ہی نے (خیر خواہ ہند) کے نام سے ایک اور اخبار جاری کیا تھا اس کے دو ہی شمارے شائع ہوئے تھے کہ انھیں پتہ چلا کہ اس نام کا ایک اخبار مرزاپور سے شائع ہو رہا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس کا نام بدل کر (محب ہند) کردیا اور بعد میں اسی نام سے نکلتا رہا اس میں متفرق ومتنوع موضوعات کا احاطہ کیا جاتا تھا۔

1847 میں لکھنؤ کا پہلا اخبار (لکھنؤ اخبار) کے نام سے جاری ہوا اس کے اڈیٹر لال جی تھے۔ اس کے علاوہ اسی سال میرٹھ سے (جام جمشید) بابو شیو چندر ناتھ کی ادارت میں جاری ہوا اسی طرح بنارس سے بھی (اخبار سدھاکر) پنڈت رتن ایشور تیواری کی ادارت میں جاری ہوا اس کا رسم الخط دیوناگری تھا لیکن زبان اردو کی استعمال کی جاتی تھی۔ اسی سال دلی سے (فوائدالشائقین) پربھو دیال کی ادارت میں شائع ہوا جو گورنمنٹ گزٹ کا اردو ترجمہ ہوتا تھا اس کے علاوہ منصفی کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبا کے لیے مفید مضامین بھی شامل کیے جاتے تھے۔ اسی سال بنارس سے دو ماہنامہ رسالوں کا ذکر ملتا ہے یعنی رسالہ (مرات العلوم) جس کے اڈیٹر ہربنس لال اور مالک بابو بھیروں پرشاد تھے اور دوسرا (باغ و بہار) جس کے اڈیٹر بابو کیدار ناتھ گھوش اور کالی پرشاد تھے۔

1849 میں مدراس سے ایک قابل قدر اخبار (آفتاب عالم تاب) جاری ہوا تھا جس کی خبروں کا حوالہ مشہور ریاضی داں ماسٹر رام چندر کے اخبار (فوائدالناظرین) میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اور اسی سال آگرہ سے (اخبارالنواح) جس کا پورا نام (نزہت الارواح و اخبارالنواح) تھا اس کے اڈیٹر اور مالک مشہور حکیم جواہر لال تھے اور اسی درمیان 1849 کے اواخر میں آگرہ سے ایک ادبی گلدستہ (معیار الشعرا) کے نام سے بنسی دھر کی ادارت میں جاری ہوا جس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

1850 میں (کوہ نور) لاہور سے جاری ہوا اس کے اڈیٹر منشی ہر سکھ رائے تھے جو جام جمشید میرٹھ کی ادارت کر چکے تھے یہ اردو زبان اور فارسی رسم الخط میں پنجاب سے جاری ہونے والا پہلا اخبار ہے اسی سال بنارس سے (زائرین ہند) جاری ہوا۔ اخبار (مرات العلوم) بند ہو جانے کے بعد ہربنس لال نے اپنا ذاتی مطبع قائم کیا اور وہیں سے اپنی ادارت میں اسے جاری کیا۔ 1852 (آفتاب ہند) جاری ہوا اسے بابو کاشی ناتھ متر بنارس سے نکالتے تھے جو آٹھ صفحات پر مشتمل تھا یہ اخبار کاشی پریس سے چھپتا تھا معاصر اخبار میں بہتر طرز تحریر کا حامل اور ذی اثر اخبار تھا۔ 1854 میں کئی اور اخبارات جاری ہوئے بنارس گو بند رگھوناتھ کی ادارت میں (بنارس گزٹ) اندور سے پنڈت دھرم نرائن بھاسکر اور مہا راجہ ہولکر نیز این، سی ہملٹن کی سرپرستی میں (مالوہ اخبار) منظر عام پر آیا 1855 رگھوبیر پرشاد عیاش نے (سحر سامری)، بینی پرشاد نے اعجاز لکھنؤ، لکھنؤ سے جاری کیے۔ ان اخبارات میں لکھنؤ کی طرز فکر تہذیب وتمدن اور اس عہد کی ہوبہو عکاسی ملتی ہے۔ ساتھ ہی سیاسی، معاشی بدحالی و بے انتظامی کا تجزیہ بھی ملتا ہے۔

غیر مسلم صحافیوں میں منشی نول کشور کا نام زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ اردو عربی کتابوں کی طباعت میں گراں خدمات انجام دینے والے منشی نول کشور نے 1858 میں لکھنؤ سے (اودھ اخبار) شروع کیا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہوا اور 1877 میں روزنامہ ہوگیا اپنے وقت کا یہ اردو کا بہت بڑا اخبار تھا۔ ایک زمانے میں یہ اخبار چالیس سے اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا انگریزی اخباروں کو چھوڑ کر یہ پہلا ایسا اخبار تھا جس کے رپوٹر مختلف صوبوں میں تعینات تھے اور کہا جاتا تھا کہ ہندوستان کی مختلف راجدھانیوں میں حکومت کے نمائندے رہتے ہیں یا پھر منشی نول کشور کے، اردو کے بہترین ادیب، شاعر مضمون نگار، مثلاً عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، یاس یگانہ چنگیزی، شوکت تھانوی وغیرہ اس اخبار سے وابستہ تھے۔

تاریخ صحافت میں ہم کبھی ڈاکٹر مکند لال، منشی ایودھیا پرساد اور گنیش لال کے نام کو بھلا نہیں سکتے، ڈاکٹر مکند لال نے 1859 میں (تاریخ بغاوت ہند) کے نام سے ایک

ماہنامہ آگرہ سے اور منشی لال ایودھیا پرساد نے 1860 میں ایک ہفت روزہ (خیر خلق خدا) اجمیر سے جاری کیا اور 1861 میں رائے گنیش لال نے میرٹھ سے اخبار (جلوہ طور) نکالا جس کے اڈیٹر سید ظہورالدین تھے یہ اردو کے مشہور شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد بھی تھے۔

1879 کے بعد جب اردو صحافیوں نے یہ کوشش کی کہ ہندوستانیوں میں آزادی کا شعور بیدار ہو تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو صحافی بھی آزادی وطن کی تحریک میں پیش پیش رہے اور اگر مدینہ ضلع بجنور سے، زمیندار لکھنؤ سے آزادی کی تحریک میں نمایاں کردار کرتے رہے تو دوسری طرف دہلی سے لالہ دیش بندھو گپتا کا تیج اور لکھنؤ ہی سے پندت بیج ناتھ کا سحر سامری وغیرہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ لالہ لاجپت رائے کا وندے ماترم، لالہ دینا ناتھ کا ہندوستان، اور دیپک بھی اپنے سیاسی مضامین وموضوعات سے مقبولیت حاصل کرتے رہے اور انگریز ان سے ضمانت طلب کرکے انھیں بند بھی کرتے رہے۔

لاہور سے جاری ہونے والا پندت قلندر رام کا اخبار (اخبار عام) 1871 کے بعد انیسویں صدی کے آخری حصے میں ایک بڑا اخبار (پیسہ اخبار) جاری ہوا اسے منشی محبوب عالم نے 1887 میں پنجاب گوجرانوالہ شہر اور بعد میں لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار کے طور پر شروع کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ محبوب عالم اور منشی نول کشور کو اردو اخبارات میں وہی مقام حاصل ہے جو انگلینڈ میں جان والٹر، اور ہارمس ورتھ کو حاصل تھا۔ 1887 میں لکھنؤ سے ایک بڑا اخبار اودھ پنچ منظر عام پر آیا اور اس اخبار نے اردو زبان وادب کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے اس کے لکھنے والوں میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرساد برق، اکبر الہ آبادی قابل ذکر صحافی ہیں۔

انیسویں صدی میں اردو صحافت کے آسمان پر غیر مسلم صحافی چھائے رہے۔ آگرہ کے (صدرالاخبار) کے، کیدار ناتھ (فوائدالشائقین) کے پربھودیال (بنارس اخبار) کے بابو رگھو ناتھ ٹھاٹھے، (مفید ہند) کے منشی ایودھیا پرساد، (مالوا اخبار) کے دھرم نرائن، (کوہ نور) کے منشی ہرسکھ رائے اور لالہ جگت نرائن، (زائرین ہند) کے ہرونش لال، (نورالابصار) آگرہ 1852 کے منشی سدا سکھ لال، ہفتہ وار (آفتاب ہند) کے، بابو گووندر گھوناتھ سنگھ، گوالیار جگت کے پنڈت اوماچرن ہفتہ وار (چشم فیض) کے، منشی دیوان چند (فتح الاخبار) کے، کرپا شنکر پندرہ روزہ (چشمہ خورشید) کے، منشی دیوان چند آگرہ کے (ہفتہ خلائق) کے، منشی شیو نرائن کے اسمائے گرامی اردو صحافت کے سنہرے باب کا خوبصورت عنوان ہیں۔

بیسویں صدی تک آتے آتے بہت کچھ بدل چکا تھا سیاسی بیداری اور آزادی کی تحریک تیز ہو چکی تھی۔ دنیا بھر کے حالات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اردو اخبارات بھی تمام آزمائشوں سے گزر چکے تھے مذہبی، سیاسی، ادبی، ثقافتی، طنز ومزاحیہ ہر طرح کے اخبار نکل چکے تھے اور اسی درمیان غیر مسلم صحافیوں کی خدمات انگریزی سیاست کا شکار ہو گئی۔ تقسیم بنگال کے ہی وقت سے ہندو مسلم تفریق کا بیج بو دیا گیا اور اخبارات میں اتحاد کے بجائے اختلاف کا سبق پڑھایا جانے لگا۔ مہاشے خوش حال چند خورسند کا ملاپ اور پرتاپ جیسے اخبار جو اتحاد و اتفاق کے علمبردار تھے آپس میں لڑتے تھے۔ اس کا اثر بہرحال ہندو مسلم اتحاد پر پڑا اس میں کوئی شک نہیں کہ (تیج) جتنا ہندوؤں میں مقبول تھا اتنا ہی مسلمانوں میں بھی ہر دل عزیز تھا گوپی ناتھ امن، میلا رام اور دھرم پال گپتا وفا کا کلام خصوصیت کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا۔ مگر ہندو مسلم اتحاد کے درمیان دھیرے دھیرے فاصلے بڑھتے گئے اور آخر میں دونوں کے درمیان اختلاف ہو ہی گیا۔

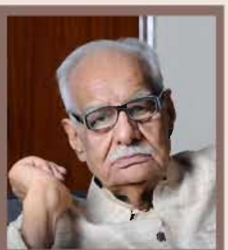

1947 میں ملک تقسیم ہوا اور اس تقسیم کے بعد عام طور سے یہ تصور ہونے لگا تھا کہ غیر مسلم صحافیوں کی اردو صحافت سے دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا جمنا داس اختر، پندت ہری چند اختر، تلوک چند محروم پھر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے موہن چراغی، چندر بھان خیال، نند کشور وکرم، جی ڈی ٹنڈن اور کلدیپ نیر ایسے صحافی ہیں جو انگریزی، اردو، ہندی کے مستند اور بین الاقوامی شہرت کے مالک صحافی ہیں جو اردو والوں کے لیے باعث فخر ہیں۔

1947 میں ملک تقسیم ہوا اور اس تقسیم کے بعد عام طور سے یہ تصور ہونے لگا تھا کہ غیر مسلم صحافیوں کی اردو صحافت سے دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا جمنا داس اختر، پندت ہری چند اختر، تلوک چند محروم پھر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے موہن چراغی، چندر بھان خیال، نند کشور وکرم، جی ڈی ٹنڈن اور کلدیپ نیر ایسے صحافی ہیں جو انگریزی، اردو، ہندی کے مستند اور بین الاقوامی شہرت کے مالک صحافی ہیں جو اردو والوں کے لیے باعث فخر ہیں۔

اردو صحافت میں گراں قدر خدمات انجام دینے میں منشی نوبت رائے کے (خدنگ نظر)، دیا نرائن نگم کے (زمانہ) کو فراموش کرنا اردو صحافت کے ساتھ جبر کرنا ہوگا زمانہ وہ رسالہ ہے جس نے پریم چند سے محبت کرنے کا سبق دیا اور اردو صحافت کے وقار کو بلند وبالا کیا۔ تقسیم کے بعد چند مقبول رسالے جو غیر مسلم صحافیوں کے زیر نگرانی تھے ان میں (مست قلندر)، (چترا)، اور (بیسویں صدی) کے نام قابل ذکر ہیں بیسویں صدی کے اڈیٹر رام رکھا مل خوشتر گرامی تھے جن کا کالم تیر ونشتر فرقہ پرستوں کو مجروح کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ دھیرے دھیرے اردو چلن کا اثر کم ہوتا گیا اور اسی اعتبار سے اردو صحافت کے میدان میں بھی غیر مسلموں کی تعداد متاثر ہوئی۔ پھر بھی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، شری نواس لاہوٹی، کشمیری لال ذاکر، امن راج سکسینہ، اودیش رانی باوا نے اردو صحافت سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔

آزادی سے قبل سب سے اہم اردو اخبار (قومی آواز) ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی اور حیات اللہ انصاری کی ادارت میں 1945 میں لکھنؤ سے جاری ہوا اس اخبار نے اردو میں جدید صحافت کی بنیاد ڈالی اور بہت سے معیارات قائم کیے۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اس میں صحافتی اصولوں کے ساتھ ساتھ کتابت، طباعت، سرخی اور تزئین کے ضابطے مقرر کیے گئے۔ چنانچہ بعد کے اخبارات نے تقریباً اسی طرز کو اپنایا اور اسی معیار پر چلنے کی کوشش کی جسے قومی آواز نے قائم کیا تھا اس کے دہلی، پٹنہ، سری نگر اڈیشن آج بھی جاری ہیں۔

الغرض محولہ بالا غیر مسلم صحافی اور رسائل کے جائزے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اردو صحافت کے آغاز وارتقا اور فروغ میں غیر مسلم صحافیوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

■

Mr. Hamid Raza Siddiqui, Research Scholar, Dept of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002 (UP)

محمد یوسف وانی

جدید اردو صحافت کے معمار حیات اللہ انصاری

حیات اللہ انصاری کی حیثیت جدید اردو صحافت میں ایک روشن اور درخشندہ ستارے کی ہے۔انھوں نے اردو صحافت میں بے شمار تجربے کرکے اسے انگریزی صحافت کے ہم پلہ بنانے کی غیر معمولی سعی کی۔ حیات اللہ انصاری نے صحافت کو ایک مشن سمجھ کر زبان کی خدمت کا بہترین وسیلہ بنایا۔ حیات اللہ انصاری نے اردو صحافت کو جذباتیت سے نکال کر حقیقت نگاری سے آشنا کیا، انھوں نے اداریہ نویسی کی ایک نئی طرح بنیاد ڈال کر مختصر ترین اداریے،شخصی اداریے اور قسط وار اداریے لکھ کر صوری اور معنوی اعتبار سے تجربات کر کے اردو صحافت کے میدان کو وسیع کیا۔انھوں نے کبھی اصولوں کا سودا نہیں کیا۔ حیات اللہ انصاری صحافت کو پیدائشی چیز کہہ کر اس کے لیے زبردست مطالعے اور محنت کو ضروری سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں:

’’موسیقی اور شاعری کی طرح صحافت بھی پیدائشی چیز ہے لیکن پیدائشی چیز تو صرف اور صرف خالص اہلیت ہوتی ہے جس کو ابھارنے اور جلا دینے کے لیے زبردست مطالعے اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔‘‘[1]

حیات اللہ انصاری کا صحافتی سفر سینتیس (37) برسوں پر محیط ہے۔انھوں نے 1937 میں ہفت روزہ ’ہندستان‘ کی ادارت سنبھالی۔ جو 1942 میں ’ہندوستان چھوڑ و‘ تحریک کے ساتھ بند ہوا۔ 1945 میں انھوں نے بانی مدیر، ’قومی آواز‘ کی حیثیت سے دوبارہ صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور 1971 تک اس اخبار کے مدیر رہے۔ انھوں نے 1972 سے 1976 تک کانگریس کے ہفت روزہ ترجمان ’سب ساتھ‘ کی ادارت کی اور ایوان بالا سے سبکدوشی کے بعد 1986 میں ’سچ رنگ‘ کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو زیادہ مدت تک نہیں چل سکا۔انھوں نے جوانی سے بڑھاپے تک اردو صحافت کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

ہفت روزہ ’ہندستان‘ جاری کرنے کی سرگرمیوں کا آغاز 1935 سے ہوا۔ رفیع احمد قدوائی، اچاریہ نریندر دیو اور ڈاکٹر عبدالعلیم پر مشتمل منیجنگ بورڈ نے تمام تر انتظامات کر کے حیات اللہ انصاری کی ادارت میں پنڈت نہرو کے مشورے سے جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اخبار لکھنؤ میں حضرت محل پارک کے سامنے’ محلہ شیر دروازہ‘ (آج کے ہوٹل کلارک کے بالکل سامنے) سے جاری ہوا، جہاں عبدالعلیم کی رہائش گاہ تھی۔ ہفت روزہ ’ہندستان‘ دسمبر 1937 میں جاری ہوا۔ اس کے منیجنگ ڈائریکٹر پروفیسر عبدالعلیم تھے۔ یہ اخبار 1937 سے جاری ہوکر 1942 میں بند ہوا۔ بقول عابد سہیل ’’یہ کانگریس کا نہیں پنڈت نہرو کا اخبار تھا۔‘‘[2]

’ہندستان‘ تاریخی اہمیت کا حامل اخبار تھا جس نے ہنگامہ خیز دور میں کانگریس کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ کسان، مزدوروں، غریبوں اور طلبہ کی آواز کو اجاگر کر کے کانگریس کو بائیں بازو کی سیاست کے قریب کیا۔اس کی فائلیں ’ایسوسی ایٹیڈ جرنلس‘ کی تباہی اور انگریزی راج کے مخالف ہونے کی وجہ سے محفوظ نہیں رہ سکیں لیکن کچھ فائلیں دستیاب ہیں۔ حیات اللہ انصاری نے اخبار ’ہندستان‘ کی پانچ سالہ ادارت میں اس کا معیار بہت بلند کیا۔جس میں معروف ادیبوں و دانشوروں مثلاً ڈاکٹر عبدالعلیم، سردار جعفری، جوش ملیح آبادی وغیرہ کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ جوش کی مشہور نظم ’ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب‘ بھی سب سے پہلے اسی اخبار میں چھپی تھی۔

حیات اللہ انصاری گاندھیائی طرز فکر کے دلدادہ تھے اور بچپن میں ہی گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد کے قائل ہوگئے تھے۔اسی فکر کو وہ ’ہندستان‘ میں بھی پروان چڑھا کر تحریک آزادی کی حمایت کرتے رہے۔اخبار’ ہندستان‘ کی پانچ سالہ ادارت کے دوران انھوں نے اس اخبار کو دوسرے اخبارات جیسے’سیاست‘،’الجمعیۃ‘، ’پرتاپ‘،’سویرا‘ وغیرہ کے ہم پلہ بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ ترقی پسند رسالہ ’نیا ادب‘ بھی اخبار ’ہندستان‘ میں شائع شدہ تخلیقات کو اپنے رسالے میں حوالے کے ساتھ شائع کرتا تھا۔ ’ہندستان‘ میں عالمی مسائل اور حالات پر ’دنیا کا حال‘ کے نام سے عبدالعلیم کالم لکھتے تھے۔ جو اس قدر مشہور ہوا کہ ’قومی آواز‘ کے اجرا کے بعد عشرت علی صدیقی اسی نام سے کالم تحریر کرنے لگے۔ حیات اللہ انصاری کی صحافتی زندگی میں ’ہندستان‘ کی ادارت بنیادی حیثیت رکھتی ہے جسے انھوں نے ’ریہرسل‘ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی وجہ سے انھیں ’قومی آواز‘ کے بانی مدیر کی ذمے داری عطا کی گئی۔ جہاں انھیں بے پناہ شہرت حاصل ہوئی اور ان کی صحافت کی مثال دی جانے لگی۔

1945 کے جداگانہ انتخابات سے پورے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان آپسی رسہ کشی کی وجہ سے دونوں پارٹیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی

پرزور کوشش کر رہی تھیں، نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے اتر پردیش میں مسلم اکثریتی حلقے کی وجہ سے لیگ کا زبردست زور تھا۔ دوسری طرف خلیق الزماں کا روزنامہ 'تنویر' لوگوں میں بے حد مقبول ہو چکا تھا جو کانگریس کی مخالفت اور مسلم لیگ کا پرچار کر رہا تھا۔ ہفت روزہ 'ہندستان' کے بند ہونے کے بعد اردو میں کانگریس کی ترجمانی کرنے والا کوئی اخبار نہیں تھا۔ 'نیشنل ہیرالڈ' اور 'نوجیون' بالترتیب انگریزی اور ہندی میں کانگریسی پالیسی کی ترجمانی کر کے زیادہ تر انگریزوں اور ہندوؤں کو اپیل کر رہے تھے۔ لیگ کے نظریات کا اثر مسلمانوں پر ہونے کی وجہ سے کانگریس پارٹی اردو اخبار کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہی تھی جو قومی آواز کی شکل میں سامنے آیا۔ حیات اللہ انصاری 1945 سے 1971 تک اس کے مدیر اعلیٰ رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے اس اخبار کے ذریعے اردو صحافت کو انگریزی کے ہم پلہ بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ معروف فکشن نگار، ادیب اور صحافی عابد سہیل لکھتے ہیں:

''حیات اللہ انصاری نے اردو صحافت کو نئے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس سلسلے کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے تو ایک دفتر درکار ہوگا لیکن مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خبروں کی پیشکش کو معروضیت آشنا بنایا۔ سادہ اور آسان اور مختصر جملوں پر اصرار کیا۔ صحافت کے میک اپ کو توازن کے آداب سکھائے، ایک سلسلے کی خبروں کو پاس پاس اور درمیانی جدول کے بغیر شائع کرنے کا گر سکھایا۔'' [3]

حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کی باگ ڈور اس وقت سنبھالی جب اردو صحافت پر تہمت لگا کر طرح طرح کے فقرے کسے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے تجربات اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اردو صحافت پر لگے دھبوں کو نہ صرف مٹایا بلکہ اردو صحافت کا لوہا بھی منوایا۔ ان کا 'قومی آواز' اپنے زمانے کا ایک مثالی اخبار تھا۔ لاہور کے ممتاز کمیونسٹ رہنما میاں افتخار الدین کو جب 'امروز' نکالنے کا خیال آیا تو لاہور سے ایک ٹیم قومی آواز کو دیکھنے کے لیے لکھنؤ آئی اور اسی طرز پر جب امروز نکلا تو منٹو نے کہا ''امروز دیکھ کر ایسا لگا کہ جیسے قومی آواز پڑھ رہا ہوں۔'' [4] یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ 'قومی آواز' کانگریس کا ترجمان اور مسلم لیگ کے مخالف کی حیثیت سے نہرو اور رفیع احمد قدوائی کی کوششوں سے جاری ہوا۔ حیات اللہ انصاری ایک پکے کانگریسی اور سچے گاندھی وادی تھے۔ انھوں نے اپنی 26 سالہ ادارت میں مسلم لیگ کا ڈٹ کر مقابلہ کر کے لیگ کے روزنامہ 'تنویر' کا اثر بہت جلد لوگوں (مسلمانوں) میں کم کیا اور مسلم لیگ کی خامیوں کو اجاگر کر کے کانگریس، نہرو اور گاندھی جی کی قومیت پرستی کی طرف راغب کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

حیات اللہ انصاری نے ٹیکس اور قیمتیں، پنشن اسکیم، بنک کا قومیانہ، پروفیسر مہالانوبس، بہادر کی عزت، مسلمان مسلمان ایک ہوں، جیسے اہم اور یادگار اداریے تحریر کیے۔ حیات اللہ انصاری نے اداریوں کے لیے مختلف اسالیب اختیار کیے۔ ان کے اداریوں میں حسرت، غصہ کے ساتھ ساتھ طنزیہ و مزاحیہ اسلوب بھی نظر آتا ہے۔ لکھنوی زبان کی رنگارنگی کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے اداریوں میں اشعار، مصرعوں، کنایہ، رعایت لفظی، تلمیح اور تشبیہ وغیرہ کو موقع کی مناسبت سے استعمال کیا۔ حیات اللہ انصاری نے ہمیشہ اظہار آزادیِ رائے کی پرزور وکالت کی۔ جماعت اسلامی سے شدید اختلاف کے باوجود انھوں نے پاکستانی حکومت کی اس

حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کی باگ ڈور اس وقت سنبھالی جب اردو صحافت پر تہمت لگا کر طرح طرح کے فقرے کسے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے تجربات اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اردو صحافت پر لگے دھبوں کو نہ صرف مٹایا بلکہ اردو صحافت کا لوہا بھی منوایا۔ ان کا 'قومی آواز' اپنے زمانے کا ایک مثالی اخبار تھا۔ لاہور کے ممتاز کمیونسٹ رہنما میاں افتخار الدین کو جب 'امروز' نکالنے کا خیال آیا تو لاہور سے ایک ٹیم قومی آواز کو دیکھنے کے لیے لکھنؤ آئی اور اسی طرز پر جب امروز نکلا تو منٹو نے کہا ''امروز دیکھ کر ایسا لگا کہ جیسے قومی آواز پڑھ رہا ہوں۔

پالیسی کی مخالفت کی جس کے تحت جماعت اسلامی پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ حیات اللہ انصاری نے قسط وار اداریے لکھنے کی روایت بھی قائم کی۔ وہ اداریے کے اوپر عنوان کے مطابق شعر بھی لکھا کرتے تھے۔ وہ اتر پردیش کے دور دراز گاؤں میں سائیکل پر جا کر لوگوں کے مسائل دیکھ کر ان کو اجاگر کرتے تھے، یہی حقیقت نگاری ان کی خاص پہچان بن گئی۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے 37 سالہ صحافتی دور میں اردو صحافت کو نئے نئے تجربات سے آشنا کیا۔ انھوں نے صحافتی اصول ایک رجسٹر میں قلم بند کر کے قومی آواز کے دفتر میں رکھا تھا۔ انھوں نے صحافتی تجربات کا آغاز ہفت روزہ 'ہندستان' سے 'و' حذف کر کے 'ہندستان' کے نام سے لکھ کر ایک منفرد تجربہ کر کے اس کے تاریخی دلائل پیش کیے۔ 'نیشنل ہیرالڈ' کا انوکھا ترجمہ 'قومی آواز' سے کیا۔ انھوں نے 'قومی آواز' کو نئے گیٹ اپ میں شائع کیا اور زبان کی رو سے املے کے تجربے کر کے آسان اور سادہ زبان استعمال کی، ہندی الفاظ کو کثرت سے استعمال کر کے عربی فارسی کے املے کے بجائے ہندستانی رسم الخط کو ترجیح دی۔ حالانکہ اس دوران وہ جدت پسندی کی آڑ میں انتہا پسندی کے شکار بھی ہوئے۔ جیسے وہ بین الاقوامی کو 'بین اقوامی' اور اسی طرح دوسرے الفاظ کا خود ساختہ املا لکھتے تھے اور عبدالماجد دریابادی و دیگر ادبا بار بار ان اغلاط کی نشاندہی بھی کرتے رہے۔ حیات اللہ انصاری نے عربی اضافتیں اور فارسی تراکیب سے کنارہ کشی کر کے اردو صحافت کے میدان میں نئے تجربات کر کے اس کا دامن وسیع کیا۔ حیات اللہ انصاری نے پہلی بار سرخیوں میں الفاظ کی تعداد کو مقرر کیا۔ انھوں نے ایک کالم کی سرخی کی پہلی سطر میں پانچ الفاظ، دو کالمی میں سات، سہ کالمی میں نو الفاظ مقرر کیے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے 'جناب' اور 'محترمہ'، ہندوؤں کے لیے 'شری'، 'شریمتی' جیسے القاب رائج تھے حیات اللہ انصاری نے مسٹر، مسز اور مس وغیرہ القابات اپنے اخبار میں رائج کیے۔ انھوں نے انٹرویو، پیراگراف اور خبر بنانے کے طریقے بھی وضع کیے۔ معروف صحافی قطب اللہ ان کے تجربات کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''حیات اللہ انصاری نے گیٹ اپ پر خاص توجہ دی اور اخبار کو جدید انگریزی اخبارات کی شبیہ دی۔ فلیش کے شروع پیراگراف کو پاشاں لکھوانا، خبر کی سرخی تیار کرنا، دو کالمہ یا تین کالمہ خبروں کو آمنے سامنے نہ لگنے دینا، دونوں کے درمیان ایک کالمہ خبر کا حد فاصل ہونا لازمی قرار دیا۔ دلچسپ اور اہم خبروں کو حلقے میں لکھوانا، تصاویر اور کارٹون کا استعمال ضروری قرار دیا۔ لیتھو کی طباعت میں تصاویر کا چھاپنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا لیکن اس پر حیات اللہ صاحب نے بڑے کامیاب تجربے کیے۔'' [5]

اس زمانے میں تصویر چھاپنا واقعی بہت مشکل کام تھا جو حیات اللہ انصاری نے بخوبی انجام دیا۔ قومی آواز کی فائلیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آج کے اخبارات کی تصاویر سے یہ تصاویر بہتر نہیں تو ہو بہو ضرور ہیں۔

حیات اللہ انصاری نے قومی آواز میں علمی، ادبی اور تحقیقی بحث کی بنیاد ڈالی۔ وہ کوئی 'موضوع' لکھ کر اس پر قارئین سے کھلی بحث کرنے کی دعوت دیتے تھے جب بحث طویل ہوجاتی تھی تو حیات اللہ انصاری اس فن کے ماہر کو حکم مقرر کر کے بحث کو ختم کر دیتے تھے۔ حکم کے فرائض اپنے وقت کے معروف ادیب، قلم کار، علما اور دانشوروں جیسے مولانا عبدالماجد دریابادی، مسعود حسین خان، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین وغیرہ نے انجام دیے ہیں۔ حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کے ذریعے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے

کی زبردست تحریک چلائی۔ انھوں نے پناہ گزینوں کے لیے 'اندھیر نگریوں' کے نام سے کالم شروع کرکے ان کے حقوق کی آواز اٹھائی۔ حیات اللہ انصاری نے دوسری زبانوں سے استفادہ کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا اور دوسری زبانوں کے محاورے، اصطلاحات، الفاظ اور استعارے استعمال کیے۔ انھوں نے 'شہ سرخی' کی اصطلاح رائج کی جو پہلے 'شہ خبر' کے نام سے معروف تھی۔ انھوں نے ڈرائنگ کی واقفیت والے ایک شخص کو قومی آواز میں ملازم رکھا جو کہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ شہ سرخی کا نچوڑ پہلے پیراگراف میں لکھنے کی بنیاد بھی حیات اللہ انصاری نے ہی ڈالی۔

قومی آواز اردو صحافت کا ایک منفرد اور مثالی اخبار تھا۔ اس اخبار کے کالموں میں انفرادیت اور نیا پن ہونے کی وجہ سے، نہ صرف یہ مقبول عام تھے بلکہ یہ کالم پرمغز، دلچسپ اور انتہائی معلوماتی بھی ہوتے تھے۔ جن میں کچھ اہم کالم مندرجہ ذیل ہیں۔ گلوریاں: (طنز و مزاح پر مشتمل)، مراسلات: (قارئین کے خطوط)، دنیا کا حال: (عالمی صورت حال پر مبنی)، عالم اسلام :(عالم اسلام کے حالات)، افکار معاصرین: (معاصرین کے افکار)، مضراب: (فلمی دنیا)، کتابوں کی باتیں: (نئی کتابوں کا تعارف اور تبصرہ)، ادبی ورق: (ادبی سرگرمیاں)، شہر نامہ : (شہری مسائل)، فروگذاشت: (کتاب پر تفصیلی گفتگو)، کارٹون، اور ضمیمہ۔

ہفتے میں ہر اتوار کو ضمیمہ پیش کیا جاتا تھا جس میں ملک کے ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں کی تخلیقات اور مضامین پیش کیے جاتے تھے۔ اس میں آل احمد سرور، عبدالماجد دریابادی، محمد حسن، نورالحسن ہاشمی، نیر مسعود، تحسین فراقی، عابد سہیل اور شمس الرحمن فاروقی وغیرہ کے مضامین اور تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ 'قومی آواز' میں اپنے دور کے بہترین قلمکار، صحافی اور ادیب خدمت انجام دے رہے تھے۔ جن میں عشرت علی صدیقی، محمد حسن قدوائی، عثمان غنی، قیصر تمکین، مسیح الحسن رضوی، عابد سہیل، مفتی رضا انصاری، عبدالمجیب سہالوی، احمد جمال پاشا، احمد ابراہیم علوی، وغیرہ شامل تھے۔ قیصر تمکین رقمطراز ہیں:

"میرا خیال ہے کہ قومی آواز کے علاوہ کسی دوسرے اخبار میں (کم از کم اس دور میں) اتنا ادب دوست، ترقی پسند اور تعلیم یافتہ عملہ کہیں نہیں تھا۔"6

حیات اللہ انصاری کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ تعصب سے پاک تھے۔ اخبار 'قومی آواز' میں کانگریس کا ترجمان ہونے کے باوجود وہ بائیں بازو اور دوسری تنظیموں کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا بھرپور موقع دیتے تھے۔ بائیں بازو کی پارٹیوں کا جھکاؤ اگرچہ لیگ کی طرف تھا لیکن انھوں نے کبھی ان کے مضامین چھاپنے سے انکار نہیں کیا۔ قومی آواز کی ایک اہم اور بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی زبان اغلاط سے پاک تھی قطع نظر اس سے کہ 'مدیر اعلیٰ' نئی نئی اصطلاحات وضع کرنے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ اس میں سب ایڈیٹروں کی ایسی جماعت تھی جو باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے اسرار و رموز سے بھی واقف تھی۔ حیات اللہ انصاری نے اس پہلو کی طرف خصوصی توجہ کرکے اخبار کی زبان کو عام فہم، سلیس اور سادہ بنایا جو اس اخبار کی ایک بڑی خوبی مانی جاتی تھی۔ انھوں نے سرسید احمد خان کے نظریہ لسان کی پاسداری کرکے آسان اور سلیس اسلوب نثر کو رائج کیا۔ سہیل وحید لکھتے ہیں:

"قومی آواز نے اس روایت کے تحت زبان کو آسان بنانے کی پاسداری اور عمل آوری کرنے کا فیصلہ کیا اور اردو میں صحافتی

حیات اللہ انصاری نئی نئی اصطلاحیں اور تراکیب وضع کرنے، زبان میں نئے تجربات کر کے اسے رنگین بنانے، نیا املا رائج کرنے اور خود ساختہ ترجمہ کر کے اردو کا دامن وسیع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن جدت کے جوش میں کبھی کبھی املا کے معاملے میں اُن سے کچھ لغزشیں بھی ہوئیں۔ حیات اللہ انصاری نے مولانا عبدالماجد دریا بادی سے ٹکر لے کر واقعی اپنے اوپر زیادتی کی تھی۔ انھوں نے بقول میر 'اس بھاری پتھر کو چوم کے چھوڑدیا'۔ حیات اللہ انصاری کی 'قومی آواز' سے خاموش سبکدوشی پرمولانا نے 'صدق جدید' میں بے لاگ تجزیہ کرکے ان کی خدمات اور صلاحیتوں کو جہاں سراہا وہیں 'قومی آواز' سے اُن کی قبل از وقت اور خاموشی سے سبکدوش ہونے پر افسوس بھی کیا۔

زبان کی بنیاد ڈالی۔ اپنی پہلی اشاعت سے ہی اس نے ہر قسم کے القاب و آداب کو ختم کیا۔ غیر ضروری عبارت آرائی کو یکسر فراموش کرکے خیالات و تصورات کو مع دلائل پیش کیا۔ کسی بھی قسم کی خوشنمائی سے کنارہ کشی اختیار کی۔ دانستہ اور شعوری طور پر زبان کو آسان بنانے، عام آدمی کی سمجھ میں آجانے والی سادہ اور معیاری زبان رائج کرنے کی کوشش کی۔"7

قومی آواز کی اشاعت سے پہلے روزنامہ 'تنویر' کا طوطی بول رہا تھا۔ حیات اللہ انصاری نے اس سے کانٹے کی ٹکر لے کر 'قومی آواز' کو اتنا بااثر اور ہردلعزیز بنایا کہ لوگ تنویر کا نام تک بھول گئے۔ حیات اللہ انصاری کے دورِ صحافت میں عبدالماجد دریابادی 'صدق جدید' نکالتے تھے۔ ان دونوں کے بیچ زبردست معرکہ آرائی رہتی تھی لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کی قدر بھی کرتے تھے۔ 'صدق جدید' کے شذرات کا حیات اللہ انصاری قومی آواز میں جواب دیتے تھے۔ بحث زیادہ تر اصطلاح سازی پر ہوتی تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اکثر 'قومی آواز' کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ جن کا حیات اللہ انصاری اپنے اخبار میں جواب دیتے تھے۔ غلط املا، نئی اصطلاحات اور انگریزی سے اردو میں غلط ترجمے پر عبدالماجد صاحب سخت نوٹس لیتے تھے۔ حیات اللہ انصاری نئی نئی اصطلاحیں اور تراکیب وضع کرنے، زبان میں نئے تجربات کرکے اسے رنگین بنانے، نیا املا رائج کرنے اور خود ساختہ ترجمہ کرکے اردو کا دامن وسیع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن جدت کے جوش میں کبھی کبھی املا کے معاملے میں اُن سے کچھ لغزشیں بھی ہوئیں۔ حیات اللہ انصاری نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے ٹکر لے کر واقعی اپنے اوپر زیادتی کی تھی۔ انھوں نے بقول میر 'اس بھاری پتھر کو چوم کے چھوڑ دیا'۔ حیات اللہ انصاری کی 'قومی آواز' سے خاموش سبکدوشی پر مولانا نے 'صدق جدید' میں بے لاگ تجزیہ کرکے ان کی خدمات اور صلاحیتوں کو جہاں سراہا وہیں 'قومی آواز' سے اُن کی قبل از وقت اور خاموشی سے سبکدوش ہونے پر افسوس بھی کیا۔

حیات اللہ انصاری چھبیس سال تک 'قومی آواز' کے مدیر اعلیٰ رہنے کے بعد 1971 میں سبکدوش ہوئے۔ حیات اللہ انصاری نے 1976 تک 'سب ساتھ' کی ادارت کی۔ ایوان بالا سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے 1986 میں 'سچ رنگ' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا لیکن بڑھاپے کی وجہ سے وہ اس بار گراں کو زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکے 'سچ رنگ' کے 1988 میں بند ہونے کے ساتھ حیات اللہ انصاری کا 37 سالہ صحافتی سفر بھی اختتام کو پہنچا۔

حوالہ جات:

1. حیات اللہ انصاری، 'شذرات'، مشمولہ، اردو صحافت، مرتب، انور علی دہلوی (اردو اکادمی دہلی 1987) ص 210
2. عابد سہیل، 'حیات اللہ انصاری'، خبرنامہ لکھنؤ، مئی 2011 جلد 39، شمارہ 11، ص
3. ایضاً، ص 8
4. نافع قدوائی، حیات اللہ انصاری (ساہتیہ اکادمی دہلی، 2006) ص 45
5. قطب اللہ، 'حیات اللہ انصاری اپنے تجربات کے آئینے میں'، دو ماہی اردو اکادمی، لکھنؤ، نومبر تا اپریل 2000,2001 دور دوم، نمبر 3,4,5 ص 81
6. قیصر تمکین، خبر گیر (اورینٹ پبلشرز اردو بازار لاہور جون 1987) ص 30
7. سہیل وحید، صحافتی زبان (اعلیٰ، پریس دہلی 1996) ص 189

■

Mohd Yousuf Wani, Research Scholar, Dept. of urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025, Mob.: 9971327247

اسعد فیصل فاروقی

طبی صحافت کے ذریعے فروغ اردو

موجودہ طبی رسائل و جرائد کے حوالے سے

تحقیقی و تاریخی اعتبار سے اردو میں طبی صحافت کی روایت تقریباً ڈیڑھ سو سالہ قدیم ہے، ان ڈیڑھ سو برسوں میں جہاں طبی صحافت نے اردو کی خدمت کی اور اس میں نئی نئی طبی و فنی اصطلاحات کو پیش کیا تو وہیں اردو کو جدید طب سے روشناس کر کے اس کو ایک زندہ اور فنی اعتبار سے پختہ زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ویسے اردو میں تخصیصی طبی صحافت کی ابتدا 1855 سے ہوتی ہے جب حیدرآباد سے اردو کے اولین طبی رسالے 'رسالہ طبابت' کی اشاعت ڈاکٹر جارج اسمتھ کی ادارت میں شروع ہوئی، لیکن اس سے پہلے 1848 میں دہلی کالج کے مطبع العلوم سے ایک سہ موضوعاتی (جس میں طب، تاریخ اور قانون، سے متعلق مضامین درج ہوتے تھے) پندرہ روزہ اخبار تحفۃ الحدائق کی اشاعت کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ تحفۃ الحدائق کا ذکر 1848 کی سرکاری رپورٹ میں بھی ہے علاوہ ازیں قران السعدین کے جون 1848 کے شمارے میں بھی اس کا ایک اشتہار شائع ہوا تھا جس سے اس کے موضوع کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ افسوس تحفۃ الحدائق کا کوئی بھی شمارہ برصغیر کی کسی بھی لائبریری میں موجود نہیں۔ طبی صحافت کی تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ماضی میں طبی صحافت نے عوام میں صحتمند زندگی کو فروغ دینے کے لیے سرگرم حصہ لیا، اور ہندوستان کے قریے قریے سے طبی رسائل جاری ہوئے۔

اکیسویں صدی میں طبی صحافت کو نا صرف تحقیق و مطالعے کا ایک موضوع تسلیم کیا گیا بلکہ اس کا شمار جدید پروفیشن کے طور پر بھی ہونے لگا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں جیسے جیسے طبی سائنس ترقی کر رہی ہے اور طب و صحت کے میدان میں نئی نئی ایجادات و انکشافات بھی رونما ہو رہے ہیں اسی طرح سے طبی صحافت کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس سلسلے سے نئے تحقیقی طبی رسائل نا صرف انگریزی بلکہ مقامی زبانوں میں بھی شائع ہوئے ہیں بلکہ عوامی صحت کو بہتر بنانے کی غرض سے پاپولر (عوامی) طبی رسائل میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

دنیا کے سب سے مشہور و معروف طبی جامعات مثلاً ہارورڈ میڈیکل اسکول، آکسفورڈ و کیمبرج سے منسلک میڈیکل اسکول اور خود ہندوستان کے مختلف طبی اسکول اور ادارے اپنے طبی رسائل و جرائد شائع کرتے ہیں تاکہ عوام طب میں ہونے والی ترقی سے آشنا ہوں اور ان اداروں کے ذریعے طب و صحت سے متعلق جو کام انجام دیا جا رہا ہے ان کی معلومات عوام تک پہنچائی جا سکے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اردو میں طبی صحافت ایک تحقیق طلب اور طویل و وسیع موضوع ہے، جس کے ساتھ اس مختصر سے مقالے میں انصاف نہیں کیا جا سکتا جس کا مجھے پورا احساس ہے۔ لیکن یہاں پر موضوع کی مناسبت سے فی الوقت ملک کے طول و عرض سے شائع ہونے والے موجودہ طبی و نیم طبی رسائل کا اجمالی جائزہ سنہ اشاعت کے حساب سے پیش کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہمدرد، دہلی

دہلی سے شائع ہونے والا دیسی طبوں کا ترجمان 'ہمدرد' نصف صدی سے اردو و ہندی میں دیسی طبوں کے فروغ میں سرگرم ہے۔ یہ موجودہ شائع ہونے والے طبی رسائل میں سب سے قدیم رسالہ ہے جس کی اشاعت حکیم عبدالحمید مرحوم نے 1957 میں شروع کی تھی۔ موجودہ وقت میں اس کے مدیر حماد احمد ہیں۔ اس رسالے کی اشاعت کا خاص مقصد پاپولر صحتی و طبی مضامین کے ذریعے اردو و ہندی بستیوں میں صحت و طب سے متعلق شعور پیدا کرنا نیز یونانی طب میں ہونے والی سرگرمیوں کی تشہیر ہے۔ ایک ہی شمارہ میں اردو و ہندی کے لیے صفحات مختص کیے گئے ہیں۔ اصل میں یہ رسالے ہمدرد (وقف) کی جانب سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کا سائز 28 x 19 سینٹی میٹر اسکوائر ہے اور یہ 32 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔

اس کے مشمولات میں مختلف امراض کی تفصیل اور اس کے دیسی علاج کے ساتھ اس میں یونانی طبی سرگرمیوں کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے نیز آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے مختلف اجلاس کی کارروائی کی رپورٹ بھی وقتاً فوقتاً پیش کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں الگ الگ کالم میں جدید طبی خبروں اور طب میں ہونے والی جدید تحقیقات پر بھی سیر حاصل معلومات کو بھی درج کیا جاتا ہے۔ اس میں قارئین کے ذریعے پوچھی گئی بیماریوں کے علاج و پرہیز کو بھی بتایا جاتا ہے۔

نوائے طب و صحت، الہ آباد

'نوائے طب و صحت' ایک ایسا معیاری سہ ماہی طبی رسالہ ہے جو تقریباً 30 سال سے حکیم ایم عرفان علیمی کی ادارت میں الہ آباد (یوپی) سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ رسالے کا سائز 24 x 18.2 سینٹی میٹر اسکوائر ہے اور یہ 48 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو طب یونانی میں شائع ہونے والے رسائل میں ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ یہ پاپولر طبی مضامین کے ساتھ ساتھ یونانی طب کے تحقیقی مقالات (ریسرچ پیپرس) کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ اس کو ہم نیم تحقیقی جرنل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا زیادہ تر مضامین یونانی طب میں ہونے والی جدید تحقیق پر مشتمل ہوتے ہیں جن کو طب یونانی کے ریسرچ اسکالر تحریر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو یونانی طب میں ایک خاص نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ رسالے میں ایسے مضامین کو بھی جگہ دی جاتی ہے جو کہ موجودہ زمانے میں یونانی طب کی تشہیر و فروغ کے لیے لائحہ عمل بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں یونانی طبی اداروں میں ہونے والے تربیتی پروگراموں، کانفرنسوں اور جلسوں کی رپورٹوں کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔

'نقد و نظر' کالم کے تحت ہر شمارہ میں طبی کتاب کا تبصرہ بھی کیا

جاتا ہے۔ آخری صفحات پر ایک کالم 'طبی خبرنامہ' کے عنوان سے موجود ہوتا ہے جس میں بالخصوص یونانی طبی شخصیات سے متعلق خبروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ یونانی ادویہ کے اشتہارات بھی دیے جاتے ہیں۔

طبی ڈائجسٹ الشفا، دہلی

'الشفا' صحت عامہ سے متعلق ایک منفرد پاپولر یونانی طبی اردو میگزین ہے جو سید اعجاز حسین کی زیر ادارت پچھلے 20 برسوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے کا سائز 20x30 سینٹی میٹر اسکوائر ہے اور یہ 64 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔

اس رسالے کو شائع کرنے کا مقصد عوام میں یونانی طب کو فروغ دینا ہے اس لیے یہ رسالہ ایسے طبی موضوع کا احاطہ کرتا ہے، جو عوام کو صحت کے سادہ اصولوں کے بارے میں معلومات پہنچا سکے تاکہ عام آدمی اور اس کے اہل خانہ ایک صحت مند خوش و خرم زندگی گذار سکیں۔ اس رسالے میں سب کی سمجھ میں آنے والے بیش قیمت، مفید، دلچسپ اور معلوماتی طبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان مضامین میں نونہالوں، نوجوانوں اور بزرگوں کی صحت، جڑی بوٹیوں، امراض و علاج، غذا، حفاظت قلب، خواتین کی صحت، حسن، ذہنی امراض، ورزش، نفسیات اور مختلف امراض کے جدید و قدیم نسخے جیسے موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس رسالے کے اب تک کئی خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں ان میں ذیابیطس نمبر، حکیم عبدالحمید نمبر، حکیم محمد سعید نمبر وغیرہ شامل ہیں۔

فکر صحت، رامپور

'فکر صحت' محمد عاصم راجہ کی ادارت میں تقریباً پچھلے اٹھارہ انیس سال سے رامپور سے شائع ہونے والا ایک اہم ماہانہ پاپولر طبی میگزین ہے، جو جنوری 1996 کو جاری ہوا۔ رسالے کا سائز 24 x 18.2 سینٹی میٹر اسکوائر ہے اور یہ 40 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ پاپولر طبی رسالہ یونانی طب کے مضامین کے ساتھ ساتھ جدید زمانے کی نفسیاتی بیماریوں اور جدید طب کے مضامین کا احاطہ بھی کرتا ہے۔

ہر شمارے میں کسی خاص جسمانی و معاشرتی بیماری کے موضوع پر اداریہ 'ہماری بات' تحریر ہوتا ہے نیز آخر کے صفحات میں 'اخبار صحت' کے عنوان سے جدید طبی خبروں کو جگہ دی جاتی ہے۔ رسالے کا سرورق رنگین و جاذب نظر ہوتا ہے۔

راحت و صحت، دہلی

یہ رسالہ ڈاکٹر جوہر قاضی کی ادارت میں جون 1995 میں کلاں محل دریا گنج دہلی سے جاری ہوا، رسالے کے طابع و ناشر قاضی محمد تحسین ہیں۔ رسالے کا سائز 24x16 مربع سینٹی میٹر ہے اور یہ تقریباً 64 صفحات پر مشتمل رہتا ہے۔

'راحت و صحت' کے مستقل مشمولات میں ابتدا فرمان رسول سے ہوتی ہے۔ 'گفتگو' کے ذریعے مدیر قارئین کے سامنے اپنی بات کو رکھتا ہے۔ نیز 'چمن خیال' کے ذریعے قارئین اپنی بات کو رسالے تک پہنچاتے ہیں۔ مضامین علاج معالجہ، صحت کے اصول، مختلف امراض کے بارے میں معلومات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ آخر میں طبی مشورے کے عنوان سے ایک کالم ہوتا تھا جس میں قارئین و مریض اپنی بیماریوں کے سلسلے میں حکیم صاحب سے مشورے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ راحت و صحت کے کئی شمارے خصوصی نمبرات کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔

ماہنامہ احمد ٹائمز، حیدرآباد

'احمد ٹائمز' اردو اور انگریزی میں حیدرآباد (دکن) سے شائع ہونے والا ایک ذولسانی ماہانہ طبی رسالہ ہے، جو انور علی خاں کی ادارت میں احمد اینڈ کمپنی یونانی فارمیسی کے بینر تلے شائع ہوتا ہے۔ رسالے کا سائز 24 x 17.2 سینٹی میٹر اسکوائر ہے اور یہ 32 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ انور علی خاں جو احمد اینڈ کمپنی یونانی فارمیسی کے مالک ہیں، نے یہ رسالہ اپنے والد گرامی کے نام سے اپریل 1999 سے شائع کرنا شروع کیا تاکہ حیدرآباد و قرب و جوار میں طب یونانی کو فروغ دیا جا سکے۔ ان کے والد حکیم احمد علی خاں کا شمار حیدرآباد کی اہم طبی شخصیات میں ہوتا ہے۔

یہ جریدہ صوری اور معنوی اعتبار سے اردو میں معیاری، معلوماتی، مفید اور بین الاقوامی طرز کا تحقیقی جرنل ہے، جس میں مشہور و معروف اطبا، اور طبی محققین کے معلوماتی و تحقیقی مقالات و مضامین شائع ہوتے ہیں، جو اس جرنل کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک جانب جہاں اس میں جدید طبی امراض مثلاً سوائن فلو، سارس وغیرہ کے اسباب و علاج پر طب یونانی کے نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے تو دوسری جانب اس میں طب قدیم کے مختلف موضوعات پر بھی تحقیقی مقالات و مضامین کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔

اس رسالے کا اصل مقصد عوام میں صحت سے متعلق شعور کو فروغ دینا ہے، اس رسالے میں عام اور پیچیدہ امراض پر مستند اطبا و ڈاکٹروں کے سیر حاصل مضامین اور علاج کے طریقے، نیز مختلف امراض سے بچنے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر تدابیر شائع کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں مشہور و ممتاز اطباء و ڈاکٹروں کے دلچسپ انٹرویوز کی اشاعت بھی وقتاً فوقتاً عمل میں آتی ہے۔ جہاں مشمولات میں ایک جانب یونانی طب کے مختلف موضوعات کو جگہ دی جاتی ہے تو دوسری جانب جدید طبی تحقیق پر بھی مضامین شامل رہتے ہیں۔ 'مختصر نسخے طب نبویؐ سے' کے کالم کے تحت کسی ایک بیماری کا حدیث نبویؐ کی روشنی میں علاج درج کیا جاتا ہے۔ 'طبی چٹکلے' کے کالم کے تحت مختلف امراض کے تدارک کے لیے ہونے والی جدید طبی تحقیق کو بیان کیا جاتا ہے۔ آخر میں ایک کالم 'طبی و تحقیقی سرگرمیاں' کے عنوان سے بھی شامل ہوتا ہے جس میں طبی لکچرس، سمینار، اجلاس علاوہ ازیں طبی خبروں کو جگہ دی جاتی ہے۔

جہان طب، دہلی

سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (وزارت صحت و خاندانی بہبود) حکومت ہند کا قائم کردہ ایک خودمختار یونانی طبی ادارہ ہے جو طب یونانی میں ہمہ جہت تحقیق و ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس سلسلے میں اس نے بہت سے روشن اور تابناک نقوش قائم کیے ہیں۔ کونسل کے تحت جہاں ایک طرف طب کی قدیم کتابوں کا اردو ترجمہ ہوا بلکہ نئے سرے سے ان پر تحقیقی کام کی ابتدا بھی ہوئی۔ دوسری جانب کونسل کے ذریعے اردو زبان میں ایک سہ ماہی طبی و علمی جریدہ 'جہان طب' پچھلے پندرہ سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس جریدے کا اولین شمارہ جون اگست 1999 کو ڈاکٹر خالد صدیقی کی ادارت میں منظر عام پر آیا، جنھوں نے تقریباً گیارہ برس اس کی ادارتی ذمے داری کو سنبھالا اور اس کو ایک معیاری بین الاقوامی طبی جرنل کے طور پر تسلیم کرایا۔ آج کل جہان طب کے مدیر حکیم شاکر جمیل ہیں۔

یہ جریدہ صوری اور معنوی اعتبار سے اردو میں معیاری، معلوماتی، مفید اور بین الاقوامی طرز کا تحقیقی جرنل ہے، جس میں مشہور و معروف اطباء اور طبی محققین کے معلوماتی و تحقیقی مقالات و مضامین شائع ہوتے ہیں، جو اس جرنل کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک جانب جہاں اس میں جدید طبی امراض مثلاً سوائن فلو، سارس وغیرہ کے اسباب و علاج پر طب یونانی کے نقطۂ نظر سے، بحث کی جاتی ہے تو دوسری جانب اس میں طب قدیم کے مختلف موضوعات پر بھی تحقیقی مقالات و مضامین کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔

اس جرنل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یونانی طب سے متعلق عام شماروں کے علاوہ کسی خاص موضوع پر خصوصی شمارہ وقتاً فوقتاً شائع کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلے سے اب تک یہ یونانی طب سے متعلق بہت سے خصوصی شمارے جیسے کہ ابن سینا نمبر، تکمیل الطب کالج نمبر، حکیم عبدالحمید نمبر، رازی نمبر، حکیم افتخار الحق تکمیلی نمبر، سلور جبلی نمبر، یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد نمبر، علاج بالغذاء نمبر وغیرہ شائع کر چکا ہے۔

ترجمان اصلاحی، بمبئی

'ترجمان اصلاحی' کا شمار ایک عوامی یعنی پاپولر طبی و سماجی رسائل میں ہوتا ہے، جو اکتوبر 2004 سے اصلاحی دواخانہ ممبئی سے حکیم محمد طارق اصلاحی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے، یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے۔

رسالے کے مشمولات طبی، سماجی و دینی مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں جو کہ ملک کے مشہور اطبا و حکما کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ 'حکیم صاحب سے پوچھیے' کے عنوان کے تحت سوال جواب کا ایک کالم ہوتا ہے جس میں قارئین کے ذریعے صحت اور علاج و معالجہ سے متعلق پوچھے گئے سوالات کے جوابات حکیم صاحب

کے ذریعے دیے جاتے ہیں۔ آخری صفحے پر 'خبرنامہ اصلاحی' کے تحت 'طبی خبریں درج کی جاتی ہیں۔ رسالے میں جگہ جگہ اصلاحی دواخانہ سے تیار شدہ ادویہ کے اشتہارات کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔اس رسالے کے اب تک کئی خصوصی نمبر مثلاً اطبا نمبر، سالگرہ نمبر کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔

یونی میڈ، علی گڑھ

یونی میڈ ایک ششماہی تحقیقی جریدہ ہے، جو اپریل۔ ستمبر 2005 سے پروفیسر خالد زماں خاں کی ادارت میں شعبہ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے شائع ہورہا ہے۔اس کے شریک مدیر ڈاکٹر ایف ایس شیرانی اور معاون مدیر فاروق احمد ڈار ہیں۔ اصل میں یہ ایک ششماہی تحقیقی جرنل ہے جس میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یونانی طب سے متعلق تحقیقی مقالات ومضامین کے لیے جگہ مختص کی گئی ہے۔ رسالے کے اولین شمارے کے اداریے میں مدیر رسالہ رقمطراز ہے:

''فی زمانہ علوم وفنون ترقی کی انتہا کو چھو رہے ہیں اور طبی ترقیات بھی اپنے عروج کا مظہر ہیں۔ عرصہ سے اس امر کی ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ اجمل خاں طبیہ کالج اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے معیاری طبی مجلہ شائع کرے۔ مجھے خوشی ہے کہ کلیات کو جس طرح طبی نظام میں اولیت وفوقیت حاصل ہے اور جو طب کے دیگر شعبوں کو اساس فراہم کرتا ہے اس کام کا بیڑا بھی اس شعبے نے اٹھایا اور آج یونی میڈ کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس مجلہ کو عصری تقاضوں کے پیش نظر اردو وانگریزی زبان میں پیش کیا جارہا ہے۔اس میں تحقیقی مقالات بھی ہیں اور عام معلوماتی بیانیہ مضامین بھی تاکہ دانشوروں واصحاب فن کے علاوہ طب سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص کے ذوق کی بھی تسکین ہوسکے۔''

میڈیکل زون، بنگلور

'میڈیکل زون' بنگلور سے شائع ہونے والا ایک طبی وسائنسی پاپولر ماہانہ رسالہ ہے، جو 2005 میں جاری ہوا۔اس کے مدیر ڈاکٹر وائی ایس خاں ہیں۔ یہ رسالہ نا صرف طبی شعبے کی جدید معلومات سے مزین ہے بلکہ اپنے اندر انسانی جسم، چرند پرند، جانور، اور خلا سے متعلق بیش بہا قیمتی مواد بھی سموئے ہوئے ہے۔اس میں مشہور شخصیات کا تعارف تصویر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی ایک عظیم طبیب یا سائنسداں کی مختصر سوانح اس کی طبی وسائنسی خدمات کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔ رسالے میں سائنسی سوال وجواب کا کالم بھی موجود ہوتا ہے۔ رسالہ اب تک کئی خصوصی نمبر بھی شائع کرچکا ہے مثلاً اجمل نمبر۔ آخری چند صفحات انگریزی میں طبی وسائنسی مضامین کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔

نقش میڈیکل، پونہ

'نقش میڈیکل' ایک پاپولر طبی رسالہ ہے، جو کہ قاسم زبیری کی ادارت میں پمپری، پونہ سے تقریباً چھ سال سے شائع ہورہا ہے، رسالے کا اولین شمارہ 'میڈیکل ٹائمز' کے نام سے نومبر-جنوری 2007 میں شائع ہوا، لیکن دوسرے ہی شمارے سے اس کا نام تبدیل کرکے 'نقش میڈیکل' کردیا گیا اور اسی نام سے شائع ہورہا ہے۔ یہ رسالہ یونانی طب اور جدید طب سے متعلق بھرپور معلومات سے مزین ہے، ہر مضمون کو رنگین تصاویر کے ساتھ خوبصورت انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔اس میں مختلف ادویاتی پودوں، پھلوں، سبزیوں سے متعلق مضامین جدید طبی تحقیق کے ساتھ قارئین کی نذر کیے جاتے ہیں نیز جدید طب میں ہونے والی ترقی اور اس میں استعمال ہونے والے آلہ جات

پر بھی قیمتی معلومات درج کی جاتی ہے۔ رسالے میں جدید دور کے نفسیاتی وذہنی امراض اور اس کے ازالے اور تدارک کی اقدامات کے بارے میں سیر حاصل معلومات ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اس میں سائنس، حیوان، چرند وپرند پر بھی بیش بہا معلومات پیش کی جاتی ہے۔ رسالے کا سرورق رنگین اور اندرونی صفحات پر پیش کیے گئے خصوصی مضامین سے مناسبت رکھتا ہے۔

(12) مسائل دین ودنیا اور طب، دہلی

مسائل دین ودنیا اور طب نئی دہلی سے 2008 میں عبدالحی کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ دینی معلومات سے متعلق ہے، دوسرے حصے میں دنیاوی معلومات درج ہوتی ہیں اور تیسرا حصہ طبی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس میں طب کے مختلف عنوان کے تحت مضامین شامل ہوتے ہیں۔

رسالے میں 'خبرنامہ صحت' کے عنوان سے دنیائے طب سے متعلق خبریں ہوتی ہیں نیز اس میں تبصرہ کا کالم بھی ہوتا ہے جس میں مختلف کتابوں کے تبصرے پیش کیے جاتے ہیں۔

(13) الطب، ممبئی

یہ دوماہی رسالہ ڈاکٹر ایس ایم حسن ممبئی سے شائع کرتے ہیں، جوکہ اس کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر بھی ہیں۔ اس کے مینیجنگ ایڈیٹر حکیم دبیر عبدالقادر ہیں۔ دراصل یہ رسالہ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کا ترجمان ہے جوکہ عطار ونگ کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ 2004 سے 2008 تک صرف ہندی میں شائع ہوتا تھا۔ جنوری 2009 سے الطب کو اردو وہندی دونوں میں شائع کیا جانے لگا۔

رسالے کے مشمولات میں 'طب یونانی اور حالات حاضرہ، مختلف حکما کے مجربات، نیز مختلف صحتی ایشوز پر مضامین شامل ہوتے ہیں۔ نیز 'سوالات وجوابات'، ''تبصرہ'، طبی خبریں اور 'سوال آپ کے جواب ڈاکٹر کے' عناوین کے تحت مستقل مشمولات درج ہوتے ہیں۔

یہ ایک کلی طور پر دو ماہی یونانی طبی رسالہ ہے، سرورق رنگین خوبصورت اور طبی کانفرنسوں کی تصویر سے مزین ہوتا ہے۔

المختصر مندرجہ بالا وہ چند طبی رسائل ہیں جن کا میدان طب میں اہم رول رہا ہے، اس کے علاوہ بنگلور سے 'نقش عالم' کے نام کا ایک ماہنامہ بھی پندرہ سالوں سے حکیم محمد ادریس حبان رحیمی کی ادارت میں مستقل شائع ہورہا ہے، جس کا ایک بڑا حصہ طبی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔

لیکن ان طبی جرائد ورسائل کے علاوہ 'سائنس کی دنیا' (نئی دہلی)، 'اردو ماہنامہ سائنس' (نئی دہلی) 'اردو دنیا' (نئی دہلی)، 'یوجنا اردو' (نئی دہلی)، 'البلاغ' (ممبئی) اور 'تہذیب الاخلاق' (علی گڑھ) وغیرہ رسائل ہیں جو اپنے شمارے میں طبی مضامین کو جگہ ضرور دیتے ہیں۔ 'یوجنا' جوکہ اپنے خصوصی نمبرات اور حکومتی پالیسی اور منصوبوں کی وجہ سے قارئین میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس نے اکتوبر 2009 میں اپنا ایک خصوصی صحت نمبر 'گامزن صحت مند زندگی کی جانب' کے عنوان سے شائع کیا جس میں قومی صحت پالیسی، صحت مشن اور جدید صحتی مسائل اور ان کے تدارک پر معروف طبی ایکسپرٹ کے بیش قیمت مضامین کو جگہ دی تھی۔

ہمارے اردو اخبارات جیسے راشٹریہ سہارا (دہلی، یوپی، بہار)، سیاست (حیدرآباد)، منصف (حیدرآباد)، انقلاب (ممبئی/نئی دہلی) وغیرہ بھی طبی خبروں کو نہ صرف اچھی خاصی جگہ دیتے ہیں، بلکہ طبی مضامین کو بھی کثرت سے شائع کرتے ہیں تاکہ اردو عوام طب میں ہونے والی پیش رفت، اور مختلف قسم کی بیماریوں اور ان کے تدارک کی اقدامات سے بھی آگاہ رہیں۔

■

Asad Faisal Farooqui, 4/32 Badar Bagh, Near Bhamula Railway Crassing, Civil Line, Aligarh - 202002 (UP)
Mobile:09412595891
Email:asadfaisalamu@gmail.com,

سید فضل اللہ مکرم

اردو صحافت کوئز

(1) ہندوستان کا پہلا صحافی

(الف) جیمس آگسٹس ہکی (ب) جیمس بانڈ

(ج) جیمس بولٹس (د) جیمس تھامس

(2) ہندوستان کا پہلا مطبوعہ اخبار 1780 میں کلکتہ سے بزبان انگریزی شائع ہوا؟

(الف) کلکتہ جنرل اڈوائزر (ب) کلکتہ ایکسپریس

(ج) کلکتہ پریس (د) کلکتہ ٹائمس

(3) اردو کا پہلا اخبار

(الف) جام جہاں نما (ب) مراۃ الاخبار

(ج) قومی آواز (د) دہلی اردو اخبار

(4) اردو اخبار کا پہلا ایڈیٹر

(الف) مولانا آزاد (ب) منشی سداسکھ

(ج) ولیم پیٹرسن (د) جان گلکرسٹ

(5) اخبار 'جامِ جہاں نما' کلکتہ سے کب جاری ہوا؟

(الف) 27 مارچ 1822 (ب) 27 اپریل 1822

(ج) 27 مارچ 1823 (د) 27 جون 1824

(6) ہندوستان میں فارسی کے پہلے اخبار کا نام کیا تھا جس کے مدیر راجا رام موہن رائے تھے؟

(الف) اخبار فارس (ب) شمس الاخبار

(ج) مراۃ الاخبار (د) آئینہ اکبری

(7) شمالی ہند کا پہلا اور برصغیر کا دوسرا اردو اخبار کون سا تھا؟

(الف) دہلی نامہ (ب) دہلی اردو اخبار

(ج) دہلی اخبار (د) پیسہ اخبار

(8) ہندوستان کا پہلا شہید صحافی کون تھا؟

(الف) سرسید احمد خاں (ب) بہادر شاہ ظفر

(ج) شاہجہاں (د) مولوی محمد باقر

(9) 'دہلی اردو اخبار' کے مدیر مولوی محمد باقر کے فرزند تھے؟

(الف) محمد حسین آزاد (ب) ابوالکلام آزاد

(ج) جگن ناتھ آزاد (د) سرسید احمد خاں

(10) مدراس کا پہلا اخبار جو 1848 میں جاری ہوا؟

(الف) آفتاب عالم (ب) کوہ نور

(ج) الہلال (د) اعظم الاخبار

(11) اردو کا پہلا رسالہ کون تھا جو 1837 میں مرزاپور سے جاری ہوا؟

(الف) قران السعدین (ب) نوائے وقت

(ج) خیرخواہ ہند (د) فوائد الناظرین

(12) دہلی کالج کی طرف سے شائع ہونے والے 'فوائد الناظرین' کے مدیر کون تھے؟

(الف) مولوی محمد باقر (ب) ماسٹر رام چندر

(ج) نذیر احمد (د) محمد حسین آزاد

(13) اردو کا پہلا طبی رسالہ جو حیدرآباد دکن کا پہلا رسالہ ہے؟

(الف) اخبار طبابت (ب) رسالہ طبابت

(ج) طبیب (د) حکمت دکن

(14) 'زمانہ' کے مدیر تھے؟

(الف) پریم چند (ب) منشی نول کشور

(ج) دیانرائن نگم (د) ان میں سے کوئی نہیں

(15) وہ مشہور اخبار جس میں سرشار کا ناول 'فسانۂ آزاد' قسطوں میں شائع ہوا؟

(الف) اودھ اخبار (ب) کوہ نور

(ج) تہذیب الاخلاق (د) اعظم اخبار

(16) رسالہ 'دلگداز' کے مدیر کون تھے؟

(الف) مولانا عبدالحلیم شرر (ب) ماسٹر رام چندر

(ج) منشی سجاد حسین

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(17) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یا اخبار سائنٹفک سوسائٹی (1866) کے مدیر تھے؟

(الف) شبلی نعمانی (ب) ڈپٹی نذیر احمد

(ج) سید محمد (د) سید احمد خاں

(18) سرسید احمد خاں نے 1870 میں کون سا رسالہ جاری کیا؟

(الف) تہذیب الاخلاق (ب) تہذیب

(ج) معلم (د) ادیب

(19) وہ کون سا اخبار ہے جس نے باقاعدہ طور پر کارٹون شائع کیا؟

(الف) ملی گزٹ (ب) تہذیب

(ج) اودھ پنچ (د) اودھ نامہ

(20) اخبار انجمن پنجاب کے مدیر تھے؟

(الف) ڈاکٹر لائنز (ب) ماسٹر رام چندر

(ج) محمد حسین آزاد (د) حالی

(21) ظریفانہ صحافت میں کس اخبار کو بڑی اہمیت حاصل ہے؟

(الف) شگوفہ (ب) مسکراہٹ

(ج) اودھ پنچ (د) دہلی اردو اخبار

(22) رسالہ 'دلگداز' کب جاری ہوا؟

(الف) 1887 (ب) 1888

(ج) 1889 (د) 1890

(23) 'پیسہ اخبار' کس نے جاری کیا؟

(الف) پنڈت قلندر رام (ب) پنڈت رتن ناتھ سرشار

(ج) منشی محبوب عالم (د) منشی پریم چند

(24) اردو کا پہلا روزنامہ جو 1855 میں کلکتہ سے جاری ہوا؟

(الف) اردو گائیڈ (ب) اخبار جام جہاں نما

(ج) اخبار عالم (د) اخبار عام

(25) دکن کے پہلے روزنامے کا نام کیا ہے جسے سعید احمد زید بلگرامی اور سید حسن بلگرامی نے جاری کیا؟

(الف) پیک آصفی (ب) آئینہ آصفی

(ج) سخنوران محبوبیہ (د) سیاست

(26) مولانا حسرت موہانی نے کون سا مشہور ماہنامہ جاری کیا؟

(الف) اردوگزٹ (ب) گل تر

(ج) اردوئے معلیٰ (د) قلعہ معلیٰ

(27) 'زمیندار' کس کا اخبار تھا؟

(الف) مولانا ابوالکلام آزاد

(ب) مولانا محمد علی جوہر

(ج) مولانا ظفر علی خاں

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(28) مولانا جوہر نے 1913 میں کس مشہور اخبار کی شروعات کی؟

(الف) زمیندار (ب) ہمدرد

(ج) دکن ریویو (د) الہلال

(29) The Choice of Truck کس کا مشہور اداریہ ہے؟

(الف) محمد علی جوہر (ب) ظفر علی خاں

(ج) جواہر لعل نہرو (د) عبدالمجید

(30) مولانا آزاد نے 'الہلال' کب جاری کیا؟

(الف) 1912 (ب) 1915

(ج) 1914 (د) 1920

(31) ''لوگ ایک آنہ دے کر اخبار خریدتے اور ایک آنہ دے کر پڑھواتے تھے'' یہ شہرت کس اخبار کو نصیب ہوئی؟

(الف) مراۃ الاخبار (ب) زمیندار

(ج) ہمدرد (د) کامریڈ

(32) اردو کا پہلا مصور اخبار کون تھا؟

(الف) الہلال (ب) البلاغ

(ج) منصف (د) قومی آواز

(33) تحریک پاکستان کی نمائندگی کرنے والا اخبار تھا؟

(الف) سیاست (ب) نوائے وقت

(ج) زمانہ (د) کوہ نور

(34) اردو کا پہلا اخبار جس نے ٹیلی پرنٹر کا استعمال کیا؟

(الف) انقلاب (ب) خورشید پنجاب

(ج) احسان (د) محب ہند

(35) 'الجمعیت' کے مدیر کا نام تھا؟

(الف) سید امتیاز علی تاج

(ب) مولانا چراغ حسن حسرت

(ج) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (د) وزیر آغا

(36) 'الہلال' کی تعدادِ اشاعت کتنی تھی؟

(الف) پندرہ ہزار (ب) بیس ہزار

(ج) تیس ہزار (د) چالیس ہزار

(37) انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے مشہور ہفتہ اخبار کا نام کیا ہے؟

(الف) دعوت (ب) ہماری زبان

(ج) قومی زبان (د) اردو زبان

(38) 2005 میں کس اردو رسالے کے سو سال مکمل ہوئے ہیں؟

(الف) تہذیب الاخلاق (ب) رہنمائے تعلیم

(ج) آج کل (د) نگار

(39) سید ممتاز علی کی ادارت میں ہفت روزہ 'تہذیب نسواں' کس شہر سے شائع ہوتا تھا؟

(الف) لاہور (ب) حیدرآباد

(ج) دہلی (د) کلکتہ

(40) ہفت روزہ کریم الاخبار دہلی کے مدیر کون تھے؟

(الف) مولوی کریم الدین (ب) مولوی ابوالحسن

(ج) منشی دیوان چند (د) ماسٹر رام چندر

(41) ہندوستان میں پہلا مطبوعہ اخبار نکالنے کی کوشش کرنے والا کون تھا؟

(الف) منشی سدا سکھ (ب) ہری ہردت

(ج) ولیم بولٹس (د) جیمس تھامس

(42) مدینہ اخبار بجنور کے پہلے چیف ایڈیٹر کون تھے؟

(الف) امین احسن اصلاحی (ب) بدر جلالی

(ج) آغا رفیق بلند شہری (د) نور الحسن ذہین کرتپوری

(43) صغریٰ ہمایوں مرزا کس اخبار کی ایڈیٹر تھیں؟

(الف) النساء (ب) خاتونِ دکن

(ج) دوشیزہ (د) فردوس

(44) میر ناصر علی کس رسالے کے ایڈیٹر تھے؟

(الف) نیرنگ خیال (ب) نگار

(ج) دلگداز (د) تیرہویں صدی

(45) روزنامہ 'انقلاب' لاہور کے بانی مدیران کون تھے؟

(الف) مولانا غلام رسول مہر/مولانا عبدالمجید سالک

(ب) مولانا تاجور نجیب آبادی/سر عبدالقادر

(ج) بشیر احمد/راشد الخیری

(د) مولوی ممتاز علی/محمدی بیگم

(46) مولانا حسرت موہانی کا اخبار 'مستقل' کب سے شائع ہونا شروع ہوا؟

(الف) اکتوبر 1928 (ب) جون 1929

(ج) اپریل 1929 (د) مئی 1929

(47) مشہور و معروف رسالہ 'اردو' کس نے جاری کیا؟

(الف) راشد الخیری (ب) نیاز فتح پوری

(ج) مولوی عبدالحق (د) ملا واحدی

(48) ماہنامہ 'کتاب' کہاں سے شائع ہوتا تھا؟

(الف) بنارس (ب) علی گڑھ

(ج) دلی (د) لکھنؤ

(49) سہ ماہی 'تناظر' کے مدیر کون تھے؟

(الف) بلراج ورما (ب) کمار پاشی

(ج) گوپال متل (د) دیویندر اسر

(50) 'نوائے ادب' کس انجمن کا ترجمان ہے؟

(الف) انجمن ترقی اردو ہند

(ب) اردو اکادمی، دہلی

(ج) انجمن ترقی پسند مصنفین

(د) انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

صحیح جوابات

1.الف	2.الف	3.الف	4.ب	5.الف
6.ج	7.ب	8.د	9.الف	10.د
11.ج	12.ب	13.ب	14.ج	15.الف
16.الف	17.د	18.الف	19.ج	20.ج
21.ج	22.الف	23.ج	24.الف	25.الف
26.ج	27.ج	28.ب	29.الف	30.الف
31.ب	32.الف	33.ب	34.ج	35.ج
36.ج	37.ب	38.ب	39.الف	40.الف
41.ج	42.د	43.الف	44.د	45.الف
46.الف	47.ج	48.د	49.الف	50.د

■

▪ متھن کمار

اردو افسانے میں دلت رجحان

اردو افسانہ اپنے صد سالہ سفر میں ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور اب مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ مابعد جدید ادب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ موضوعات اور مسائل جن پر سنجیدہ تخلیقات وتصنیفات نہیں سامنے آئی ہیں یا جو حاشیے پر پڑے ہیں اور کبھی مرکزیت حاصل نہیں کر سکی ہیں، ان کو مرکزیت عطا کرتی ہے۔ ظاہر ہے یہ بغیر سیاسی، سماجی اور تکنیکی انقلاب کے ممکن نہیں ہوا ہے۔

مابعد جدیدیت نہ صرف حاشیے کے ادب کو مرکزیت عطا کرتی ہے بلکہ ذہن کو نئے نئے پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کے لیے مجبور بھی کرتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اگر دلت ادب کی جڑوں کو تلاش کیا جائے تو 'بلیک لٹریچر' سے اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں خصوصاً مراٹھی زبان میں دلت ادب کے نقوش نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ دوسری زبانوں تک پہنچی۔ اردو میں ابھی دلت ادب کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے مگر امید ہے کہ آنے والے وقت میں اس طرف بھی اردو دانش وروں کی توجہ ہوگی۔ اردو کے افسانوی ادب میں دلت مسائل کے حوالے سے کچھ افسانوں کا ذکر اس مضمون میں پیش ہے۔

دلت لفظ کا مطلب ہے دلا ہوا، ستایا ہوا، پیسا ہوا، ٹوٹا ہوا، روندا ہوا، مسلا ہوا، تباہ و برباد کیا ہوا، انگریزی میں دلت کے لیے Depressed اور Downtrodden کا لفظ ملتا ہے۔ متعدد ماہرین نے 'دلت کون ہے' کی مختلف تعریفیں Schedule caste کی ہیں جن کا لب ولباب یہ ہے کہ 'ذات کی بنیاد پر جن کا صدیوں سے دلن اور استحصال ہوا، جن کو سماج میں سب سے نچلے پائدان پر رکھا گیا، جو ہر شعبہ ہائے زندگی میں محرومیوں کا شکار رہے، جن کو شودر اور اچھوت کہا گیا اور ہندوستانی آئین میں جو 'انوسوچت ذات کے دائرے میں آتے ہیں وہ دلت ہیں۔'' اردو افسانے میں دلت مسائل کی پہلی جھلک ہمیں پریم چند کے افسانوں میں ملتی ہے۔ اس کا سب سے اہم سبب ان کی دیہات کی زندگی کا تجربہ ومشاہدہ تھا۔ انھوں نے دیہی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

یوں تو وہ خود کائستھ تھے مگر ان کے افسانوں میں دلتوں کے تئیں ہمدردی جھلکتی ہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے اس جاگیردارانہ اور مہاجنی نظام 'ذات پات، اونچ نیچ، چھوا چھوت کے نظام سے نفرت اور غریبوں، دلتوں کے تئیں ہمدردی پیدا ہوتی ہے (کفن کو چھوڑ کر)۔

پریم چند کا افسانہ 'دودھ کی قیمت' چھوا چھوت کی بوسیدہ اور کھوکھلی روایت کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ بابو مہیش ناتھ کی بیوی کو بچہ ہوا تو 'بھنگی' اس کی جنائی اور دودھ پلائی دونوں تھی۔ بھنگی نے خود اپنے بیٹے منگل کو اپنا دودھ نہ پلا کر بابو صاحب کے بیٹے کو دودھ پلایا۔ جب تک بابو صاحب کا بیٹا چھوٹا تھا تب تک تو کسی نے اعتراض نہیں کیا لیکن جیسے ہی بچہ ایک سال کا ہوا، موٹے برہمن رام شاستری کو بچے کا بھنگی کے دودھ پینے پر اعتراض ہونے لگا اور وہ پرائشچت کی تجویز کرنے لگے۔ منگل کا ڈیرا ابھی مہیش بابو کے گھر کے کنارے نیم کے درخت کے نیچے تھا۔ پھٹے ہوئے ٹاٹ کا ٹکڑا، دو سکورے اور ایک دھوتی اس کا کل سرمایہ تھا۔ بابو صاحب کے گھر کے بچے کھچے کھانے سے اس کا گزارہ ہوتا ہے۔ باوجود اس کے اس میں ہمت وبغاوت کی کمی نظر نہیں آتی۔ کھیلتے ہوئے جب مہیش بابو کا بیٹا سریش اسے گھوڑا بننے کو کہتا ہے تو منگل انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جب تک تم اپنی پیٹھ پر مجھے نہیں بیٹھاتے میں گھوڑا نہیں بنوں گا۔

ہندوستانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ دلتوں کو صاف پانی پینے کے لیے بھی جد وجہد کرنی پڑی ہے۔ 'ٹھاکر کا کنواں' اسی موضوع پر لکھا ہوا افسانہ ہے۔ سماج کے فرسودہ رسم ورواج کا اس قدر بول بالا تھا کہ ہر طبقے کے لوگوں کے لیے الگ الگ کنواں ہوا کرتا تھا۔ کسی ٹھاکر کے کنویں سے کوئی دلت پانی نہیں لے سکتا تھا اور اس روایت شکنی کے عوض کڑی سزاؤں کا بھی تعیین کیا گیا تھا۔ گنگی ان سماجی پابندیوں سے پیدا شدہ اپنی مجبوری اور لاچاری سے تنگ آ کر اس نظام پر حملہ آور ہوتے ہوئے سورنوں کی اصل حقیقت اور سماجی حیثیت میں تضاد کا انکشاف کرتی ہے۔ ان کے قول اور فعل کا تضاد، ان کے ڈھونگ اور پونگے پن کو سامنے لاتی ہے۔

'نجات' بھی پریم چند کا اسی نوعیت کا افسانہ ہے۔ دلت طبقے کے شخص دکھیکی بیٹی کی سگائی کی ساعت پچارنے کے عوض پنڈت گھاسی رام اس سے اپنے گھر کا سارا کام کرواتا ہے۔ پورے گھر میں جھاڑو لگانا، دروازے کی صفائی، گوبر سے بیٹھک کی لپائی، کھلیان سے بھوسے کی ڈھلائی اور پھر ان سب کے بعد لکڑی کی ایک گانٹھ کی چرائی کا کام۔ اس کے بعد بھی خوشامد۔ دکھی نے لکڑی چیرنے کی کوشش تو بہت کی مگر اس کو چیر پانے میں کامیابی نہیں حاصل کر سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ لکڑی نہیں بلکہ ہندو سماج کے ذات پات کے نظام کو چیرنے اور ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر کامیاب نہیں ہو پاتا ہے۔

'گھاس والی' میں دلت عورتوں کو ٹھاکر کس طرح سے اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں، ان کی عصمتوں کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ بازار میں گھاس بیچ کر اپنا گزارا کرنے والی 'ملیا' بغاوتی تیور رکھتی ہے۔ جب ٹھاکر جین سنگھ اس سے 'دیا' مانگتا ہے تو خلافِ توقع ملیا اس کو جواب دیتے ہوئے کہتی ہے کہ اگر اسی طرح مہابیر (ملیا کا شوہر) تمھاری عورت کو چھیڑے تو کیسا لگے گا۔ اس سے آگے وہ جین سنگھ کی ذات والوں کی قلعی کھولتے ہوئے کہتی ہے کہ:

''بڑے بڑے گھروں کا حال جانتی ہوں۔ مجھے کسی بڑے گھر کا نام بتا دو جس میں کوئی سائس، کوئی کوچوان، کوئی پنڈت، کوئی مہاراج نہ گھسا بیٹھا ہو۔ یہ سبھی بڑے گھروں کی لیلا ہے۔ اور وہ عورتیں جو کچھ کرتی ہیں ٹھیک کرتی ہیں۔ ان کے مرد بھی تو چماریوں اور کہاریوں پر جان دیتے پھرتے ہیں۔ لینا دینا برابر ہو جاتا ہے''

'کفن' کے مادھو اور گھیسو بالکل ہی پچھڑی ذات کے کے کردار ہیں۔ مفلسی اور فاقہ کشی کے شکار قرض سے لدے ہوئے لیکن دنیاوی فکروں سے آزاد کردار۔ اس افسانے میں پریم چند کے نظریے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اردو افسانوں میں اگر کسی افسانے پر سب سے زیادہ بحث ہوئی ہے تو وہ ہے کفن۔ اس میں مادھو اور گھیسو کو بے حس اور آوارہ قسم کے کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

علی عباس حسینی کا افسانہ ’ہمارا گاؤں‘ بھی دلتوں کی مفلسی و بے چارگی کا مظہر ہے۔ گاؤں میں شیوخ اور نچلے طبقے کے افراد رہتے ہیں۔ شیوخ کا رنگ گندمی ہے اور دلتوں کا رنگ کالا۔ بھگوان کے یہ بندے جنھیں گاندھی جی نے ’ہریجن‘ کہا تھا چھوٹے چھوٹے بیالوں میں زندگی گزارنے کو مجبور ہیں۔ یہ غیر مہذب، نیچ انسانیت سے خالی اور تیسرے درجے کے آدمی ہیں۔

’کالو بھنگی‘ کرشن چندر کا مشہور اور مقبول افسانہ ہے۔ ہمارے ادیبوں نے دیوی، دیوتاؤں، راجاؤں مہاراجوں، بادشاہوں، وزیروں کے عشق و محبت کی داستانیں تخلیق کی ہیں، مگر وہ ان مظلوموں وناداروں کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوئے؟ ان کی ساری حسیّت کہاں کھوگئی تھی؟ معشوق کے حسن کی تعریف میں جو جو معرکے سر کیے ہیں، ان کو دلتوں کے مسائل کیوں نظر نہیں آئے۔ دلتوں کی ذہنی و جسمانی اذیتوں کی چیخ و پکار ان کے دلوں تک کیوں نہیں پہنچی۔ ہمارے شعرا و ادبا حضرات کو ان بے سہاروں کے خون اور پسینے کی بو، ان کی آہ وزاری، ان کی بے بسی و مفلسی، ان کی بے چارگی و محرومی کیوں نظر نہیں آئیں۔ یہ سارے سوالات کالو بھنگی کے ابتدائی جملوں میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

’’مجھ میں کیا برائی ہے۔ چھوٹے صاحب تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمھارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب۔ میں تو تمھارا پرانا حلال خور ہوں، کالو بھنگی۔ آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟‘‘

کالو بھنگی کے آبا و اجداد سیکڑوں نہیں ہزاروں برسوں سے بھنگی کا کام کرتے آئے ہیں۔ کالو بھنگی کبھی عشق نہیں کرتا، شادی نہیں کرتا، سفر نہیں کرتا، بس صبح سے شام تک کام کرتا رہتا ہے مانو وہ انسان نہیں جانور ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے ہندوستان میں دلتوں کی زندگی کی ننگی اور کڑوی حقیقت کو پیش کیا ہے۔

کرشن چندر کا ایک اور افسانہ مہالکشمی کا پل، غریبی اور مفلسی کی عکاسی کرتا ہے۔ ’مائی‘ چال کی بھنگن ہے جس کے پاس نہ تو کھانے کو بھر پیٹ کھانا ہے اور نہ ہی سر پر چھت۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ چال کے آنگن میں رہتی ہے۔ جب سارے بھنگیوں نے دو وقت کی روٹی، کپڑا اور سر پر چھت کے لیے ہڑتال کر کے جلوس نکالا تو پولیس نے جلوس کو غیر قانونی بتا کر ان لوگوں پر گولیاں چلادیں جس میں مائی کی موت ہوگئی۔

سعادت حسن منٹو کا افسانہ ’بھنگن‘ مختصر سا افسانہ ہے۔ بیوی نے شوہر کو بارش کے موسم میں ایک بھنگن کو اٹھا کر لے جاتے دیکھ لیا۔ اس کو گمان ہوا کہ دونوں کے درمیان کچھ ہے۔ بعد میں شوہر جب بیوی کے پاس آتا ہے تو وہ دور بھاگتی ہے کیونکہ اس کے شوہر نے ایک بھنگن کو چھوا ہے۔ افسانے کا سب سے معنیٰ خیز جملہ ہے۔

’’میں کہتی ہوں آدمی گناہ کرے لیکن ایسی گندگی میں نہ کرے‘‘

’شغل‘ بھی منٹو کا افسانہ ہے جو ترقی پذیر معاشرے میں دلتوں کے استحصال کی عکاسی کرتا ہے۔ مزدور سڑک پر کام کررہے ہیں۔ شام کو ایک موٹر کار آ کر رُکی۔ اس میں سے دو نوجوان اترے اور پل پر بیٹھی ہوئی سنتو کی لڑکی رام دئی سے زور زبردستی کرنے لگے۔ جب زور زبردستی سے بات نہیں بنی تو اس کو بہلا پھسلا کر کار میں بیٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ جب مزدوروں نے پنڈت سے اس کی شکایت کی تو اس نے جواب دیا کہ یہ لوگ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں۔ امیر آدمی ہیں ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے ’دو ہاتھ‘ میں بھنگیوں کی مجبوری و مفلسی کے ساتھ ساتھ ان کی بے بسی و بے حسی کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ جائداد اور سرمایے کے نام پر ان کے پاس صرف دو ہاتھ ہیں۔ اگر ان کے ہاتھ کام کرنا بند کردیں تو ان کو بھوکوں مرنے میں زیادہ وقت درکار نہ ہوگا۔ رام اوتار فوج میں جمعدار ہے اور اس کی بیوی گوری گاؤں میں میلا ڈھونے کا کام

خواجہ احمد عباس کا افسانہ ’تین بھنگی‘ بھی کئی معنوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی ایمانداری سے ہندو اور اسلام دونوں مذاہب میں اونچی ذاتوں کی حقیقت کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ تعلیم کے سبب دلتوں میں آئی بیداری سے بھنگی میونسپلٹی میں جھاڑو دینے سے کتراتے ہیں، اور یہ اونچی ذات کے لوگ تھوڑے سے پیسوں کی لالچ میں گلی کی صفائی کا کام بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کا ہی افسانہ ٹیری لین کا پتلون، دیہی اور شہری علاقوں میں چھوا چھوت کی پھیلی ہوئی وبا کا عکاس ہے۔ منگو بچپن سے ہی اس لعنت کا شکار رہا۔ کلاس کے دوسرے بچے بینچ اور ڈیسک پر بیٹھتے اور اس کو باہر پھٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھنا پڑتا۔ اس کی وجہ پوچھنے پر کوئی اس کو صحیح جواب نہیں دیتا تھا۔

کرتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں سے ہنسی مذاق کے سبب عورتوں کو اس پر بدچلنی کا شک ہوتا ہے۔ بیگم صاحبہ نے گوری کی ساس سے کہا کہ وہ اپنی بہو کو میکے بھیج دے۔ لیکن کام کے سبب گوری کی ساس اس کو میکے نہ بھیج سکی۔ ایک رشتہ دار رتی رام کے آجانے سے گوری حمل سے ہوگئی تو اس کی بدچلنی کا چرچا زوروں پر تھا۔ اس پر بوڑھی مہترانی نے ان ’بیگمات‘ کی حقیقت کا پردہ فاش کیا ہے۔

’’وہ تو سب کی راز دار ہے۔ آج تک اس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا، اسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے۔ کوٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا؟ مہترانی سے کسی کا میلا نہیں چھپتا۔ ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کیے ہیں۔ یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت الٹ دیں۔ پر نہیں۔ اسے کسی سے بغض نہیں۔ اگر اس کے گلے پر چھری دبائی گئی تو شاید غلطی ہوجائے۔ ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔‘‘

’ڈھائی سیر آٹا‘ میں حیات اللہ انصاری نے بھوک کو موضوع بنایا ہے۔ پیٹ کی آگ نے مولا کو گلی کے کنارے پڑے ہوئے ڈھائی سیر آٹے کو گھر لانے پر مجبور کردیا۔ یہ وہی آٹا ہے جو اکرایا ہوا تھا اور جس کو گلی میں پھینکا جانا تھا۔ جس کو بھکاری نے لینے سے منع کر دیا تھا اور جانوروں نے کھانے سے انکار کردیا تھا۔ جب مولا کی بیوی اور بچے اس آٹے کی پوریاں بنا کر کھاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خدا کی نعمت ہے۔

خواجہ احمد عباس کا افسانہ ’تین بھنگی‘ بھی کئی معنوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی ایمانداری سے ہندو اور اسلام دونوں مذاہب میں اونچی ذاتوں کی حقیقت کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ تعلیم کے سبب دلتوں میں آئی بیداری سے بھنگی میونسپلٹی میں جھاڑو دینے سے کتراتے ہیں، اور یہ اونچی ذات کے لوگ تھوڑے سے پیسوں کی لالچ میں گلی کی صفائی کا کام بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کا ہی افسانہ ٹیری لین کا پتلون، دیہی اور شہری علاقوں میں چھوا چھوت کی پھیلی ہوئی وبا کا عکاس ہے۔ منگو بچپن سے ہی اس لعنت کا شکار رہا۔ کلاس کے دوسرے بچے بینچ اور ڈیسک پر بیٹھتے اور اس کو باہر پھٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھنا پڑتا۔ اس کی وجہ پوچھنے پر کوئی اس کو صحیح جواب نہیں دیتا تھا۔ آخر کار اسکول کے چپراسی رام دین نے بتایا کہ یہ برا سلوک اس کے اچھوت ہونے کے سبب کیا جارہا ہے۔ بڑا ہو کر جب منگو شہر گیا تو اپنا نام منگت رام رکھ لیا۔ آفس میں کام کرنے والی راجپوت لڑکی کملا کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے اور اس کو شریکِ حیات بنانے کی کوشش کرتا ہے مگر ذات پات کے سخت قوانین کے سبب کامیاب نہیں ہو پاتا۔

مہندر ناتھ کا افسانہ، ’پاپ اور سزا‘ ہندو مذہب کے اس عقیدے کی بنیاد پر رکھا گیا ہے جس کے تحت ایک کے پاپ کی سزا کو دوسرے جنم میں بھگتنا پڑتا ہے۔ کھانڈیکر کے ذہن میں یہ عقیدہ اس قدر حاوی ہے کہ اپنی تمام تر مصیبتوں کے لیے اپنے پچھلے جنم کے کرموں کو ذمے دار مانتا ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں اس قدر مصروف ہے کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ سڑک کے حادثے کے بعد اس کے بچوں کو چھوٹی چھوٹی چیزوں سے محروم ہونا پڑتا ہے جس کے لیے وہ اپنے پچھلے جنم کے کرموں کو ذمے دار سمجھتا ہے۔

’پھول کھلنے دو‘ واجدہ تبسم کا طویل افسانہ ہے۔ ڈاکٹر شانتی ڈا ملے برہمن عورت کے بیٹے کو ہریجن عورت کی بیٹی سے بدل دیتی ہیں۔ برہمن عورت کا بیٹا جواب ہریجن عورت کے پاس ہے،

اس کے بازو پر 'پدم' جو دھنوان اور بڑا آدمی ہونے کی علامت ہے، موجود ہے۔ یہی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جس کا نام بندو ہے۔ آگے جا کر یہی اس برہمنی نظام کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور دلتوں کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ یہ افسانہ ہندو مذہب کی اس بوسیدہ وفرسودہ حقیقت کی عکاسی کرتا ہے جس کے تحت اچھوتوں کو اپنے پیروں میں جھاڑو اور گلے میں ہانڈی باندھ کر چلنا پڑتا تھا۔ ایک دور کے پورے سماجی نظام کی عکاسی اس افسانے میں بھرپور طریقے سے کی گئی ہے۔

'نروان' میں جیلانی بانو نے اچھوت اور ہریجنوں کو موضوع بنایا ہے۔ دسہرے کے دن راون کو جلایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو سبق ملے کہ برے کام کا کیا انجام ہوتا ہے۔ مگر جہاں اچھوتوں کا معاملہ آتا ہے، اس پر ظلم وزیادتی کرنے سے کوئی نہیں چوکتا۔ اس وقت دھرم اور ادھرم پاپ اور پنیہ، نیکی اور بدی کے سارے پیمانے بدل جاتے ہیں، ان میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا ہے۔ ہزاروں سال قبل جب آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے تبھی سے جبر وظلم کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔

'شیخ وبرہمن' رنبیر سنگھ امر کا بے حد دلچسپ افسانہ ہے۔ شیخ عبدالرحمن اور پنڈت نرسنگھ میں اونچی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ مگر دونوں کا رویہ بھنگن کے لڑکے کلیا کے تئیں یکساں ہے۔ دونوں ہی کلیا کو نادار و نابکار سمجھتے ہیں۔ 'اچھوت' بھی رنبیر سنگھ کا ایک پُراثر افسانہ ہے جو اچھوتوں کی سماجی حیثیت کی عکاسی کرتا ہے۔ مندر کا پجاری پنڈت تلسی داس اچھوت راجو کی شکل اس لیے نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ وہ منحوس ہے۔ اپنی ہر ناکامی کے پیچھے وہ راجو کا چہرہ دیکھنا سمجھتا تھا۔

'جمعدارِن چاچی' میں دھرمندر ناتھ نے جمعدارن چاچی کے ذریعے پورے ہندوستان کے جمعداروں کے درد وکرب بالخصوص سماج میں ان کی حیثیت اور ماضی میں ان کو کن کن ناموں سے پکارا گیا ہے اس طرف تاریخی نقطۂ نظر سے اشارہ کیا ہے۔ جمعدارن چاچی کے پاس لوگوں کو دینے کے لیے دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اس لیے وہ سب کو دعائیں دیتی ہیں اور پورے محلے کی صفائی کرتی ہیں۔ اس کے بدلے جو کچھ بھی مل جاتا ہے اسی پر صبر کر لیتی ہیں۔ افسانے کا سب سے موثر حصہ وہ ہے جب شادی کے موقعے پر پرجا کو کپڑے تقسیم کیے جاتے ہیں اور ان کی ساڑی پُرکمینوں کے لیے، کی سلپ لگی تھی۔ اس وقت جمعدارن چاچی باغی ہو کر پورے معاشرے کی حقیقت پیش کرتی ہیں۔ سماج کے دوہرے رویے کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔

پریم چند کے افسانے 'کفن' کو بنیاد بنا کر شوکت حیات نے 'مادھو' افسانہ کو نئے رنگ روپ اور نئے تیور کے ساتھ لکھا ہے۔ وہی کہانی، وہی کردار، مگر کرداروں کے تیور، ان کی شکل وصورت اور ذہنیت بالکل جدا۔ گھیسو اور مادھو پریم چند کے گھیسو مادھو نہیں بلکہ عہد حاضر کے گھیسو مادھو ہیں۔ آج مادھو ماضی کی غلطیوں پر افسوس کرتا ہے۔ اس کے خیال میں وہ بدنصیب ہے کہ اپنی اچھی بھلی بیوی کے داہ سنسکار کا پیسہ شراب میں اڑا گیا۔ اب اسے اپنی بیوی کی فکر ہے۔ بیوی کے مرنے پر مادھو کو خود سے گھن آتی ہے کہ وہ کتنا گرا ہوا اور کمینہ ہے۔ اب مادھو کا تلفظ بھی ٹھیک ہو گیا ہے کیونکہ وہ پڑھ لکھ گیا ہے۔ اب مادھو زمیندار کے سامنے ہاتھ جوڑ کر منتیں نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے روبرو کھڑا ہو کر مقابلہ آرائی کو تیار ہے اور جیت کا متمنی ہے۔ شوکت حیات کا کردار مادھو دورِ جدید کے دلتوں کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے جو ظلم وبربریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کو تیار ہے۔

عہد حاضر کا ایک المیہ یہ ہے کہ دلتوں میں بھی ایک طبقہ

'نروان' میں جیلانی بانونے اچھوت اورھریجنوں کو موضوع بنایاھے۔ دسھرے کے دن راون کوجلایاجاتاھے تاکه لوگوں کوسبق ملے که برے کام کاکیاانجام ھوتاھے۔ مگرجھاں اچھوتوں کامعامله آتاھے، اس پرظلم وزیادتی کرنے سے کوئی نھیں چوکتا۔ اس وقت دھرم اورادھرم پاپ اورپنیه، نیکی اوربدی کے سارے پیمانے بدل جاتے ھیں، ان میں کوئی امتیازنھیں ھوتاھے۔ ھزاروں سال قبل جب آریه ھندوستان میں داخل ھوئے تھے تبھی سے جبر و ظلم کایه سلسله بدستور جاری ھے۔'شیخ وبرھمن' رنبیرسنگھ امر کابے حددلچسپ افسانه ھے۔ شیخ عبدالرحمن اورپنڈت نرسنگھ' میں اونچی ذات سے تعلق رکھتے ھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ھیں۔ مگردونوں کارویه بھنگن کے لڑکے کلیا کے تئیں یکساں ھے۔ دونوں ھی کلیا کونادارونابکارسمجھتے ھیں۔

ایسا پیدا ہو رہا ہے جو دولت وثروت حاصل ہونے کے بعد اپنے ہم ذات لوگوں کو حقیر سمجھنے لگا ہے۔ دیپک بدکی کے افسانہ 'موچی پیلا' میں اسی ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد سماجی انقلاب کے سبب کس قدر تبدیلی آئی ہے اس کی عکاسی وہاب اشرفی کے افسانے 'کافر بھی ہوئے سجدہ بھی کیا' بڑے دلچسپ انداز میں کرتا ہے۔ ہندوستانی جمہوریت نے کس طرح دلتوں کو Empower کیا ہے اور ان کا یہ Empowerment سماج کے ایک طبقے کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ طبقہ جب آسودہ حال دلتوں کو دیکھتا ہے تو اس کو اپنی زندگی تلخ لگتی ہے اور قیامت نزدیک نظر آتی ہے۔ مگر یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہے کہ "صاحب بن گیا تو کیا ہوا ہے تو پاسی ہی"۔

'ہستک چھیپ' میں ابن کنول نے ریزرویشن کو موضوع بنایا ہے۔ ریزرویشن کے قانون سے جہاں دلت طبقہ خوش تھا تو سورن طبقے کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ سورنوں نے جلسے جلوس کا انعقاد کرنا شروع کر دیا اور دلتوں کے تئیں نفرت کا اظہار کرنے لگے۔

ڈاکٹر عابداللہ غازی کے دو افسانے 'انقلاب' اور 'امریکن جمعدار'، بہت اہمیت کے حامل ہیں یہ افسانے اس روایت میں تازگی کا احساس کرواتے ہیں۔ جہاں 'انقلاب' میں عابداللہ غازی نے دلتوں کے مسائل کو ان کے ماضی کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر میں درپیش مسائل کو پیش کیا ہے وہیں امریکن جمعدار میں کالے گورے کے مٹتے ہوئے بھید کو پیش کیا ہے۔ ہندوستانی ذات پات اور امریکی نسلی بھید بھاؤ کا تقابل بھی نظر آتا ہے۔

سلام بن رزاق کا افسانہ 'یکلویہ' تعلیمی اداروں میں دلتوں کے ساتھ ہو رہے ظالمانہ سلوک کی عکاسی کرتا ہے۔ جس طرح سے ماضی بعید میں درونا چاریہ نے گہری شاطرانہ سازش کے تحت یکلویہ سے ان کا انگوٹھا گرودکشنا کے بہانے کٹوا لیا تھا اسی طرح آج بھی درونا چاریہ یکلویہ کو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ مگر آج کا یکلویہ ماضی کے یکلویہ کی طرح غلطی نہیں کرتا ہے بلکہ وہ بھی چالاک ہو گیا ہے اور درونا چاریہ کی سازش کا شکار نہیں ہوتا ہے۔

اس طرح اگر نظر غائر سے ان افسانوں کا مطالعہ کریں تو اردو افسانے میں ابتدا سے ہی دلت افسانوں کا رجحان موجود ہے مگر کبھی بھی یہ تحریک یا مرکزیت نہیں حاصل کر سکا۔ بیشتر افسانے سماج سے سوال کرتے ہیں کہ جب دلت اپنی ذمے داری اور کام کو پوری محنت اور ایمانداری سے کرتا ہے تو سماج ان کو نیچ اور حقیر نظروں سے کیوں دیکھتا ہے؟ شیخ اور برہمن جنھیں سماج میں سب سے اعلیٰ وافضل سمجھا جاتا ہے، لوگ اس کا احترام کرتے ہیں کیونکہ ایسا ماننا تھا کہ وہ ایماندار ہیں۔ مگر دلت افسانہ یہ سوال قائم کرتا ہے کہ کیا واقعی وہ ایماندار تھے اور ہیں؟ کیا وہ لوگوں کا استحصال نہیں کرتے، ذہنی اور جسمانی اذیتیں نہیں پہنچاتے، دلتوں کی عصمتوں سے نہیں کھیلتے، کیا وہ زانی نہیں ہیں، کیا وہ چوریاں نہیں کرتے، کیا وہ جاہل نہیں ہوتے، کیا وہ حرام کاریاں نہیں کرتے، کیا وہ بے گار نہیں لیتے، ظالم و بے رحم نہیں ہوتے، جبر نہیں کرتے مگر افسوس صد افسوس کہ سماج کو جنھیں نیچ اور حقیر سمجھنا چاہیے اس کا احترام کرتا ہے اور جس کا احترام کرنا چاہیے اس کو حقیر اور نیچ سمجھتا ہے۔

■

Mithun Kumar, Asst Prof. Dept of Urdu, Dehli University, Delhi - 110007

آشوتوش سریواستو

شعرِ عرفان
معنی کا ایک نیا جہان

عرفان صدیقی کو 1970 کے بعد کی غزل کا اہم ترین شاعر تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ موجودہ عہد میں ان کا سا شاعر پورے ہندو پاک میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ لیکن نئے شعر و ادب سے متعلق رسالوں کی ورق گردانی میں ان کے فن سے انصاف کرنے والے مضامین خال خال ہی نظر آتے ہیں، یعنی بڑے ناقدین میں بیشتر کے قلم عرفان کی شاعری کے سلسلے میں اب بھی خاموش ہیں۔

اس مسئلے میں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ ضرورت ہے غور و خوض کرنے کی جس سے عرفان صدیقی کے فن کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آ سکے اور اس کے لیے ہمیں عرفان صدیقی کی شاعری کے موضوعات کو دیکھنا ہوگا نیز یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان موضوعات کو انھوں نے کس شاعرانہ پیرائے میں ادا کیا ہے۔ اب ہم عرفان کے موضوعات کی طرف آتے ہیں۔

اردو غزل کے وہی موضوعات و مضامین جو بار ہا غزل میں بیان کیے جا چکے ہیں عرفان صدیقی کے یہاں بھی موجود ہیں یعنی عشق (عشق مجازی)، تصوف، فقر، آزادی، مزاحمت، یاد پرستی، حسن پرستی، بے سروسامانی، اداسی، شادمانی، بے حوصلگی، بلند حوصلگی، جنسی و نیم جنسی شاعری وغیرہ۔ ان میں کون سا ایسا موضوع ہے جس پر عرفان صدیقی سے قبل شد و مد کے ساتھ طبع آزمائی نہیں کی گئی لیکن عرفان صدیقی کے یہاں ان موضوعات کے بغور مطالعے کے بعد معلوم ہوگا کہ یہ موضوعات اپنی دور رس معنویت میں ماقبل کی شاعری سے بہت مختلف ہیں اور اس نکتے کی جستجو اور وضاحت کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔ اس بحث میں ہم اُن موضوعات پر گفتگو کریں گے جنھیں عرفان کا خصوص کہا جا سکتا ہے۔ ان سارے موضوعات کو عرفان نے اپنی غزل میں دوسروں سے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے عرفان صدیقی کے عشق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ عشق ہماری شاعری میں تقریباً ایک صدی سے نزع کے عالم میں تھا، خواہ وہ علی گڑھ تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک، سب میں عشق بیزاری غالب تھی۔ اگر کہیں عشق تھا بھی تو وہ بڑی کسمپرسی کے عالم میں اور بڑی قدغنوں کے درمیان۔ دوسری طرف رومانویت کی تحریک میں عشق میں افلاطونیت غالب آ گئی تھی۔ اس طرح انھیں یہ محسوس ہوا کہ دونوں صورتوں میں عشق کو وہ مقام نہیں ملا جو اسے ملنا چاہیے۔ اسی احساس کی بنا پر عرفان عشق کی طرف آئے اور اس کو اصل مقام دلانے کے لیے ہی انھوں نے اپنی شاعری میں اسے ایک مستقل موضوع (عشق نامہ) کے طور پر اختیار کیا۔ عرفان صدیقی سے قبل کچھ شعرا مثلاً مومن، حسرت، اور فراق بھی عشق کو ایک مستقل موضوع کے طور پر اختیار کر چکے تھے۔ مگر عرفان صدیقی کا معاملہ ان شعرا سے مختلف ہے۔ مومن کے یہاں جو عشق نظر آتا ہے وہ بازاری اور سوقیانہ ہے اور تقریباً اسی طرح کا عشق مولانا حسرت موہانی کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ حسرت کا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے میر کی پیروی کی مگر وہ اس عشق کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے اور سطحی جذباتیت کا شکار ہو کر رہ گئے۔ فراق اور عرفان صدیقی کے عشق میں امتیازی پہلو یہ ہے کہ فراق نے عشق کو ارضیت تو عطا کی مگر محبوب کی حیثیت میں کوئی خاص تبدیلی نہ لا سکے۔ ان کا محبوب بھی پیشروؤں کی طرح صرف محفلیں سجاتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ فراق صاحب یا تو اشک بار نظر آتے ہیں یا پھر سرتاپا آرزوئے وصال۔ ان کے یہاں عشق میں وہ پر تکلف ارتقا نظر نہیں آتا جو عرفان صدیقی کے یہاں ہے۔ میرا مقصود فراق کے عشق کو کم کرنا نہیں ہے۔ اردو ادب میں وہ ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے مگر بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنسی لذت ہی فراق صاحب کے عشق کی معراج ہے۔ عشق میں ارضیت کا سبق فراق نے سنسکرت ادبیات سے حاصل کیا تھا اور عرفان صدیقی کا بھی یہی منبع ہے۔ اس کا ثبوت کالی داس کی نمائندہ تخلیقات کے وہ شاندار ترجمے ہیں جو عرفان صدیقی نے بڑی مہارت اور ذہانت کے ساتھ کیے ہیں۔ عشق میں مکمل ارضیت کے معنی میرے نزدیک یہ ہیں کہ اسے نہ صرف تصوف اور افلاطونیت کی بلندیوں سے نیچے لایا جائے بلکہ اسے ان کوٹھوں سے اتار کر معزز اور شائستہ محبوب کے سپرد کیا جائے اور عرفان صدیقی نے یہی کیا ہے۔ ان کا محبوب کوئی بازاری، عمومی اور سوقیانہ جذبات والا نہیں ہے، اس کی مثال ان کے وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے محبوب کی بود و باش، اس کے آداب و اطوار، اس کے درجے اور مرتبے کو ظاہر کیا ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں عرفان صدیقی فراق سے بازی مار لے جاتے ہیں اور جو 'ارضیت' فراق صاحب کے نام سے منسوب ہو گئی تھی وہ اصلاً عرفان صدیقی کے یہاں 'مکمل ارضیت' میں تبدیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی مکمل ارضیت اصل میں ہندوستانی کلچر سے میل کھاتی ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عرفان صدیقی کا عشق حقیقی ہے، جس میں انسانی روح کا سوز و ساز ہے۔

ابھی میں نے کہا تھا کہ عرفان صدیقی کے یہاں نظم و ضبط کے ساتھ ارتقا نظر آتا ہے جو عشق کے مختلف Shades کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کے لیے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ جس سے میرا موقف واضح ہو جائے گا:

جسم و جاں کی آگ سے منظر بہ منظر روشنی
اس کا پیکر روشنی میرا مقدر روشنی

یہ مشک ہے کہ محبت مجھے نہیں معلوم
مہک سی میرے ہرن کی طرف سے آتی ہے

ہم سے وہ جانِ سخن ربطِ نوا چاہتی ہے
چاند ہے اور چراغوں سے ضیا چاہتی ہے
یاد آئیں جو تری کم سخنی کے انداز
اپنے ہی آپ سے مصروفِ سخن ہوجاؤں

پہلے شعر میں محبت میں عاشق اپنے جسم و جاں کی آگ سے پورے منظر کو روشن پاتا ہے۔اس عشق میں محبوب کا پیکر ہی روشن نہیں ہوا ہے بلکہ عاشق اس عشق میں اپنا مقدر بھی روشن ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔اقبال نے عشق کی یہ خوبی بتائی تھی کہ عشق کی مستی سے پیکرِ گِل تابناک ہوتا ہے مگر عرفان صدیقی نے یہ بتایا کہ عشق سے مقدر بھی روشن ہوتا ہے۔دوسرے شعر میں محبت اور مشک دونوں کو یکجا اور آمیز کرنے کا بہترین تجربہ پیش کیا ہے۔محبت کی مناسبت سے مشک اور مشک کی مناسبت سے ہرن اور ہرن سے محبوب کو تشبیہ دے کر انھوں نے اپنا رشتہ روایتی شاعری سے بھی جوڑا ہے اور اپنے جدّت پسند ذہن کی عکاسی بھی کی ہے۔تیسرے شعر میں عرفان صدیقی کا محبوب عشق میں فعال نظر آتا ہے۔وہ محبت کا قدر آشنا ہے سو اپنے عاشق سے ربطِ نوا چاہتا ہے۔اس پر عاشق کو حیرت اور مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ محبوب میں غرور نام کو بھی نہیں ہے اور اپنی جانِ سخن کے لیے حیرت سے کہہ اٹھتا ہے۔ 'چاند ہے اور چراغوں سے ضیا چاہتی ہے'۔ چوتھے شعر میں عرفان صدیقی نے محبوب کی کم سخنی کو آدابِ محبت کا دستور جانا ہے۔وہ محبوب کی کم گوئی سے نالاں نہیں بلکہ محبوب کی یہ ادا انھیں بہت کچھ غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ خلوت میں محبوب کے اس انداز پر خود سے کلام کرتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔اس شعر کی کیفیت لاجواب ہے۔غور طلب بات ہے کہ محبت کا یہ پہلا مرحلہ تھا۔ان کی اگلی منزل کا ارتقا ان اشعار میں ملاحظہ ہو:

ہم نے ان لفظوں کے پیچھے ہی چھپایا ہے تجھے
اور انھیں سے تری تصویر بنا چاہتی ہے
مرے لفظوں میں بھی چھپتا نہیں پیکر اس کا
دل مگر نام بتانا بھی نہیں چاہتا ہے

ان دو شعروں میں شاعر محبوب کو دنیا سے چھپانے اور اپنے عشق کی تشہیر سے بچنے کی ناکام کوشش میں مبتلا نظر آتا ہے۔غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں عشق باعث ننگ یا باعث رسوائی نہیں بلکہ اس پوشیدگی کے عمل میں شاعر کا تکلف کارفرما ہے۔شاعر کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی ہے کہ اس کا عشق دنیا کے سامنے نہ آنے پائے، نیز وہ اپنے جذبات کو لفظوں میں ڈھالتا ہے تو بہت سنبھل کر اور بہت محتاط ہو کر۔ اس کے باوجود محبت کی کارفرمائی یہ ہے کہ وہ جس محبوب کا پیکر چھپاتا ہے اور جس کا نام بتانے سے بھی گریز کرتا ہے، اس کی تصویر انھیں لفظوں سے بنتی چلی جاتی ہے۔عرفان صدیقی کے عشق کی اگلی منزل ان اشعار میں ملاحظہ ہو:

وہ جاگنا مری خاکِ بدن میں نغموں کا
کسی کی انگلیوں کا نئے نواز ہوجانا
سکوتِ شب میں تم آواز کا شیشہ گرا دینا
فضا سنسان کمرے کی نداسی ہوتی جاتی ہے

محبت کا اثر شاعر کی خاک کو بھی نغمہ زن کر دیتا ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر رات کے سکوت میں محبوب کی آواز سننے کو بے چین ہوجاتا ہے۔اسے یقین ہے کہ رات کے پُر شور سناٹے سے صرف محبوب کی کھنکتی ہوئی آواز نجات دلا سکتی ہے۔دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ شاعر نے محبوب کی آواز

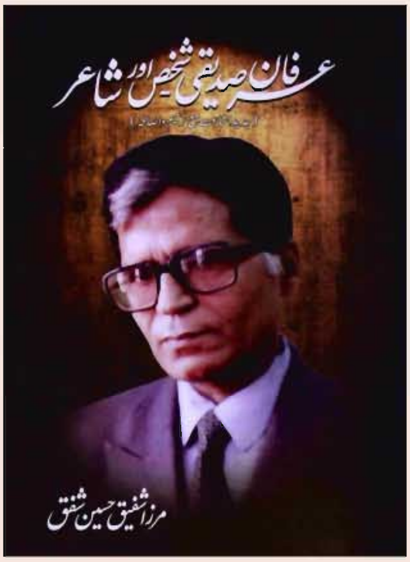

'شیشے کے گرنے' سے تشبیہ دی ہے جو ہمارے علم میں اردو شاعری میں نادر تشبیہ ہے۔عرفان صدیقی کے عشق کی اگلی منزل 'دیدار' ہے:

اک ستارہ ادا نے یہ کیا کر دیا، میری مٹی کو مجھ سے جدا کر دیا
اِن دنوں پاؤں میرے زمیں پر نہیں، اب مری منزلیں آسمانوں میں ہیں

اس نے کیا دیکھا کہ ہر صحرا چمن لگنے لگا
کتنا اچھا اپنا من، اپنا بدن لگنے لگا
ہم کہاں کے یوسفِ ثانی تھے لیکن اس کا ہاتھ
ایک شب ہم کو بلائے پیرہن لگنے لگا
دیکھ لیتا ہے تو کھلتے چلے جاتے ہیں گلاب
میری مٹی کو خوش آثار کیا ہے اس نے

پہلے شعر میں شاعر اس 'ستارہ ادا' کے معجزوں کا معترف نظر آتا ہے، وہ حیرت میں ہے کہ یہ کیا ہوگیا ہے کہ اب میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے۔دوسرے شعر میں صحرا کے چمن معلوم ہونے میں یہ پہلو ہے کہ شاعر کو ابھی تک احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا ہے اور کیا ہوسکتا ہے یعنی اسے اپنے وجود کے صحرا ہونے کا احساس نہیں تھا، محبت کی کرامت سے جب صحرا چمن میں تبدیل ہوتا ہے تو اسے اس کا احساس ہوتا ہے۔شاعر کا من اور بدن جو خود فراموشی کے عالم میں تھے اُنھیں انتہائے حیرت کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔تیسرے شعر میں وہ خود کو یوسفِ ثانی کہتا ہے۔ابھی تک کی ہماری اردو غزل کا محبوب تشنۂ خوں، ظالم و جابر اور عاشق کو استخواں کا ڈھانچہ بنا دینے والا ہی نظر آتا تھا، مگر اس طرح کا محبوب ہمیں پہلی بار نظر آتا ہے جس کے عشق میں عاشق آباد ہو رہا ہے۔چوتھے شعر میں شاعر محبوب کی کرم فرمائیوں کا اعتراف اس طرح کرتا ہے کہ اس کا بدن محض محبوب کے دیکھ لینے سے گل کش ہوا جارہا ہے۔ذیل کے شعروں میں عرفان صدیقی کا عشق باصرہ کی حدوں سے نکل کر لامسہ کی سرحدوں میں بڑی آہستہ روی سے داخل ہوتا ہے۔شعر ملاحظہ ہوں:

اس کی آنکھیں ہیں کہ اک ڈوبنے والا انساں
دوسرے ڈوبنے والے کو پکارے جیسے
مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی
میرے وجود کا جنگل ہرا بھرا ہوجائے
وہ رات بھی آئے کہ اس کا بدن گھٹا ہوجائے
ہوا گلاب کو چھو کر گزرتی رہتی ہے
سو میں بھی اتنا گنہگار رہنا چاہتا ہوں

پہلے شعر میں عاشق کو اپنے محبوب کی آنکھوں میں طلب کی وہ شدت نظر آتی ہے جو ایک ڈوبنے والے انسان کی نظر میں دوسرے ڈوبنے والے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔کمال کی تشبیہ ہے! مگر غور طلب بات ہے کہ عرفان صرف آنکھوں ہی کی کیفیت بیان کر سکے ہیں مکمل جسم کے لیے تو انھیں کوئی استعارہ ہی نہیں ملتا ہے۔اور ان کے دل میں نئی نئی خواہشات جنم لیتی ہیں مثلاً محبوب کے گھٹا ہوجانے کی آرزو جس سے ان کا وجود نمو حاصل کر کے ہرا بھرا ہوجائے۔اگلے شعر میں وہ اپنی بات کو اور واضح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح ہوا گلاب کو چھو کر گزرتی رہتی ہے، میں بھی ترے جسم کو چھو کر اتنا ہی گنہگار رہنا چاہتا ہوں۔

عرفان صدیقی کے عشق کی اس منزل تک بیشتر شعرا کی رسائی نہیں ہوسکی ہے اور اگر ہوئی بھی تو وہ اپنی بات کو اتنی آسانی اور صناعی سے نہ کہہ سکے۔عرفان کے عشق کا اگلا مرحلہ وہ ہے جس میں وصال کے تجربات کی نغمگی ہے۔ان اشعار پر غور کیجیے:

جسم کو جسم سے ملنے نہیں دیتی کمبخت
اب تکلف کی یہ دیوار گرا کر دیکھیں

ہم تو صحرا ہوئے جاتے تھے کہ اس نے آکر
شہر آباد کیا، نہرِ صبا جاری کی

اِن اشعار میں شاعر نے تکلّفات کی دیوار گرادی ہے۔ اب اسے اپنی تکمیل کا احساس ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ محبوب نے 'شہر آباد کیا، نہر صبا جاری کی' چونکہ شاعر یہاں پہلے جسم کو صحرا کہتا ہے اور پھر اسی مناسبت سے بدلی ہوئی صورتِ حال میں شہر اور نہرِ صبا کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے باوجود شاعر کو محبوب کا جسم ابھی بھی پراسرار معلوم ہوتا ہے۔

کربلا کا واقعہ شاعری میں شعری استعارے کے طور پر بہت پہلے سے استعمال ہوتا آرہا ہے لیکن اس استعارے میں معانی و مفاہیم کی یہ وسعت موجودہ عہد میں پیدا ہوئی۔ عرفان صدیقی اور افتخار عارف کی شاعری میں واقعہ کربلا کی علامتوں کا استعمال ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جس تواتر سے افتخار عارف کے یہاں واقعہ کربلا کی عکاسی ہوئی ہے، ویسی عرفان صدیقی کے یہاں نظر نہیں آتی۔ کہا جاسکتا ہے کہ عرفان صدیقی کی غزلوں میں واقعۂ کربلا کی علامتیں اور ان کے تلازمات کا ذکر ہوتا ہے جب کہ افتخار عارف کے یہاں پوری کی پوری غزلیں کربلا کے موضوع سے متعلق ہیں۔

شاعری میں اس رجحان کے پروان چڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے اس دور کے شعرا اس عہد میں جی رہے ہیں جس میں ہمہ وقت شر خیر سے متصادم نظر آتا ہے بلکہ خیر پر شر غالب ہے۔ ہر طرف طاقت کا بول بالا ہے اور حق پرستوں کی آواز کو دبایا جارہا ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جو ہمارے عہد کے آشوب کو واقعاتِ کربلا کے مماثل بنارہی ہے۔

جدید دور میں ہماری اردو شاعری میں نئے افق نمودار ہوئے ہیں۔ اب اس کے احاطۂ اظہار میں بہت سارے قومی و بین الاقوامی مسائل ہیں۔ اِن پیچیدہ اور المناک مسائل کو پیش کرنے کے لیے شعرا واقعاتِ کربلا کے سانحے کی طرف گئے کیونکہ یہی وہ موزوں استعارہ تھا جو ان مسائل کی المناکی اور سنگینی کو زیادہ بامعنی طریقے سے پیش کرسکتا تھا۔

عرفان صدیقی کی غزل میں واقعۂ کربلا کا بیان دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک طرف ان کے یہاں کھلی ہوئی علامتیں ہیں، جن کے مفاہیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی ہے اور دوسرے نوع کے بیان میں اُن علامتوں کے مفاہیم آسانی سے نہیں کھلتے۔ دونوں طرح کے بیانوں سے متعلق اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرند ہے شاخِ شجر پہ وارا ہوا

تم جو چاہو اسے تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا

نوکِ سناں نے بیعتِ جاں کا کیا سوال
سر نے کہا قبول، نظر نے کہا نہیں

یہ کس نے دستِ بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے

تو وہ شب بھر کی رونق چند خیموں کی بدولت تھی
اب اس میدان میں سنسان ٹیلوں کے سوا کیا تھا

کوئی مشکیزہ سرِ نیزہ علم ہوتا ہے
دیکھیے دشت میں لگتا ہے شجر پانی کا

تری تیغ تو میری ہی فتح مندی کا اعلان ہے
یہ بازو نہ کٹتے اگر میرا مشکیزہ بھرتا نہیں

اس نوع کے اشعار کے تجزیے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ ان کے معنی بالکل صاف ہیں۔ اب ان اشعار کو دیکھتے ہیں جو گہرے مفاہیم کے حامل ہیں۔

آخری امید کا مہتاب جل بجھنے کے بعد
میرا سوجانا مرے دیوار و در کا جاگنا

اجنبی جان کے کیا نام و نشاں پوچھتے ہو
بھائی ہم بھی اسی بستی کے نکالے ہوئے ہیں

پانی پہ کس کے دستِ بریدہ کی مہر ہے
کس کے لیے ہے چشمۂ کوثر لکھا ہوا

تم ہی صدیوں سے یہ نہریں بند کرتے آئے ہو
مجھ کو لگتی ہے تمھاری شکل پہچانی ہوئی

انقلاب، تقسیم اور ہجرت کے مسئلے کو ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے اپنی اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے اپنے بنائے ہوئے منظر پیش کیے۔ ترقی پسندوں نے ان مسائل کے بیان میں ساری قوت لہجے کو پرجوش بنانے میں صرف کردی۔ اب بچے جدیدیے، انھوں نے سماجی مسائل سے یکسر منہ موڑ لیا تھا اور اپنے درون کے دکھ ہی کو اہم جانا تھا۔ مگر عرفان صدیقی نے بین بین راہ اختیار کی۔ تقسیم اور ہجرت کے موضوعات سے متعلق ان کی شاعری میں زیادہ صداقت اور زیادہ اثر آفرینی ہے۔ دراصل ان مسائل و حوادث سے وہ براہِ راست متاثر ہوئے تھے اسی لیے ان کے کلام میں احساس کی آنچ اتنی تیز ہے اور یہی آنچ عرفان صدیقی کی شاعری کو انفرادیت عطا کرتی ہے۔

انقلاب، تقسیم اور ہجرت سے متعلق ابھی تک جتنا ادب ہمارے سامنے آیا تھا اس کا بیشتر حصہ جذباتیت اور وقتی ابال کا نتیجہ تھا۔ اس میں وہ گہرائی اور اثر پذیری نہیں تھی جو اعلیٰ ادب کی شناخت ہے۔ عرفان صدیقی نے ایسے مسائل کے بیان میں بھی ذکاوت اور شائستگی کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نوع کے ادب کا انتخاب پیش کیا جائے گا، عرفان صدیقی کا کلام اس میں سرِ فہرست نظر آئے گا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہجرت اور انقلاب سے متعلق ان کے اشعار میں بھی کربلا حاوی ہے۔ ان کی 'یا اخی' کی ردیف والی معروف غزل ایک معرکہ آرا تخلیق ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس غزل میں انھوں نے اپنے بھائی کو مخاطب کیا ہے جو ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے تھے مگر اس میں سطحیت نظر نہیں آتی جو عام ترقی پسندوں کی 'عنوان ساز' شاعری میں اکثر پائی جاتی ہے۔ اس غزل میں بھی واقعۂ کربلا کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو:

تم ہمیں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیے تھے تمھیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلنے میں یہ بال و پر یا اخی
شب گزیدہ دیاروں کے ناقہ سواروں میں مہتاب چہرہ تمھارا نہ تھا
خاک میں مل گئے راہ تکتے ہوئے سب خمیدہ کمر بام و در، یا اخی

مزاحمت، سماجی مسائل کی عکاسی، خارجی دنیا کا بیان، بلند آہنگی اور احتجاج وغیرہ کو ترقی پسندوں نے اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا اور ترقی پسندوں کی اس ملکیت کو جدید شعرا باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ ان موضوعات کے فقدان کی وجہ سے نئی شاعری میں بہت کچھ ہونے کے باوجود ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرفان صدیقی اور ان کے بعض معاصر شعرا نے ان موضوعات کو اپنی شاعری میں شامل کیا ساتھ ہی ان شعرا نے اس راہ کے پُرخطر ہونے کا احساس بھی دلایا اور بتایا کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو ان مسائل کو بیان کرتے وقت شاعری کو کمزور بنادیتی ہیں۔ اب مرض کی صحیح تشخیص ہوچکی تھی تو علاج بھی ممکن ہوگیا اور ایک صحت مند شاعری وجود میں آئی۔

آخر میں عرفان صدیقی کی غزل گوئی کے فن کے سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انھوں نے کلاسیکی شاعری کا تتبع اس طور کیا ہے کہ ان کی شاعری میں حسن پیدا ہوگیا ہے۔ ایسی شاعری میں وہ بڑے شاعروں کے محض مقلد نظر نہیں آتے۔ اس ضمن میں انھوں نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

نقشِ پا ڈھونڈنے والوں پہ ہنسی آتی ہے
ہم نے ایسی تو کوئی راہ نکالی بھی نہیں

یہ بات انھوں نے گذشتہ اور آئندہ کو نگاہ میں رکھ کر کہی ہے۔ یعنی نہ تو ہماری شاعری پر تقلید اور پیروی کا الزام لگایا جاسکتا ہے اور نہ ہماری شاعری کی نقالی کی جاسکتی ہے۔ یہ بات واقعی صحیح ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے غزل جیسی نازک صنف میں ایسے حساس اور نازک مسائل کو بھی بڑی خوبی اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا، ورنہ بڑے بڑے شعرا غزل میں ایسے آتشیں مسائل کو پیش کرتے وقت آتش بہ دست نظر آنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون دیر تک روشن رہنے کے بجائے شعلۂ مستعجل کی طرح بھڑک کر خاموش ہوجاتا ہے۔

■

Ashutosh Srivastava, Village & P.O; Gandara, Tahsil: Qaiserganj, Distt.: Bahraich - 271903 (UP)

سید اقبال امروہوی

نرگسیت کے منفی پہلو

یونانی دیومالا کی ایک کہانی کچھ اس طرح ہے کہ یونان کے ایک شہر میں ایک بچہ پیدا ہوا تو اس کے ماں باپ نے محسوس کیا کہ وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہے۔ انھوں نے اس کا نام نارسیسس (Narcissus) رکھا۔ یہ بچہ بہت خوبصورت تھا اور بچپن سے اپنی ذات میں ہی کھویا رہتا تھا۔ جیسے جیسے یہ بڑا ہوا اس کی شخصی خصوصیات اجاگر ہونا شروع ہوگئیں۔ جوان ہوا تو یہ خصوصیات اور واضح ہونے لگیں۔ وہ اتنا خوبصورت تھا کہ Echo نام کی ایک پری اس پر عاشق ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ نارسیسس اُس کے ساتھ کھیلے، گھومے پھرے اور باغوں میں رنگارنگ پھولوں سے لطف اندوز ہو۔ لیکن نارسیسس اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ جب ایکو سے اس کا سامنا ہوتا تو وہ اس کو نظرانداز کرتا ہوا اپنے آپ میں مست اٹھکیلیاں کرتا ہوا گزر جاتا تھا۔

ایکو نے اس کی بے رخی کو اپنی توہین سمجھا اور نارسیسس سے انتقام لینے کا ارادہ کرلیا۔ وہ دیوتا زیوس کے دربار میں حاضر ہوئی اور نارسیسس کی شکایت کی۔ اس نے زیوس کو اس بات پر راضی کرلیا کہ نارسیسس کی بے رخی کی وجہ سے اس کو جو تکلیف پہنچی ہے اس کا بدلہ لے۔ زیوس نے ایکو کی عرضی قبول کرلی۔ اگلے روز نارسیسس ہمیشہ کی طرح اپنی خوبصورتی پر اتراتا ہوا، اپنی ذات میں گم ادھر سے نکلا۔ ایکو پھر اس کے سامنے آئی لیکن اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ آگے بڑھا تو اس کو ایک تالاب نظر آیا جس کا پانی بہت صاف وشفاف تھا۔ نارسیسس اس تالاب کے کنارے بیٹھ گیا اور آس پاس کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اچانک اس کی نظر تالاب میں پڑی تو اسے ایک بہت خوبصورت اور دلکش چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کا اپنا عکس تھا جو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نارسیسس اپنے عکس پر اس طرح عاشق ہوگیا کہ وہ تالاب کے کنارے سے ہٹنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے عکس کو ٹکٹکی باندھے مسلسل دیکھتا رہا۔ اس نے کئی بار اپنے عکس کو ہاتھ سے چھونے کی کوشش کی لیکن ہر بار جب اس کا ہاتھ اس کے عکس کو لگتا پانی میں ارتعاش پیدا ہوتا اور اس کا عکس تالاب میں پیدا ہونے والے آبی دائروں میں گم ہوجاتا۔ وہ اسی طرح تالاب کے کنارے لیٹا رہا اور بار بار اپنے خوبصورت عکس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔ اسی کوشش میں نارسیسس کی موت واقع ہوگئی اور اس کی جگہ تالاب کے کنارے ایک درخت اگ آیا۔ اس درخت کے پھول کا نام نارسیسس پڑا جو فارسی اور اردو میں آتے آتے نرگس ہوگیا۔

اکثر افراد میں یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی ہی شخصیت میں محصور ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ان میں خود پرستی کا جذبہ اس حد تک ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے آگے دنیا کی کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کے اندر خود پرستی اور خودنمائی اس حد تک ہوتی ہے کہ ان خصوصیات کی جھلک ان کے ہر کردار میں نظر آتی ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے میں گزار دیتے ہیں۔ نرگسی شخصیت رکھنے والا فرد دنیا کا خواہاں صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس کی لطافتیں اور رنگینیاں اپنے اندر سمو لے، اپنے مصرف میں لائے اور اپنی ذات کو ان سے مستفید ہونے دے۔ نرگسی شخصیت رکھنے والا فرد اپنی ذات سے عشق کرتا ہے اور اپنی ہی ذات کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھتا ہے۔ وہ اپنی ہی ذات میں سمٹا رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اردگرد کی ہر چیز اسی کے لیے تخلیق کی گئی ہے اس لیے ہر شے کو وہ اپنا تابع سمجھتا ہے۔ جب کسی مقام پر اس کو کبھی شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ جھنجلا اٹھتا ہے۔ اس کی اس

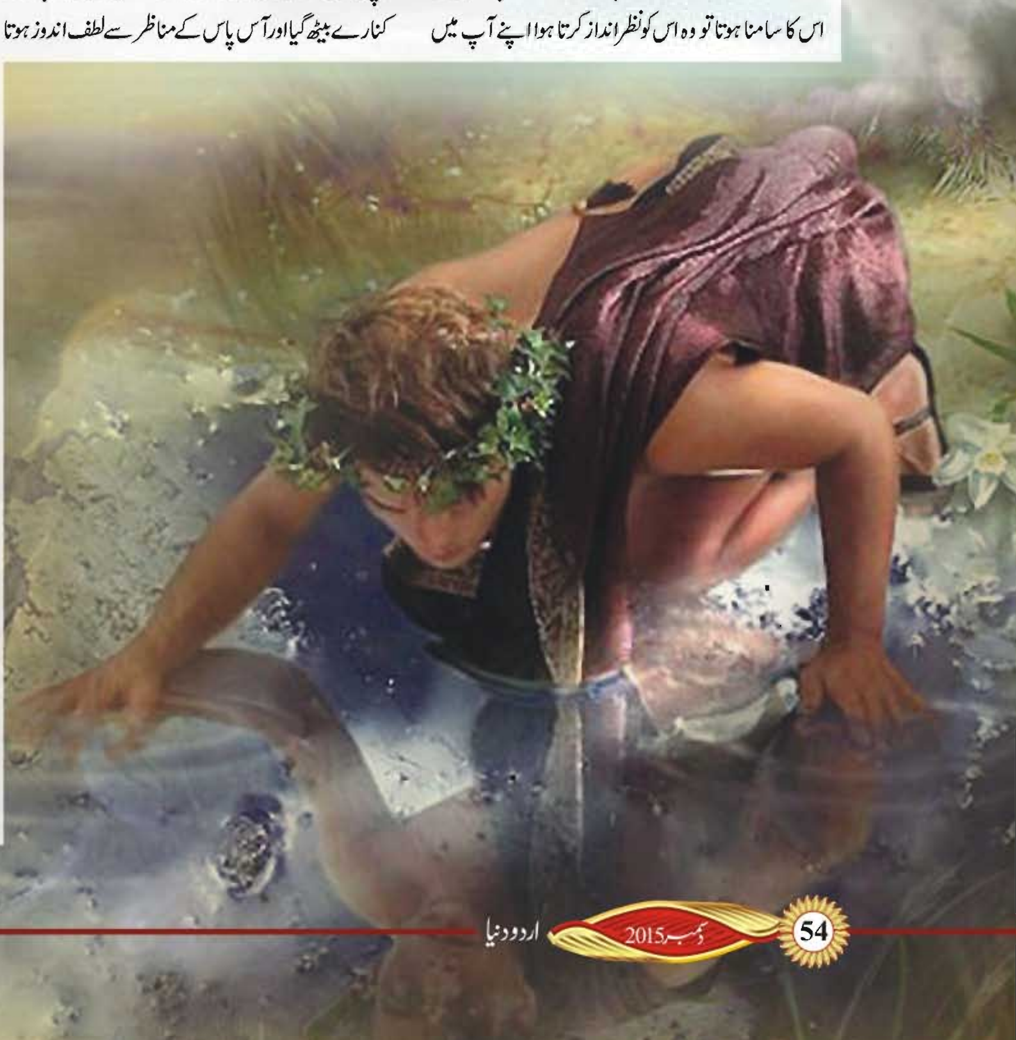

کیفیت سے ہی نرگسیت کا منفی پہلو ابھر کر آتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ خواتین میں یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ خاص طور سے جو خواتین خداداد نسوانی حسن سے نوازی گئی ہوں اور انھیں اپنی خوبصورتی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہو تو ان کی شخصیت میں نرگسی خصوصیات کا ہونا ممکن ہوتا ہے۔ عام طور سے ایسی خواتین میں اپنی ذات سے لگاؤ اور ناز و انداز کو دوسرے افراد محسوس تو کرتے ہیں لیکن اسے قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔

ابتدا میں انگریزی اور دوسری زبانوں میں نرگسیت کسی فرد کی شخصیت کی ایک خصوصیت سمجھی جاتی تھی اور یہ اس فرد کے لیے استعمال ہوتی تھی جس میں اپنی ذات سے عشق کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں جب سگمنڈ فرائڈ نے تحلیل نفسی کا نظریہ پیش کیا اور اس پر مسلسل تجربات کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ نرگسی شخصیت رکھنے والے افراد کو منفی اثرات سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔

ایک طویل مدت تک اس کہانی کا سہارا لے کر فرد کی خود پرستی، خود نمائی اور اپنی ذات میں کھوئے رہنے کی کیفیت نرگسیت کے نام سے پہچانی جاتی رہی۔ اردو میں یہ اصطلاح Narcissism کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور Narcisstic Personality کے لیے نرگسی شخصیت کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں اس قسم کی شخصیت کو کوئی نفسیاتی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں سگمنڈ فرائڈ نے جب تحلیل نفسی کا نظریہ پیش کیا اور اس نظریے کے تحت تجربات ہوئے تو فرد کی شخصی خصوصیات بھی زیر بحث آئیں اور ماہرین نفسیات نے فرد کی شخصیت کی اس خصوصیت کو بھی اہمیت دینا شروع کی۔

سگمنڈ فرائڈ نے جب اپنا نظریہ پیش کیا تو اس زمانے کے ماہرین نفسیات میں بحث شروع ہوگئی۔ کئی مفکرین نے ابتدا میں تو اس کی سخت مخالفت کی اور بہت سے ماہرین نفسیات نے اس نظریہ پر تجربات کا سلسلہ شروع کیا۔ تجربات کے دوران فرد کی شخصی خصوصیات بھی زیر غور رہیں۔ 1911 میں فرائڈ کے ایک شاگرد Otto Rank نے پہلی بار یہ لکھا کہ فرد کی نرگسی شخصیت اپنے اندر ایک منفی پہلو بھی رکھتی ہے۔ اس کے خیال میں نرگسی شخصیت رکھنے والے فرد میں غرور اور تکبر کا مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے فرد معاشرے میں اپنا مقام کھو دیتا ہے۔ 1914 میں سگمنڈ فرائڈ نے ایک مقالہ An Introduction On Narcissism کے عنوان سے لکھا۔ اس مقالے میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ابتدائی نرگسیت ہر فرد میں جبلی طور سے پائی جاتی ہے۔ اس نے لکھا کہ فرد میں اس کی ابتدائی زندگی سے ہی انا کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ بعض بچوں میں یہ جذبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب نرگسیت کی ابتدا ہوتی ہے۔

جیسے جیسے فرد کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں معاشرے کا کردار شروع ہوتا ہے تو اس کی نرگسی شخصیت کی خصوصیت بھی ابھر کر آتی ہے۔ چونکہ نرگسی شخصیت رکھنے والے فرد میں خود پرستی اور خود نمائی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ کسی بھی شکل میں اپنی شکست برداشت نہیں کر سکتا۔ جب

اس کو کسی موقعے پر شکست کا سامنا ہوتا ہے تو وہ بپھر جاتا ہے اور جب اس کا بس نہیں چلتا تو وہ ٹوٹ جاتا ہے، بکھر جاتا ہے۔ بعض لوگوں میں یہ کیفیت کچھ زیادہ پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب ایسے لوگ شکست کا سامنا کرتے ہیں تو برداشت نہیں کر پاتے۔ اتنا ہی نہیں بعض لوگ نفسیاتی اعصابی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگوں کو اپنی شکست کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ مراجعت کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے ماضی میں لوٹ جانے کی کوشش کرتے ہیں جہاں گھر کا ہر فرد اس کی خوشی کا خیال رکھتا تھا اور اس کی ہر خواہش کی آسودگی کی کوشش کی جاتی تھی۔

فرائڈ نے نرگسیت کو ایک الجھاؤ (Complex) کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ الجھاؤ عہد طفلی کی دین ہوتا ہے۔ ہر بچہ اپنے ماں باپ اور بڑے بہن بھائی کی آنکھ کا تارہ ہوتا ہے اور اس کو خاندان میں بے حد پیار اور توجہ حاصل ہوتی ہے۔ سب رشتے دار اس کی ہر خواہش کا خیال رکھتے ہیں۔ فرائڈ کے خیال میں ایسی کیفیت میں جب لبیڈو (Libido) کا رخ اس کی اپنی ذات کی طرف ہوتا ہے تو اس کو نرگسیاتی لبیڈو (Narcissistic) کہنا چاہیے۔ بچہ جب بڑا ہونا شروع ہوتا ہے تو اس کو احساس رہنے لگتا ہے کہ اس کے رشتے دار اور متعلق افراد اس کی طرف اب پہلی سی توجہ نہیں دے رہے جتنی وہ عہد طفلی میں پاتا رہا ہے۔ یہ احساس بعض بچوں میں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اور ایسے بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو نفسیاتی طور پر وہ ایک الجھاؤ (Complex) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ فرائڈ کے اس خیال سے بعد کے مفکرین متفق نہیں تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر فرائڈ کے اس خیال کو تسلیم کر لیا جائے تو ہر بچہ بڑا ہو کر اس الجھاؤ کا شکار ہو سکتا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

فرائڈ کے بعد بھی تحلیل نفسی کے تجربات میں مصروف ماہرین نے نرگسی شخصیت پر تحقیقات جاری رکھیں۔ 1960 کے آس پاس ایک اور ماہر نفسیات Otto Kermberg نے اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی دکھائی اور اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1967 میں پہلی بار نرگسی شخصیت کے منفی پہلو پر بھی غور کیا گیا۔ ایک اور ماہر نفسیات Heinz Kohut بھی اس کے ساتھ جڑ گیا اور اگلے سال ہی کوہٹ نے شدید نرگسی شخصیت کے منفی اثرات کو ایک نفسیاتی ذہنی خلل قرار دیتے ہوئے (Narcissistic Personality Disorder) کی اصطلاح استعمال کی۔ اور کچھ ہی سال بعد دماغی عارضوں سے متعلق Manual میں اس کو دماغی ذہنی عارضہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ موضوع نفسیاتی دائرے سے نکل کر میڈیکل سائنس کے زمرے میں آ گیا۔

فرائڈ نے نرگسی شخصیت کو ایک الجھاؤ کی شکل میں پیش کیا۔ حالانکہ اس نے بار ہا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ الجھاؤ لاشعوری ہوتا ہے اور فرد کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کی شخصی خصوصیات نرگسیت سے متعلق ہیں۔ فرائڈ نے یہ بھی لکھا ہے کہ نرگسی شخصیت کی ایک خصوصیت فرد میں خود اعتمادی کی زیادتی ہوتی ہے اور یہی خاصیت اس فرد میں آمرانہ رجحان بھی پیدا کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر این جی ہال نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نرگسیت کی شدت کی وجہ سے بہت سے حاکم ایسے گزرے ہیں جو اپنی اس انائی کیفیت کی وجہ سے ڈکٹیٹر بن گئے اور اپنی آمرانہ خصوصیات کی بنا پر تاریخ میں یاد کیے جاتے ہیں۔

■

Syed Iqbal Amrohvi, 609/B, A.K. Tower, Madina Manzil Complex, S. V. Road, Goregaon (w), Bombay - 400062 MS)

مصنف: و۔س کھانڈیکر
ترجمہ: محمد اسد اللہ

مراٹھی کہانی

مینار

سروجنی بائی تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ دس بارہ قدم ہی تو چڑھنا تھا، پھر بھی وہ ہانپ گئیں اور بڑبڑانے لگیں۔ 'وزن تھوڑا کم کرنا پڑے گا۔ صبح اٹھ کر ذرا گھومنے جانا چاہو تو ان کاموں سے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ یہ نوکری، یہ مہیلا منڈل...'

مگر آج تیزی سے چڑھنا ضروری تھا کیونکہ رسالہ 'رمنی' کی رپورٹر کو انٹرویو کے لیے ساڑھے پانچ بجے کا وقت دیا تھا اور آفس ہی میں چھ بج گئے۔ محکمہ تعلیمات کے کاموں کا بوجھ کسی مصیبت سے کم نہ تھا۔ اسی حال میں رات کا سفر در پیش تھا۔ نوکروں کی حالت یہ تھی کہ انتہائی غیر ذمے دار۔ سفر کی تیاری ان کے سپرد کی جائے تو ضرور کچھ نہ کچھ بھولیں گے۔ پچھلی مرتبہ پانڈو نے ٹوتھ پیسٹ رکھا تو برش چھوڑ دیا۔ بلاوجہ نیا خریدنا پڑا۔

سروجنی بائی نے دروازے پر لگے کال بیل کے بٹن پر آہستہ سے انگلی رکھی۔ پانڈو نے دروازہ کھولا۔ اندر آتے ہی انھوں نے ڈرائینگ روم میں جھانک کر دیکھا اور ان کا پارہ چڑھ گیا۔ پانڈو کو آواز دے کر بلایا۔ 'پہلے ایک بھٹ برین ٹانک ملا کرتا تھا، تجھے وہ اپنی یاد داشت کے لیے لینا چاہیے۔ شام میں ایک بڑی شخصیت گھر آنے والی ہے یہ میں نے تجھے بتایا نہیں تھا کیا؟ ٹیبل کلاتھ بدلنے کے لیے کہا تھا نا؟'

پانڈو نے بیل کی طرح سر ہلایا اور ٹیبل کلاتھ لانے کے لیے دوڑتا ہوا اندر گیا۔ اسی دوران سروجنی بائی کو یاد آیا کہ انھوں نے دوپہر میں نوکرانی پر غصہ اتارا تھا۔ 'وینو تائی۔ وینو تائی' کہہ کر اسے بلایا۔ ایک خشک چہرے والی بڑھیا دروازہ کے درمیان آ کر کھڑی ہوگئی۔ سروجنی نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگیں۔ 'دینو تائی! دوپہر میں دال میں نمک زیادہ پڑ گیا تھا، اس لیے میں نے تمھیں ذرا سخت سست کہہ دیا تھا، مگر تم اسے دل پر مت لینا۔ میرے بلڈ پریشر کی وجہ سے ڈاکٹر نے نمک کم کرنے کو کہا ہے اور ان سماجی کاموں نے الگ مصیبت کھڑی کر رکھی ہے۔ اس پر نمک زیادہ نہیں چاہیے اور ابھی ایک بائی آنے والی ہے۔ میرا انٹرویو لینے کے لیے۔ اس لیے تم نا، ذرا شاندار اُپّیٹ بناؤ نمک لیکن ذرا سنبھال کے ڈالنا۔'

وینو تائی اندر چلی گئیں۔ ذرا دیر پہلے پانڈو کو جیسے کوئی ڈانٹ پلائی نہیں اور وینو تائی نے بھی دوپہر کی ان کی غلطی کو معاف کر دیا۔

اس احساس سے سروجنی بائی کو اطمینان ہوگیا۔

یہ سب عام لوگ ہیں۔ ان سے مجھ جیسی محکمہ تعلیمات کی اعلیٰ عہدیدار کو اس طرح الجھنا ٹھیک نہیں۔ ان کی دنیا گویا جھاڑیاں ہیں اور میری حیثیت تو کسی بلند قامت ناریل کے درخت کی طرح ہے۔ یہ تمام لوگ زمین پر رہنے والے ہیں، روزی روٹی کے لیے دوڑ دھوپ میں مصروف رہتے ہیں۔ سماج سدھار، مقصدیت، قدریں وغیرہ الفاظ تو ان بے چاروں نے کبھی سنے بھی نہ ہوں گے۔

اگلے لمحے ہی سروجنی بائی کا دل پانڈو اور وینو تائی کی دنیا سے پھر گیا اور وہ کسی تتلی کی طرح پھر سے اڑ کر اپنے اونچے مینار پر جا بیٹھیں۔

'اُپّیٹ بہت اچھا بنا ہے۔' سروجنی بائی کے سامنے کرسی پر بیٹھی نوجوان لڑکی نے کہا۔ سروجنی بائی اس کے جواب میں صرف مسکرا کر رہ گئیں۔ قدرے توقف سے کہنے لگیں، 'چلو اب ہم اپنا کام شروع کریں۔ رات ساڑھے نو کی گاڑی سے مجھے جانا ہے۔ شری رنگا پور کے اسکول کا معائنہ کرنا ہے کل۔'

انٹرویو کے لیے آئی لڑکی نے قلم سنبھالا اور کہنے لگی۔ 'پچھلے مہینے ایک مہیلا منڈل میں آپ کی تقریر ہوئی اس میں بڑے انقلابی خیالات پیش کیے تھے آپ نے۔ اسے بہت لوگوں نے پسند کیا تھا۔ اس میں آپ نے کہا تھا، 'خواتین کو ملازمت کرنی ہوگی انھیں سجنے سنورنے کے لیے اب وقت نہیں ملے گا۔ اس لیے انھیں اپنے بال کٹوا دینے چاہیے۔ نوکرانی سے لے کر گھر کا کام کرنے والی تمام عورتوں کو؟'

سروجنی بائی نے مسکرا کر جواب دیا۔ 'بھئی یہ تو ایک عام سی بات ہوئی۔ نہ جانے سماج سدھار کے کتنے کام ابھی باقی ہیں۔ زمانہ بدل گیا مگر عورتیں ہیں کہ کسی طرح بدلنے کو تیار ہی نہیں۔ اگر انھوں نے اپنے آپ کو تبدیل نہیں کیا تو آئندہ زمانے میں ایسی دقیانوسی عورتیں چلنے والی نہیں، لیکن ان باتوں کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں۔ ایک میری بات جانے دیجیے، سماجی اصلاح تو میری گھٹی میں پڑی ہے۔'

'یعنی؟' لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا۔

'بھئی میرا نام ہی دیکھیے، کس قدر شاعرانہ ہے۔ پچاس سال پہلے میرے دادا نے رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ 'مُوک نایک' جیسا رومانی ڈراما نہیں۔ اس ڈرامے کی ہیروئن سروجنی انھیں بہت پسند تھی۔'

'مُوک نایک'، اس ڈرامے میں رومانیت کہاں سے آ گئی؟'

'پتہ نہیں کیا ہے؟ میں نے بھی کہاں پڑھا ہے۔ مگر میرے دادا کہا کرتے تھے کہ اس جیسا رومانی ڈراما آج تک نہیں دیکھا۔ ان کے والد نے پنچ حوض مشن میں چائے پی تھی، جسٹس راناڈے نے عہد کیا تھا تب لیکن میرے دادا تھے صحیح معنوں میں سماج سدھارک۔ اس زمانے میں وہ ان گیدڑ بھبکیوں کو کبھی خاطر میں نہیں لائے۔'

انٹرویو کے لیے آئی ہوئی لڑکی کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ پنچ حوض مشن، چائے کا معاملہ، جسٹس راناڈے کا عہد۔ وہ ان سب بکھیڑوں سے نابلد تھی۔ وہ کہنے لگی۔ 'یہ سب پرانی باتیں بڑی مزیدار ہیں مگر آپ کو رات کی گاڑی سے جانا بھی تو ہے۔ اس لیے رمنی کے اگلے شمارہ میں ہم مہیلا منڈل والی آپ کی تقریر شائع کریں گے۔ اس کے لیے آپ کی ایک خوبصورت سی تصویر چاہیے اور آپ کے متعلق تھوڑی معلومات۔

آپ محکمہ تعلیمات میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور سیکڑوں کاموں میں گھری رہتی ہیں۔ یہ سب کرتے ہوئے سماج سدھار کے لیے تقریر کرنا، مضامین لکھنا۔ یہ سب آپ کیسے کر لیتی ہیں؟

کسی قدر طیش میں آ کر سروجنی بائی کہنے لگیں، 'ارے یہ سب انسان کی فطرت میں ہوا کرتا ہے۔ میرے تایہ زاد دادا نے دوسری شادی کی تھی میرے والد انسدادِ ذات پات کی انجمن کے صدر تھے۔ انھوں نے میرے لیے ایک آئی ایس افسر کا رشتہ دیکھ رکھا تھا۔ لیکن میں نے صاف کہہ دیا تھا مجھے وہ پسند نہیں۔'

'گاندھی جی کی تحریک میں تھیں آپ؟'

'کسی تحریک وحریک میں نہیں تھی بائی میں، لیکن میں نے تمھیں ابھی بتایا نا کہ ہمارے خاندان میں سماج سدھار کی روایت بہت پرانی ہے۔ تمھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس پرانے زمانے میں میں نے لَو میرج کی تھی۔'

انٹرویو کرنے والی لڑکی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے لگا اب کوئی چٹخارے دار کہانی سننے کو ملے گی۔ اس خواہش کو وہ بمشکل دبا کر کہنے لگی۔ 'آپ کہہ رہی تھیں آپ کی تقریریں اور مضامین...'

'میں کوئی مضامین لکھنے والی اور بھاشن بازی کرنے والی بائی نہیں ہوں۔ معاشرے کی اصلاح کے خیالات لگاتار میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اب تعلیم کا فروغ ہو رہا ہے۔ جہاں جہاں میں معائنے کے لیے جاتی ہوں وہاں ٹیچرس کے ساتھ ان کی سطح پر اتر کر بات کرتی ہوں۔ بیس پچیس سال عمر کی ان معلمات کے سکھ دکھ میں شریک ہوتی ہوں۔ کوئی ہونہار لڑکی نظر آئے تو اس کی پیٹھ تھپتھپاتی ہوں۔ اسے حوصلہ دیتی ہوں کہ وہ خوب تعلیم حاصل کرے۔ غریب طلبہ کی مدد کرتی ہوں۔ اس پر یونہی یاد آ گیا اس لیے بتا رہی ہوں مگر یہ آف دی ریکارڈ ہے۔ کل شری رنگاپور جانے والی ہوں۔

گزشتہ سال وہاں سوشل گیدرنگ میں ایک لڑکی نے پانچ انعامات حاصل کیے تھے اس کا نام ابھی تک نہیں بھولی ہوں میں۔ انجلی اجگاؤں کر۔

لگتا تھا وہ لڑکی کسی غریب گھر کی تھی۔ بالکل سادہ سی ساری پہنے ہوئے تھی لیکن کتنی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ تقریب ختم ہوئی تو میں نے اسے ایک نوٹ تھما دیا۔ وہ نہیں لے رہی تھی مگر میں نے اسے کہا، 'تم میری بیٹی کی طرح ہو۔'

دروازے پر لگی کال بیل بج اٹھی۔ سروجنی بائی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں اور انھوں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ 'کتنا سدھار ابھی باقی ہے۔ دروازے پر کال بیل لگے ہوئے اس ملک میں برسوں ہو گئے مگر اسے بجانا لوگوں کو ابھی تک نہیں آیا۔'

دروازہ کھولنے کے لیے جاتے ہوئے پانڈو کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگیں، 'دیکھیے ایسا ہوتا ہے، کوئی ایک کام نہیں ہونے دیتے لوگ۔ اب تم چلو۔ میں شری رنگاپور سے پرسوں لوٹوں گی۔ اس دن شام ساڑھے پانچ بجے تم آؤ تو اپنا فوٹو بھی دوں گی اور انٹرویو بھی پورا ہو جائے گا۔'

تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی لمبی قطار سے گزر کر سروجنی بائی اپنے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف آئیں۔ لوگوں کی بے تحاشا بھیڑ دیکھ کر وہ حسبِ معمول ایک لمحے کے لیے گھبرا گئیں۔ ڈبے میں سوار ہونے کے بعد نوکر سے ہولڈال کھلوا کر اطمینان سے بیٹھ گئیں اور کچھ پڑھنے کی غرض سے ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگیں۔ اس دوران ان کی برتھ کے سامنے والے برتھ پر ایک صحتمند شخص آ کر بیٹھ گیا جس کی عمر تقریباً ساٹھ سال رہی ہوگی۔ سروجنی بائی نے اسے پہچان لیا۔ وہ بوڑھا وکیل ایک بوٹے تھا جو فوجداری مقدمات کے لیے خاصا مشہور تھا۔ دونوں میں آداب سلام کے بعد موسم کا تذکرہ ہوا اور پھر گھریلو معاملات پر گفتگو ہونے لگی۔ سروجنی بائی انھیں بڑے فخر کے ساتھ بتانے لگی کہ اس کا ایک بیٹا آرکی ٹیکٹ بن کر کینیڈا چلا گیا، خوب کمانے لگا ہے اور اس نے کسی امریکن لڑکی سے شادی کر لی۔

'یہ سب آپ جیسے سماج سدھارکوں کے خاندان کے شایانِ شان ہے۔' ایک بوٹے نے کہا۔

اس بات میں کوئی طنز تو نہیں؟ یہ سوال سروجنی کے ذہن میں ابھرا اور اسی دوران وکیل صاحب نے دوسرا سوال پوچھ لیا۔ 'آپ کی ایک بیٹی بھی تھی نا؟'

اثبات میں سر ہلا کر سروجنی بائی نے کہنا شروع کیا 'پچیس تیس سال پہلے کوئی خاندانی منصوبہ بندی پر دھیان نہیں دیتا تھا۔ مگر اس زمانے میں بھی میں نے ٹھان رکھی تھی کہ صرف دو ہی بچوں تک محدود رہنا ہے حالانکہ میرے مسٹر کو یہ پسند نہیں تھا۔ مگر میں پیچھے نہیں ہٹی۔'

ایک بوٹے نے درمیان میں پوچھ لیا، 'لڑکی کیا کرتی ہے آپ کی؟'

سروجنی ایک لمحے رک کر کہنے لگی، 'اس کا دھیان ہی نہیں ہے کتابی تعلیم میں۔ She is a born Artist ڈانس سیکھا ہے اس نے کیا کہتے ہیں اسے بھرت کہ دشمنیت نایہ، وہ تعلیم حاصل کی ہے۔ ہمیشہ کلچرل پروگراموں میں مصروف رہتی ہے۔ بڑے بڑے کلاکاروں سے جان پہچان ہے اس کی۔'

ٹرین چل پڑی، بات چیت رک گئی۔ سروجنی بائی نے ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کی مگر ان کا دماغ

کہیں اور ہی تھا۔اس بات چیت نے ان کے دل کے دو زخموں کو کرید کر رکھ دیا تھا۔

لو میرتج کرنے کے باوجود ان کا شوہر ان کے قابو میں نہیں تھا۔رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اس کا سبب ان کا معمولی رنگ و روپ ہی نہ ہو۔

آخر اس پیار کا کیا مطلب ہے؟ وہ اپنے آپ سے یہ سوال کیا کرتیں۔ جب انسان ناگوار اور عریاں حقیقتوں کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا تو نازک خیالات کے پھولوں سے اپنی زندگی سنوارنے کی کوشش کرتا ہے۔اب بھی وہی ہوا۔مرد اور عورت کے جسمانی رشتے کو خوبصورت سی شکل دینے کے لیے شاعروں نے اسے محبت کا نام دے رکھا ہے۔وہ سوچنے لگیں اور پھر اس خیال کو انھوں نے اس طرح اپنے ذہن سے جھٹک دیا جیسے جسم پر کوئی جھینگر گر پڑا ہو۔

شوہر کی طرح وہ اپنی بیٹی کے متعلق بھی سوچتی رہیں مگر اسے اپنے دل و دماغ سے کسی طرح نہ نکال پائیں۔اب تک اس کی شادی ہو جانی چاہیے تھی۔اپنی برابری کا خاندان ڈھونڈنے جائیں تو اس کا رنگ و روپ رکاوٹ بن جاتا ہے۔لڑکیوں کی بے فکری کا یہ عالم ہے کہ اس طرف سے انھوں نے جیسے آنکھ بند کر رکھی ہو۔

کل شری رنگا پور میں کیا مصروفیات ہوں گی اس کی فہرست وہ تیار کرنے لگیں۔اس سے پہلے ہی انجلی کا چہرہ ان کے تصور میں ابھر آیا۔خوبصورت چہرہ، بوٹا سا قد، بھرے بھرے بالوں کی دو چوٹیاں اس نے اپنی پیٹھ پر ڈال رکھی تھیں۔لڑکیوں کو اپنی زلفیں کٹوا دینا چاہیے یہ بات وہ اکثر کہا کرتی تھیں مگر یہاں مناسب نہیں تھی۔میری بیٹی کو بھی اس جیسی شکل وصورت مل جاتی تو کیا بات تھی۔کسی منتری یا صنعتکار کا بیٹا ضرور ان کا داماد بن جاتا۔ قدرت بھی عجیب ستم ظریف ہے۔جھونپڑیوں کے آگے موگرے کے پودے اگاتی ہے اور بنگلوں کے سامنے خار دار جھاڑیاں۔

انجلی کے تصور سے وہ پوری تقریب ان کی نظروں میں گھوم گئی۔اس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے یہ تذکرہ بھی کر ڈالا کہ کس طرح سنسکرت سے متعلق ایک اسکالرشپ چند نمبرات کم ہونے کے سبب انھیں نہ مل پائی تھی۔ تعلیم سے متعلق ان کی حوصلہ افزا باتوں کو بہت سراہا گیا۔

گیارھویں کلاس سے جب سروجنی بائی باہر نکلیں تو ان کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔اس کلاس میں کسی مشکل سنسکرت شلوک کے معنی پوچھنے پر جب دوسری لڑکیاں گڑبڑا جائیں گی تو انجلی کی طرف دیکھ کر وہ پوچھیں گی 'انجلی تم بتاؤ اس کا مطلب' اور لڑکیاں یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گی کہ انجلی کا نام تک انھیں یاد ہے۔ ہیڈ مسٹریس موڈک بائی اور لڑکیوں کی تعریفی نظریں انھیں خوشی سے سرشار کر دیں گی۔اس تصور سے وہ جھوم اٹھی تھیں، لیکن جھاڑو کے ایک وار سے کسی گوشے میں لگے مکڑی کے جالے جس طرح صاف ہو جاتے ہیں اسی طرح ان کے ارادوں پر پانی پھر گیا۔انھیں کلاس میں انجلی کہیں نظر نہیں آئی۔ پوچھنے پر کلاس ٹیچر نے جواب دیا 'اس لڑکی کا تو پڑھائی میں دھیان ہی نہیں ہے۔اسکول بھی کبھی آتی ہے کبھی نہیں۔' یہ بات سروجنی بائی کو بہت ناگوار گزری کہ وہ معائنے کے دن غیر حاضر رہے۔ چائے کے دوران انھوں نے وہ موضوع پھر چھیڑا۔'کبھی کسی نے یہ جاننے کی بھی کوشش کی ہے کہ وہ اس طرح کیوں غیر حاضر رہتی ہے، کلاس ٹیچر نے ڈرتے ڈرتے کہا، 'وہ اکثر چھٹی کی درخواست بھیج دیتی ہے۔'

'چھٹی کی درخواست کو لے کر کیا آگ لگانا ہے۔' اتنی ذہین لڑکی پچھلے سال اسے پانچ انعامات ملے اگر ضائع ہو گئی تو کیا یہ ملک کا نقصان نہیں؟'

ریاضی کے ٹیچر نے درمیان میں کھنکھارتے ہوئے کہا، 'میڈم! آپ جو کہہ رہی ہیں درست ہے مگر آج کل پڑھنے والی لڑکیوں کے دل و دماغ کو بھٹکانے والی کئی چیزیں ہمارے سماج میں آگئی ہیں۔واہیات فلمیں ہیں، ہوٹلیں ہیں' اور ایک لمحہ کے توقف کے بعد ہچکچاتے ہوئے کہا، 'اسکول میں بھی آنے والی ڈاک میں پریم پتروں کے ڈھیر لگے ہیں۔'

سفید بالوں والے اس ٹیچر کے چہرے پر ایک دہکتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے بے دھیانی میں سروجنی بائی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے ٹیبل پر مکا مارتے ہوئے کہا، 'صرف بیماریوں کی فہرست پڑھنے سے علاج نہیں ہوتا، ڈاکٹر کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بیماری کیسے دور ہوگی۔'

اس انجلی کا یہ ایس ایس سی کا سال ہے پھر بھی وہ اتنی غیر حاضر کیوں ہے اس کی پریشانی کیا ہے اس کے بارے میں تم میں سے کسی نے انکوائری نہیں کی؟'

موڈک بائی جلدی سے درمیان میں بول پڑیں، 'میں نے اپنے آفس میں بلا کر اس سے پوچھا تھا تو اس نے کہا سات آٹھ مہینے پہلے اس کی ماں چل بسی، اس لیے اسے گھر کے کام کرنے پڑتے ہیں اور چھوٹے بھائیوں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔'

سروجنی بائی نے طنزیہ لہجے میں کہا' اور اس پر آپ کو اطمینان ہو گیا؟ اتنی ہونہار لڑکی کی تعلیم ادھوری رہ جائے اس پر آپ کو برا نہیں لگا۔اسی لیے ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔وہ کچھ نہیں ابھی فوراً انجلی کے گھر چپراسی بھیج کر اسے بلواؤ۔میں نے بلایا ہے کہو اسے، مجھے رات کی گاڑی سے لوٹنا ہے۔پانچ منٹ میں میں اس کی گاڑی دیکھو کیسے پٹری پر لاتی ہوں۔'

اسکول کے مہمان خانہ میں انجلی آئی۔وہ سہمی ہوئی تھی اور سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اتنی بڑی شخصیت نے اسے کیوں بلایا ہے۔وہ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہی تھی۔سروجنی بائی نے کہا، 'بیٹا! ادھر آؤ، بیٹھو اس کرسی پر'۔تب بھی وہ کسی پتھر کی مورت کی طرح اپنی جگہ کھڑی رہی۔

بائی اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتی ہوئی کہنے لگیں۔'ارے تم میری بیٹی کی طرح ہو۔ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔بیٹھو میرے پاس اور تم آجکل اتنی غیر حاضر کیوں رہتی ہو، ذرا کھل کر بتاؤ۔'

اس کا ہاتھ تھام کر اسے قریبی کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔انجلی نے کوئی جواب نہ دیا۔اپنی اوڑھنی کا سرا منہ میں ڈال کر ہچکیاں روکنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔آخر روک نہ پائی اور پھر سر اٹھا کر اوڑھنی آنچل سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔بائی نے کہا۔'اس طرح رونے سے کیا ہوگا۔پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو کسی نہ کسی سے تو نکلوانا ہی پڑے گا نا۔ارے تمھارے جیسی ذہین لڑکی تو ہزاروں میں ایک ہوا کرتی ہے۔

'انجلی نے اشک آلود آنکھوں سے بمشکل اوپر دیکھا اور کہنے لگی، 'آٹھ مہینے ہو گئے میری ماں کے انتقال کو۔' سروجنی بائی اسے سمجھانے لگی، میری ماں کا بھی جب میں چھوٹی تھی انتقال ہو گیا تھا، مگر میں بھی روتی نہیں رہ گئی۔اتنی تعلیم حاصل کی، نوکری میں اتنی ترقی کی تمھاری سنسکرت بہت اچھی ہے اس لیے بتا رہی ہوں، رگھونش کے آٹھویں ادھیائے میں ہے۔آج راجہ کی چہیتی بیوی اندومتی اچانک مر جاتی ہے۔اس کی حالت بھی تیری طرح ہی ہوتی ہے۔اس کے گرووششٹ

رشی اسے تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے یہاں سے جانا ہی ہے۔'

'مجھے یہ سب سمجھتا ہے بائی مگر......'

'روپئے پیسے کی پریشانی ہوگی تجھے۔ ہے نا، میں ایسا کرتی ہوں ہر مہینے تجھے اسکول کے پتہ پر منی آرڈر سے کچھ رقم بھجوا دیا کروں گی مگر یہ خیال رکھنا اسکول سے غیر حاضر نہیں رہنا، تجھے پڑھ لکھ کر مجھ سے بھی آگے نکلنا ہے۔'

انجلی کے اندر سے کوئی دکھ پھوٹا پڑ رہا تھا، مگر وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔ 'آپ کی یہ محبت میں کبھی نہ بھولوں گی مگر.....'

بائی مسکرا کر کہنے لگی۔ 'مگر وگر کچھ نہیں اب تمھارے سامنے ایک ہی راستہ ہے تمھیں جیتنا ہے۔ خوب پڑھو۔ جب تم اعلیٰ تعلیم کے لیے پردیس جاؤ گی تو اس وقت تمھارے لیے الوداعی جلسہ منعقد کریں گے میں اس کی صدارت کروں گی۔'

انجلی کا چہرہ اتر گیا۔ ہونٹ تھر تھرانے لگے۔ پیر کانپنے لگے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

الفاظ اس کے ہونٹوں پر آ کر اس طرح رک گئے جیسے قید خانے سے فرار ہونے والے قیدی کو پہرے دار دروازے پر روک لے۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی موڈک بائی اندر آتی ہوئی کہنے لگی 'سوری، یہاں کی مہیلا منڈل کی صدر آئی ہوئی ہیں ان کی انجمن میں آپ چل کر پانچ منٹ کے لیے ہی سہی ان سے خطاب کریں۔ ان کی بڑی خواہش ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں آپ نہیں آئیں گی تو ہم دھرنا دیں گے، سروجنی بائی یہ کہتے ہوئے ہنستی ہوئی اٹھیں۔ 'کیا کریں، جانا ہی پڑے گا، لوک شاہی کا زمانہ ہے۔'

سروجنی بائی کی ٹیکسی اسٹیشن کے قریب آئی۔ تب ان کی ٹرین چھوٹنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ موڈک بائی نے ان سے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے دو مرتبہ بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کل شام کی ان کی تقریر پر پڑنے والی تالیوں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھیں کہ ہوں ہاں کے علاوہ کوئی جواب نہ دیا۔

کھرر کی آواز کے ساتھ ٹیکسی رکی۔ سروجنی بائی ٹیکسی سے اترنے بھی نہ پائی تھیں کہ انھیں محسوس ہوا سامنے بھیڑ میں سے راستہ بناتی ہوئی کوئی لڑکی ان کی طرف چلی آ رہی ہے۔ انھوں نے غور سے اس طرف دیکھا وہ انجلی ہی تھی۔ ایک لمحے کی حیرانی کے بعد ان کے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی۔ شام میں کی گئی ان کی نصیحت آمیز باتیں آخر اس لڑکی کی سمجھ میں آ ہی گئیں۔ پیچھے مڑ کر انھوں نے موڈک بائی کو ان کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں رکھوانے کی ہدایت کی، پھر قریب آتی ہوئی انجلی کا مسکرا کر استقبال کیا۔ کہنے لگیں 'اری پگلی! اس وقت اسٹیشن پر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ تو عقلمند لڑکی ہے۔ میں نے جو کہا ہے تو ضرور سنے گی۔ مجھے معلوم تھا۔ میں ہر مہینے بلا ناغہ تجھے روپیہ بھجواؤں گی، انجلی کچھ بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

'بائی، بائی' ان الفاظ کے علاوہ اس کے منہ سے کوئی لفظ نکلتا ہی نہ تھا۔ سروجنی بائی نے اپنائیت سے کہا۔ 'تم اس طرح گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔؟ میں شام میں تم سے ناراض نہیں تھی۔'

انجلی کانپتی ہوئی بولی 'ویسی بات نہیں ہے بائی۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے، ذرا ادھر آیئے۔'

انجلی کو ممتا بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی سروجنی بائی بڑبڑائیں، 'بڑی عجیب ہوتی ہے یہ عمر'، انجلی کی بات دو منٹ میں سن کر تسلی کے دو لفظ اسے کہنا ہے اور موڈک بائی سے کہہ کر اسے اس کے گھر چھوڑنے کا انتظام کروانا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اسے فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں لے گئی وہاں کوئی نہ تھا۔ کھڑے کھڑے سروجنی بائی کہنے لگی۔ 'گاڑی کا وقت ہو رہا ہے انجلی!'۔

نیچے دیکھتی ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں انجلی نے کہا 'بائی میں آپ کے ساتھ آؤں؟'

سروجنی بائی چونک پڑیں پھر پوچھا۔ 'میرے ساتھ کہاں؟'

کانپتی ہوئی آواز میں انجلی نے کہا۔ 'آپ کے گھر میں برتن دھوؤں گی، نوکرانی کی طرح کام کروں گی مجھے پڑھنا ہے، خوب تعلیم حاصل کرنی ہے۔'

'ارے یہاں رہ کر تجھے پڑھنے سے کون روک رہا ہے؟'

مجھ سے یہاں پڑھا نہیں جاتا بائی! کچھ کر کے بھی میرا دل نہیں لگتا۔ رات میں بارہ بجے تک جاگنا پڑتا ہے۔'

جاگنا پڑتا ہے، کس لیے؟

انجلی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، 'ماں کا دھندا کرنا پڑتا ہے مجھے۔ نفرت ہے مجھے اس کام سے لیکن...'

سروجنی بائی ایک لمحے کے لیے پتھرا گئیں۔ اب ان کا دماغ روشن ہوا۔ انجلی کی ماں جسم فروشی کے دھندے میں مبتلا تھی۔ جب وہ نہ رہی تو اس کا پورا خاندان اس نوجوان لڑکی کے بل پر جی رہا تھا۔ اس خاندان کی اور اس پیشے سے وابستہ لڑکی کو کیا وہ اپنے گھر لے جائے گی؟ سولہ سترہ سال کی یہ لڑکی جس کی بدولت وہ خاندان پل رہا ہے کیا اتنی آسانی سے اسے چھوڑ دے گا؟ کل اخباروں میں یہ معاملہ اچھالا گیا تو وہ مہذب سماج جہاں وہ رہتی ہے اسے کیا کہے گا؟ اپنے شوہر کو وہ خوب اچھی طرح جانتی تھی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر تو وہ اس عمر میں بھی آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اپنی بیٹی بھی تو پہلے ہی ہاتھ سے نکلی ہوئی ہے اس حال میں اگر یہ لڑکی اس کے گھر آ گئی تو...،

سروجنی بائی کو زبردست گھٹن کا احساس ہوا اسے لگا جیسے اس کے سامنے کوئی بچہ ندی میں ڈوب رہا ہے۔ اسے تھوڑا تیرنا آتا ہے لیکن اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے ڈر سے وہ پانی میں نہیں اتر پاتی۔ اس کا دل چاہا کہ انجلی کو تسلی دینے کی خاطر وہ کچھ کہے مگر الفاظ اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔

موڈک بائی اندر آئیں اور کہنے لگیں، 'دوسری بیل ہو چکی ہے سنا نہیں آپ نے؟'

سروجنی بائی میں انجلی کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ تھی وہ کسی چور کی طرح نظریں جھکائے ہوئے اس کمرہ سے باہر نکلیں اور ٹرین میں سوار ہو گئیں۔ ٹرین چل پڑی اور سرپٹ دوڑنے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر تک سروجنی بائی کھڑکی کے پاس کھڑی کسی پاگل کی طرح باہر پھیلے اندھیرے کو گھورتی رہی۔ انھیں محسوس ہوا اس دوڑتی ہوئی ٹرین کے پیچھے انجلی دوڑتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اس کے الفاظ فضا میں گونج رہے تھے۔ 'بائی! میں آپ کے ساتھ چلوں؟'، بائی! میں آپ کے ساتھ چلوں؟'

سروجنی بائی نے زور سے کھڑکی بند کی۔ انجلی کی اس گھناؤنی دنیا کی طرف سے پیٹھ پھیر کر ان کے دل کا پرندہ اپنی خوبصورت دنیا کی طرف اڑ کر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اپنے محفوظ مینار پر جا کر بیٹھنا تھا، لیکن اس کے بازوؤں میں اب وہ قوت کہاں باقی تھی۔ اور وہ مینار بھی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

■

Dr. Mohd Asadullah, 30, Gulsitan Colony, Pandey, Amrai Loans, Nagpur - 440013 (MS)

ظہیر احمد صدیقی

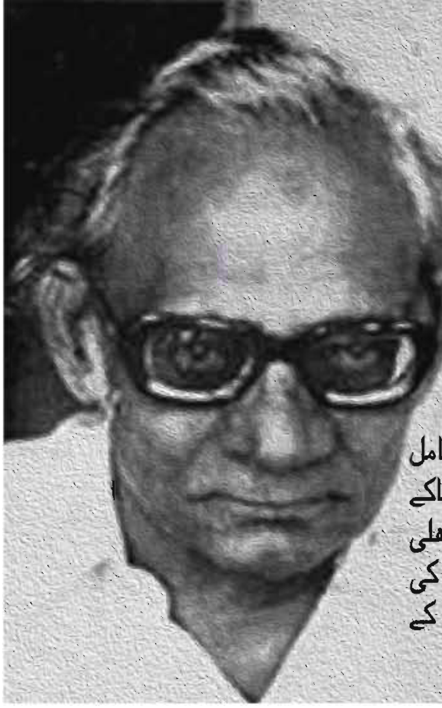

خواجہ احمد فاروقی (خاکہ)

خواجہ احمد فاروقی کا یہ خاکہ ظہیر احمد صدیقی کی کتاب 'فکری زاویے' میں شامل ھے۔ یہ کتاب نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے جنوری 1972 میں شائع ہوئی تھی۔ اس خاکے میں خواجہ احمد فاروقی کی اردو سے بے پناہ محبت کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو دھلی یونیورسٹی کی سرگذشت بھی رقم ہوگئی ھے جو خواجہ احمد فاروقی کی شخصیت کے عکس جمیل کی طرح تھا۔ اسی لیے یہ خاکہ اردو دنیا کے قارئین کے سامنے پیش کیا جارھا ھے:

خواجہ صاحب پر لکھنا جس قدر آسان خیال کر رہا تھا جب قلم اٹھایا تو اسی قدر دشوار نظر آیا۔ ان کے صحیح نقش ونگار کے ساتھ ان کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنا میرے لیے ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ دشوار اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان کی شخصیت ایسا معمہ ہے کہ جس نے بھی ان کو دیکھا وہ اس کا تجزیہ کرنے سے قاصر رہا۔ میرے لیے دشواری یہ ہے کہ میں نے خواجہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اتنے قریب سے کہ جب سر اٹھا کے ان کی طرف نظر کی تو کچھ نظر نہ آیا۔ آپ میرے اس جملے کو شاید محض اندازِ بیان خیال کر رہے ہوں مگر جن لوگوں نے قطب مینار کو دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس کی چوٹی کو دیکھنے کے لیے قربت کی نہیں بلکہ فاصلے کی ضرورت ہے گو فاصلے سے دیکھنے میں یہ نقصان ہے کہ اس کے مکمل خدوخال کا نقشہ بیان نہیں کر سکتے ہیں۔

میں نے خواجہ صاحب کو پہلی مرتبہ 1953 میں دیکھا جب میں ایم اے میں زیر تعلیم تھا۔ اس وقت دہلی میں تین اصحاب کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ مرزا محمود بیگ، خواجہ احمد فاروقی اور غلام احمد فرقت۔ اتفاق دیکھیے کہ دہلی کالج میں ایک سمپوزیم تھا جس کو خواجہ صاحب نے ترتیب دیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اردو کے طلبہ کے ساتھ انجمن اردوئے معلّٰی کے سکریٹری کی حیثیت سے میں بھی گیا۔ ان تینوں صاحبوں سے ملاقات ہوئی۔ بلکہ یوں کہیے کہ مرزا صاحب کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ خواجہ صاحب سے چند منٹ باتیں کرنے کا موقع بھی ملا اور فرقت صاحب سے خوب گھل مل کر باتیں ہوئیں۔ مرزا صاحب کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ فرقت صاحب کے متعلق میرا نظریہ تھا کہ علی گڑھ سے باہر بھی ایسی باکمال شخصیتیں پیدا ہو سکتی ہیں اور خواجہ صاحب سے قطعاً متاثر نہ ہو سکا۔ میرا خیال تھا کہ اگر ان میں غرور نہیں ہے تو پھر وہ مردم بیزار قسم کے آدمی ضرور ہیں۔

1955 میں خواجہ صاحب سے میری دوسری ملاقات ہوئی جب میرا تقرر سینٹ اسٹیفنز کالج میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے ہوا۔ اس وقت خواجہ صاحب کی شخصیت مجھے بالکل بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ بڑی محبت اور شفقت سے میرے مسائل پوچھتے رہے۔ اس طرح روز بروز میں خواجہ صاحب سے قریب آتا گیا اور کچھ ہی عرصے میں اپنے آپ کو ان کے گھر کا ایک فرد خیال کرنے لگا۔

خواجہ صاحب کا پورا نام خواجہ احمد فاروقی ہے۔ وہ مراد آباد کے ایک مشہور قصبہ بچھرایوں میں 30 اکتوبر 1917 کو ایک معزز اور علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلی زبدۃ الموحدین مشیر الدولہ محقق الملک مفتی محمد نور اللہ خان بہادر، مناظر جنگ، اکبر شاہ ثانی کے عہد کے علما میں سے تھے۔ یہ خطابات اکبر شاہ ثانی نے ان کی تصنیف 'نغمۂ عشاق' (جو موضوع تصوف پر بڑی مبسوط کتاب ہے) ملاحظہ کرنے کے بعد عطا کیے تھے۔ ہمارے علم میں ان کی دوسری کتاب 'انوار الرحمن' ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ ایک علمی خاندان ہے چنانچہ ان کے دوسرے اعزہ بھی علم وفضل کے ممتاز درجوں پر فائز رہے ہیں مثلاً مولانا محمد محسن فاروقی مرحوم جو اسلامیہ کالج پشاور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ مولانا حامد حسن قادری جو مدتوں سینٹ جانس کالج آگرہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ وہ داستان تاریخ اردو کے مصنف کی حیثیت سے آج بھی ہندو پاک میں معروف ہیں۔ قادری صاحب کی شخصیت کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ادب کی نمایاں ہستیاں ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ خواجہ صاحب کو علم وفضل ورثہ میں ملا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس ورثہ میں انھوں نے بہت کچھ اضافہ کیا۔ دنیاوی وجاہت اور علمی شہرت کا جہاں تک تعلق ہے اس میں ان کو تقدیر سے کبھی شکوہ نہیں رہا۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ خواجہ صاحب ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے اپنی شخصیت کی خود تعمیر کی۔ اردو اور فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد ان کے وسائل ایسے نہ تھے کہ کسی بڑی شایان شان جگہ کے منتظر رہتے۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کو ایک قلیل مشاہرہ پر کسی اسکول میں معلمی کی جگہ تفویض ہوئی۔ مگر ان کو اندازہ تھا کہ زندگی بہت وسیع ہے۔ اس معمولی جگہ پر قناعت کرنا اس صلاحیت کی توہین ہوگی جس کو قدرت سے لے کر وہ پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے آگے بڑھنے کی برابر کوشش کی اور اس کے بعد مختلف منازل طے کرتے ہوئے دہلی کالج میں لیکچراری کے فرائض پر مامور ہوئے۔ یہاں سے انھوں نے پی ایچ ڈی کیا اور یہاں سے 1954 میں دہلی یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ 1959 میں جب صدر جمہوریہ کی اجازت سے دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا مستقل قیام عمل میں آیا تو پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ن کا تقرر ہوا۔ اب تک شعبۂ اردو کی حیثیت شعبۂ فارسی وعربی کے ساتھ ضمنی تھی اور یہ تینوں شعبے ایک صدر محترم قبلہ منظور حسین موسوی کی نگرانی میں کام کر رہے تھے۔ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ موسوی صاحب کی سرپرستی میں اس شعبہ کی اہمیت برابر قائم تھی مگر بہرنوع دوسرے شعبوں کے جزو کی حیثیت سے اس کی کوئی انفرادیت نہ تھی۔ اس لیے اردو کے لیے لازمی تھا کہ وہ اس آزمائش سے گزرے کہ علاحدہ ہونے کے بعد یا تو فنا ہو جائے

---

1 شجرہ یہ ہے: مفتی محمد نور اللہ
مفتی مولوی ضیاء اللہ
مولوی مظہر اللہ — یہ 1890 میں ڈپٹی کلکٹری کے
مولوی اسد اللہ — عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ سرسید
مولوی حسن احمد — اور بے خبر کے دوستوں میں سے تھے۔
خواجہ احمد فاروقی

نوٹ: جس وقت مضمون لکھا اس وقت مولانا قادری بقید حیات تھے مگر افسوس 1964 میں ان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔

یا پھر اپنے قدم مضبوطی سے قائم کر لے۔ فنا ہو جانے والی بات میں نے اس لیے کہی کہ ملک میں اردو جس دور ابتلا سے گزر رہی تھی اس میں شعبہ اردو کے قیام کے منصوبے بنانا یا انفرادیت کی بات کرنا جنون سے کم نہ تھا مگر لیلائے اردو کو چاہنے کے لیے کسی مجنوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اس ذمے داری کو اپنایا اور شکر ہے کہ بہی خواہان اردو کے سامنے ان کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں پڑی خواجہ صاحب بخوبی جانتے تھے کہ اردو ہماری تہذیبی وحدت کی محور اور اعلیٰ ادبی اقدار کی مظہر ہے۔ اس لیے اردو کا نہ صرف ہماری یونیورسٹی میں بلکہ برصغیر ہند میں مخصوص مقام ہے۔ اس نقطہ نظر سے انھوں نے اردو کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کی سعی برابر جاری رکھی۔

1959 شعبہ اردو کے لیے ایک نشاۃ الثانیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب اس نے قدم جمانے کی پہلی کوشش کی تھی۔ خواجہ صاحب کو یہ احساس تھا کہ کسی شعبے کی انفرادیت محض اس لیے قائم نہیں رہ سکتی یہ وہ ایک Teaching department ہے اس لیے کہ متعدد یونیورسٹیاں ہیں جہاں اردو ایم اے کی تعلیم کا انتظام ہے مگر اس کی حیثیت منفرد نہیں ہے اور پھر مرکز میں واقع ہونے کی وجہ سے اس یونیورسٹی کو جو سہولتیں فراہم ہو سکتی ہیں ان سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ لہٰذا انھوں نے یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی وساطت سے یو جی سی University Grants Commission کو شعبہ کی توسیعی اسکیم پیش کر دی جو حسب ذیل ہے:

(1) اردو ہندی لغت کی تکمیل
(2) قدیم مخطوطات کی طباعت
(3) دہلی کی شخصیات پر مکمل کتابیں
(4) ایک تحقیقی رسالے کا اجرا

اس اسکیم کو شروع ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہونے آیا اور شعبے سے اردوئے معلی کے متعدد خاص نمبر اور گراں پایہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ [1]

اس کے علاوہ ان کی کوشش سے دہلی کے کئی کالجوں میں از سر نو اردو کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ خواجہ صاحب کو شعبے اور ان کے کاموں سے والہانہ عشق ہے۔ چنانچہ جب وہ امریکہ جانے لگے اس وقت کہنے لگے کہ ظہیر صاحب اس شعبے کو میں نے کس طرح ترتیب دیا ہے۔ کس طرح اس کو بنایا ہے میں ہی جانتا ہوں مگر اس سے زیادہ مشکل اور اہم کام ہے اس کو قائم رکھنا ہماری ذرا سی لغزش ہمیں عرش سے فرش پر پھینک سکتی ہے۔ میں آپ کو کسی بات کے لیے مشورہ نہیں دیتا بجز اس کے کہ شعبے کو ایک امانت خیال کیجیے جو خدا کی طرف سے ہم کو سونپی گئی ہے۔ خواجہ صاحب خط لکھنے کے معاملے میں سہل انگاری سے کام لیتے ہیں مگر امریکہ سے جس پابندی سے وہ مجھے خط لکھا کرتے تھے، اس پر حیرت ہوتی ہے۔ ہر خط میں شعبہ کی مصروفیات کا حال دریافت کرتے جس روز امریکہ روانہ ہونے والے تھے تو مجھ سے فرمانے لگے کہ میری جگہ آپ کو شعبہ کا نظم و نسق سنبھالنا ہے۔ مختلف مزاج اور وضع کے لوگوں سے واسطہ ہوگا۔ ایسے بھی لوگ ہوں گے جو آپ کے اس تقرر کو پسند نہ کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگ شعبے کے وجود کو ہی مشتبہ نظروں سے دیکھیں مگر آپ سب سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مصروف رہیں۔ اگر آپ محسود ہوں تو چنداں حرج نہیں مگر حاسد نہ بنیے گا۔ مشورہ سب سے لیتے رہیے مگر شعبے کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے فیصلے میں احتیاط برتیے۔ غرض میں حیران ہوتا تھا کہ اس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر آخر کیوں کیا جاتا ہے، مگر وہ لوگ جو کسی کی محبت میں گرفتار رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ محبوب کی ہر ادا کا تذکرہ ایک چاہنے والے کا مرغوب مشغلہ ہوتا ہے۔

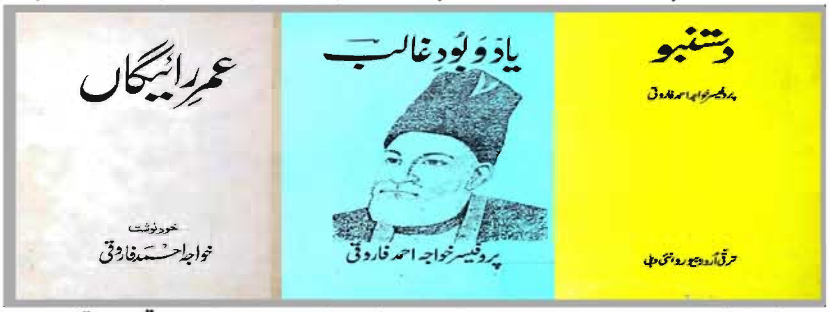

شفیق الرحمن نے اپنے کسی کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کو باتیں کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ جب وہ باتیں کرتے کرتے تھک جاتے تو پھر باتیں شروع کر دیتے۔ میں سوچتا ہوں کہ خواجہ صاحب کا بھی یہی حال ہے کہ جب وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو ہم ان کو مشورہ دیتے کہ اب آپ آرام کیجیے تو وہ ان کے کسی نئے کام کا آغاز ہوتا اور جب ان پر کاموں کا ہجوم ہوتا تو کچھ مزید کاموں کی ذمے داری لے لیتے۔ کوئی کمیٹی ایسی نہیں جس کا کسی نہ کسی صورت میں تعلق خواجہ صاحب سے نہ ہو۔

خواجہ صاحب کے مزاج میں وہم اور عجلت پسندی بے حد ہے۔ اس عجلت پسندی سے واسطہ اکثر ہم لوگوں کو پڑتا ہے۔ ایک کام جو پیش نظر ہے اس کی تکمیل وہ اسی وقت اسی لمحے کر دینا چاہتے ہیں۔ ایک کام کی تکمیل ابھی نہیں ہوتی کہ دوسرے کام کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ شعبے کے بعض کاموں کو دیکھا کہ ان کی تکمیل کے لیے ہم لوگوں کو گھر سے بلایا۔ خود گھر سے چل کر ڈپارٹمنٹ پہنچے اس کام کو انجام بھی دے دیا مگر معلوم ہوا کہ اس کے کاغذات کو دفتر بھیجنے کی نوبت ایک ماہ کے بعد آئی۔ خواجہ صاحب کو میٹنگ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ زماں و مکاں سے بے نیاز ہو کر وہ میٹنگ کرتے مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ اس میٹنگ میں سرکاری انداز سے زیادہ ایک گھر کے بے تکلف افراد کے اجتماع کی صورت ہوتی۔ ایک مرتبہ سہ پہر کو تین بجے میٹنگ شروع ہوئی۔ رمضان شریف کا زمانہ اور سب کے روزے، اس کا سلسلہ مغرب تک جاری رہا۔ افطار کے خیال سے تھوڑی دیر کے لیے سب لوگ چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوان میں یہ طے پایا کہ کام کو مکمل کر دیا جائے۔ چنانچہ آٹھ بجے تک کام جاری رہا اور جب بھی ختم نہ ہوا تو خواجہ صاحب نے سب کو کھانے پر مدعو کر دیا اور تمام ممبران ان کے ہمراہ ہوٹل کو روانہ ہو گئے اور جب اس ہوٹل کے بند ہونے کا وقت قریب آیا تو دوسرے ہوٹل میں جا کر کافی کی چسکیوں پر اس کام کو شروع کر دیا۔ اب لطف کی بات یہ تھی کہ اس قسم کی میٹنگ کا حادثہ ہم سب کے لیے نیا تھا۔ لہٰذا دل چسپ تو ضرور معلوم ہو رہا تھا مگر یہ بھی خیال تھا کہ گھروں پر تعزیرات ہند کی دو سو فرد جرائم بھی لگائی جا چکی ہوگی۔ شب کے ساڑھے بارہ بجے ہم لوگ ایک ہوٹل میں میٹنگ کر رہے تھے اور سب ساتھیوں کے گھروں سے تلاش میں آدمی چھوٹے ہوئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ دہلی میں دو آدمیوں کا دماغ بہت تیزی سے کام کرتا ہے۔ ایک مرزا محمود بیگ اور دوسرے خواجہ احمد فاروقی۔ فرق اس قدر ہے کہ اول الذکر کے دماغ کی کراماتیں اس وقت دیکھنے میں آتی ہیں، جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور موخر الذکر کا ذہن اس وقت معجزے دکھاتا ہے جب کوئی مسئلہ پیدا کرنا ہوتا ہے اور پھر اس مسئلہ کو پیدا کر کے اس کا حل بھی تلاش کرتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی نے ایک دفعہ کہا تھا:

میری لائف لکھو ایامِ جوانی کے سوا
سب بتا دوں گا تمھیں افتد و دوانی کے سوا

خواجہ صاحب کی اس زندگی کے بارے میں ان کے خلوت وجلوت کے ساتھی زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں یا اگر کبھی خواجہ صاحب کو خود اپنی سوانح حیات لکھنے کا خیال پیدا ہوا تو شاید اس کا ایک باب یہ بھی ہو۔ میں اس قدر جانتا ہوں کہ خواجہ صاحب حسن پرست خواہ نہ ہوں مگر حسن دوست ضرور ہیں۔ ادب میں ثقل،

---

1. عمدہ المنتخبہ (تذکرہ سرور)
2. ماسٹر رام چندر، مصنفہ صدیق الرحمن قدوائی
3. کربل کتھا (دہ مجلس)
4. دیوان بقا
5. گنج خوبی
6. اردوئے معلی غالب نمبر دو حصے، لسانیات نمبر سوز نمبر

کپڑوں پر سیل اور چاند میں دھبہ وہ کبھی پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے دل کے ساتھ پاسبانِ عقل کو ہمیشہ ساتھ رکھا اور یہی سبب ہے کہ اکثر ان کے جذبات پر مصلحتیں حاوی ہوگئیں۔

خواجہ صاحب نے زبانوں کے ارتباط اور میل جول پر اس وقت زور دیا جب ساہتیہ اکادمی وجود میں نہیں آئی تھی۔ انھوں نے ایک ادبی سنگم قائم کیا اور جس زمانے میں وہ دہلی کالج میں استاد اردو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اس وقت انھوں نے ہند آریائی اور دراوڑی زبانوں کا سمپوزیم منعقد کیا۔ اس طرح نظریاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ 1960 میں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے یوم غالب بین الاقوامی پیمانہ پر منایا جس میں مختلف ممالک کے نمائندے شریک ہوئے اور اس وقت انھوں نے 1969 میں غالب کی یادگار قائم کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ 1964 میں موصوف کی سعی سے شعبے کی طرف سے ایک بین الاقوامی سمپوزیم Contribution of Orientalists to Urdu Studies انعقاد پذیر ہوا جس میں متعدد ملکوں کے نمائندے شریک تھے۔ اس سمپوزیم کے مقالے عنقریب کتابی صورت میں شائع ہونے والے ہیں۔

امریکہ کے قیام کے دوران میں انھوں نے وہاں لائبریری آف کانگریس سے یہ طے کیا کہ اردو کے وہ تمام مخطوطات جو یورپ و امریکہ میں بکھرے پڑے ہیں، ان کے تین مائکروفلم تیار کیے جائیں اور ایک دلّی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو بطور عطیہ دیا جائے۔ اسی طرح وس کانسن یونیورسٹی (Wisconsin University) اور دہلی یونیورسٹی (Delhi University) کے درمیان اساتذہ اور طلبہ کے درمیان رابطہ قائم کردیا۔

اب تک خواجہ صاحب کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر سرسری نظر تھی۔ اب میں ان کی تصانیف اور طرز تحریر کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ان کی تصانیف میں (1) کلاسیکی ادب (2) نئی شاعری (3) مرزا شوق لکھنوی (4) میر — حیات اور شاعری (اس کتاب پر ان کو ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی ملا تھا) (5) مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا (یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے)۔ (6) ذوق و جستجو۔

خواجہ صاحب کی طرزِ تحریر کے بارے میں کوئی تفصیلی بات کہنا نہیں ہے۔ مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان کی زندگی کے کچھ پہلو سامنے آجائیں اور یہ پہلو وہ ہیں جن پر عام نظریں نہیں پڑتیں۔ مگر خواجہ صاحب کی شخصیت کی تشکیل میں یہ پہلو اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا میں ان کے انداز تحریر کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کروں گا۔

خواجہ صاحب کی تحریروں کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو تحقیقی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں اور کچھ ناقدانہ انداز میں۔ مگر دونوں میں جو بات مشترک ہے وہ ان کا شگفتہ انداز بیان ہے۔ خواجہ صاحب کی تصانیف میں جو شائع ہوچکی ہیں 'میر- حیات اور شاعری' ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ میر پر اتنی مبسوط کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی اس کا احساس خود مصنف کو بھی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت مصنف کے ذہن میں جو خیال تھا:

''لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ان کی حیات اور شاعری پر کوئی مبسوط اور محققانہ کتاب نہیں، موضوع پر مواد کی کمی نہیں ہے لیکن وہ بکھرا ہوا ہے اور کسی ایک مقام پر مجتمع نہیں اس لیے اس کی تالیف کی ذمہ داریاں بھی سخت ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ دید و دریافت اور تنقید و تحقیق سے کام لے کر اس پورے مواد کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے اور اسے سماجی حقائق کی روشنی میں ترتیب سے جلوہ گر کیا جائے کہ میر اور عہد میر کا ایک صحیح مرقعہ پیش نظر ہوجائے۔'' (میر حیات اور شاعری، ص 14)

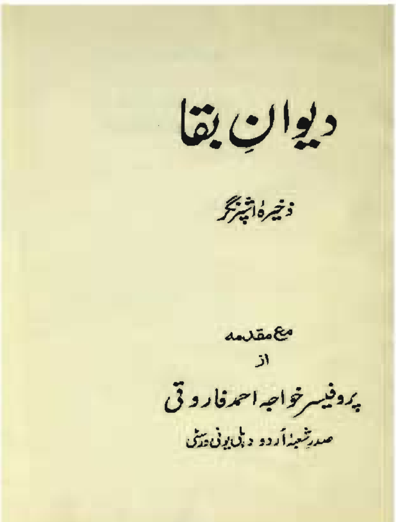
دیوانِ بقا

ذخیرۂ اشپرنگر

مع مقدمہ

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ذمے داری سے خواجہ صاحب پورے طور پر سبکدوش ہوئے البتہ اس تحقیق میں بعض جگہ خواجہ صاحب کی عقیدت میر تحقیق پر غالب آگئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ صاحب نے میر کے بیانات کو بھی تحقیق کی کسوٹی پر کھرا قرار دیا بلکہ اکثر و بیشتر جگہ، ذکر میر، کو بنیاد بنا کر اپنی عمارت کی تعمیر کی ہے۔ میر کی شاعری کی عظمت مسلم مگر یہ ضرور نہیں کہ ان کے بیانات اور تاریخی حقائق اور صداقت پر بھی مبنی ہوں اس وقت میر پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس لیے سرِ دست اس سے احتراز کیا جاتا ہے۔ البتہ خواجہ صاحب نے عہد میر اور میر کے بارے میں جس قدر مواد فراہم کردیا ہے وہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے بھی مشعلِ راہ ہے۔ میں نے جیسا عرض کیا کہ خواجہ صاحب کا اندازِ بیان تحقیق اور تنقید دونوں میں نمایاں ہے یہی سبب ہے کہ انھوں نے تحقیق کو خشکی سے بچالیا ہے۔ اس سلسلے میں چند جملے ملاحظہ ہوں:

''میر ان واقعات کے تماشائی نہیں۔ اس قلزم خون کے شناور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تخیل اور جذبے کے تمام نقش و نگار ان ہی خارجی احوال کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔'' (میر- حیات اور شاعری، ص 15)

''ان کی سیرت کی چوب خشک ٹوٹ سکتی تھی۔ لچک نہیں کھاسکتی تھی لیکن اس اندرونی پیکار اور خارجی تناقصات کی جاں گداز آزمائش کے باوجود وہ زمین پر مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے رہے اور مرگ کو بھی ایک ماندگی کا وقفہ سمجھتے رہے۔'' (ایضاً، ص 397)

ان کی دوسری اہم کتاب 'کلاسیکی ادب' ہے جو ان کے پندرہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان موضوعات کو ہر حیثیت سے اہمیت حاصل ہے جن اشخاص کو خواجہ صاحب نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ ہمارے ادب کے اہم رکن ہیں۔ میری مراد میر، غالب، مومن، آزردہ، شوق، ریاض، حسرت، فانی اور اصغر سے ہے۔ ان مضامین کی اہمیت میرے نزدیک خاص طور سے یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو انھوں نے ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے جو بعض شاعروں سے سینہ بہ سینہ منسوب چلی آرہی تھیں۔ میر کی قنوطیت میں عظمتِ انسانی کی تلاش اور فانی کے غم میں مسکراہٹوں کی جستجو، خواجہ صاحب کا حصہ ہے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں میں ایک مخصوص رنگ کا شاعرانہ انداز ملتا ہے وہ بھی سرور صاحب کی طرح اشعار کے الٹ پھیر سے اپنے نقش و نگار قائم کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے انداز میں نیاز صاحب کا رومانی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نیاز صاحب کی تحریروں سے بے حد متاثر ہوں۔ کبھی کبھی ابوالکلام آزاد کی خطابت کے رنگ کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ اس سے میری ہرگز مراد نہیں ہے کہ ان کا تقلیدی رنگ ہے بلکہ انھوں نے ان مختلف رنگوں سے اپنے قوس قزح کی تخلیق کی ہے۔ ان سب کے رنگ سے جو نیا رنگ ابھرا ہے وہ ان کا اپنا رنگ ہے۔ حسرت کی طرح انھوں نے ہر استاد سے فیض ضرور اٹھایا ہے مگر اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ تحریروں میں ایک نیا آہنگ اور لب و لہجہ ملتا ہے۔ یہ رنگ و آہنگ بھی اس قدر نمایاں نہیں ہے کہ 'انداز قد' سے پہچان لیا جائے مگر یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے صاحب طرز اصحاب میں ایک نمایاں جگہ پیدا کرلی ہے۔ ان کے لب و لہجے میں ایک توازن ہے جو موضوع کو کبھی قربان نہیں ہونے دیتا۔ کوتاہیِ داماں کا احساس اور طوالت کا خوف مثالوں سے احتراز کرنے پر مجبور کررہا ہے ورنہ جی چاہتا تھا کہ ان کے مجموعے سے کچھ مثالیں پیش کی جاتیں تاکہ خواجہ صاحب کی شخصیت اور اندازِ تحریر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔

■

ماخذ: فکری زاویے: ظہیر احمد صدیقی، سنہ اشاعت: 1972، ناشر: نسیم بک ڈپو، لکھنؤ

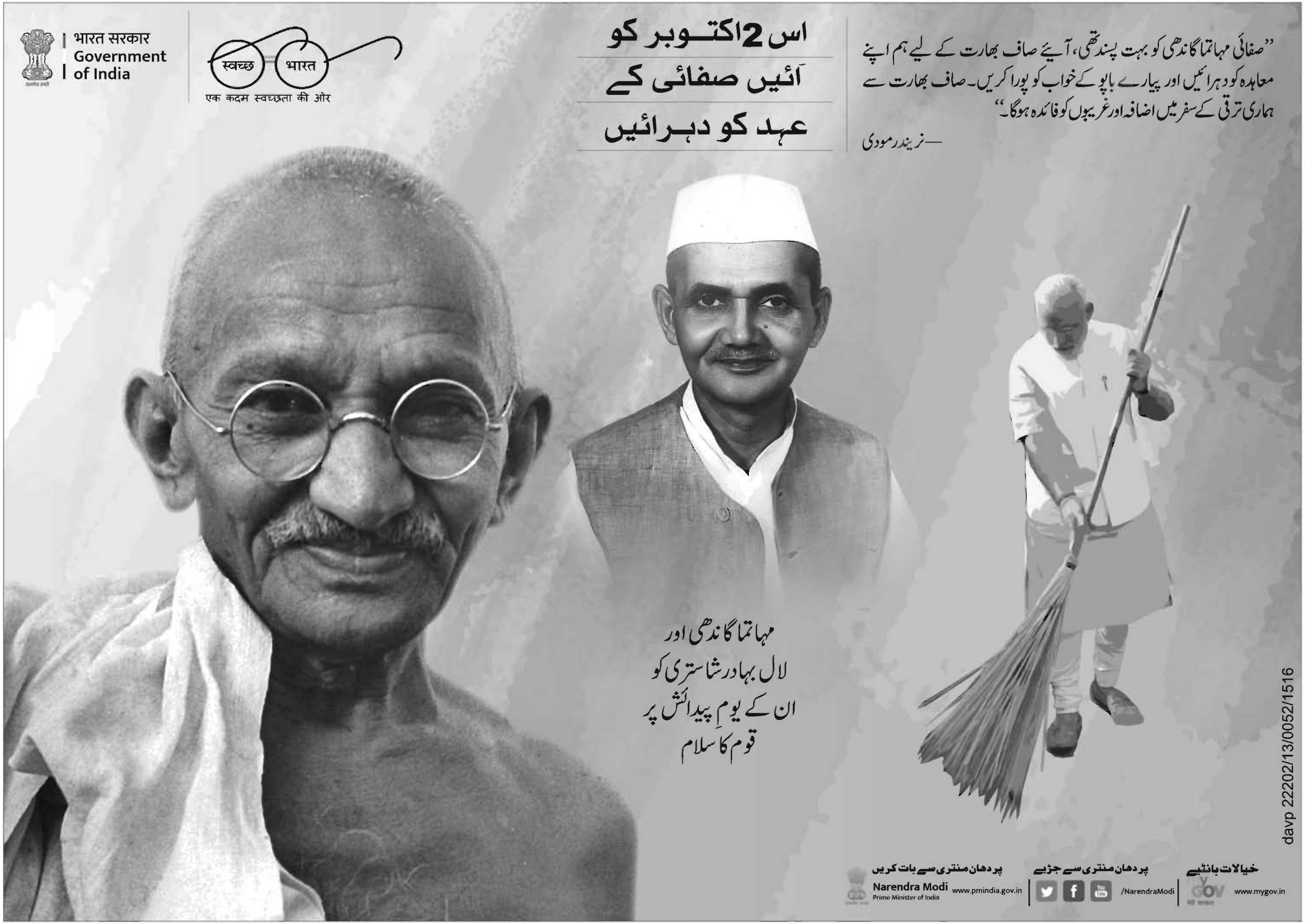
भारत सरकार
Government of India
स्वच्छ भारत
एक कदम स्वच्छता की ओर
اس 2اکتوبر کو
آئیں صفائی کے
عہد کو دہرائیں
''صفائی مہاتما گاندھی کو بہت پسند تھی، آیئے صاف بھارت کے لیے ہم اپنے معاہدہ کو دہرائیں اور پیارے باپو کے خواب کو پورا کریں۔ صاف بھارت سے ہماری ترقی کے سفر میں اضافہ اور غریبوں کو فائدہ ہوگا۔''
—نریندر مودی
مہاتما گاندھی اور
لال بہادر شاستری کو
ان کے یومِ پیدائش پر
قوم کا سلام
پردھان منتری سے بات کریں
Narendra Modi
Prime Minister of India
www.pmindia.gov.in
پردھان منتری سے جڑیے
/NarendraModi
خیالات بانٹیے
www.mygov.in
davp 22202/13/0052/1516

زندگی نامہ: قرۃ العین حیدر

مرتب: ڈاکٹر جمیل اختر
صفحات: 296، قیمت: 143، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر مجیب احمد خان، ای 62، غوری اپارٹمنٹس، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

'زندگی نامہ: قرۃ العین حیدر' یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کو ڈاکٹر جمیل اختر نے ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں قرۃ العین حیدر کی ساری زندگی کی کارکردگی کی جامع فہرست نہایت خوبی سے پیش کی ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ایک عالمی شہرت یافتہ مصنفہ تھیں۔ انھوں نے جو ادبی سرمایہ تخلیق کیا وہ یوں ہی دو چار دن میں تحریر نہیں کیا بلکہ اس کو فنی و ادبی اعتبار سے سالہا سال غور و فکر اور تحقیق کے بعد صفحۂ قرطاس پر رقم کیا۔ ان شہ پاروں میں سادگی و روانی اور شیرینی کی آمیزش سے اثر انگیزی پیدا کی۔ ان کی تحریروں میں آج بھی کشش اور دلکشی برقرار ہے۔ ان کی تحریروں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ بچے، جوان اور بزرگ استفادہ کرتے ہیں اور کسی کے ذہن پر کوئی بات گراں نہیں گزرتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے یہ شہ پارے عالمی ادب میں مقبول ہوئے۔ 'آگ کا دریا' نے ادبی دنیا میں دھوم مچادی۔ وہ اردو ادب میں چودھویں کے چاند کی مانند جلوہ گر ہوئیں بلکہ عالمی ادب میں بھی ان کی اہمیت افادیت مسلم ہوگئی۔

یہ کتاب بائیس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قرۃ العین حیدر کی زندگی کے آغاز و انجام اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے باب میں ان کی تحریروں یعنی افسانہ، ناول، ناولٹ، رپورتاژ، مضامین، خاکے، بچوں کا ادب، انگریزی میں شاعری، دیباچے، پیش لفظ، تقریظ، انتسابات، تخلیقی اشارے، افسانے و ناول کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے باب میں ان کی صحافت اور فلم سازی پر روشنی ڈالی ہے۔ چوتھا باب مصوری اور پانچواں باب تراجم کی فہرست پر مختص ہے۔ چھٹے باب میں انٹرویو اور ساتویں باب میں تالیفات کی فہرست کا ذکر ہے۔ آٹھویں باب میں دامانِ باغباں کے خطوط کی فہرست پیش کی ہے اور نویں باب میں کفِ گل فروش کی تصویروں پر تبصرہ کیا ہے۔ دسویں باب میں ان کی تحریروں کے دس ملکی اور دو غیر ملکی (انگریزی اور روسی) زبانوں کے تراجم کی فہرست دی ہے۔ گیارہویں باب میں ان مجموعۂ مضامین کا ذکر ہے جو دوسروں نے ان پر مرتب کیے ہیں۔ بارہواں باب 'کلیات آئینۂ جہاں' کے بارے میں ہے۔

تیرھویں باب قدر شناسی، میں ان کے ناولوں اور افسانوی مجموعوں پر شخصی اور فنی مضمون لکھنے والوں کی فہرست پیش کی ہے اور ہمعصر ادیبوں کے تاثرات اور خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں کی فہرست شامل ہے۔ چودھویں باب میں قرۃ العین حیدر پر جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ان کی فہرست شامل ہے۔ پندرھویں باب میں رسالوں کے خصوصی نمبر کی فہرست ہے۔ سولہویں باب میں فکر و فن اور شخصیت پر کتابوں کی فہرست شامل ہے۔ سترھویں باب میں حوالہ جاتی کتابوں کی فہرست ہے۔ اٹھارھویں باب میں قرۃ العین حیدر کے نام معنون کتب کی فہرست درج ہے۔ انیسویں باب میں ان پر لکھے گئے دوسری زبانوں کے مضامین (ہندی، انگریزی اور پنجابی) کی فہرست ہے۔ بیسویں باب میں اخبارات و رسائل جس میں ان کی تحریریں شائع ہوئیں ان کی فہرست درج ہے۔ اکیسویں باب میں ان کی کتابوں اور افسانوں کے عنوانات جو اشعار سے ماخوذ ہیں ان اشعار، عنوان اور کتب کی فہرست شامل ہے۔ آخری باب میں قرۃ العین حیدر کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن کے بارے میں گفتگو کی ہے اور تحقیق میں معاون کتابوں کی فہرست دی ہے۔

ڈاکٹر جمیل اختر نے قرۃ العین حیدر کے شخصی اور ادبی کارناموں کا 'اشاریہ' بڑی محنت و مشقت سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے تحقیق جیسی سنگ ریز وادی سے گزر کر یہ کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ وہ ادبی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ 'زندگی نامہ' قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ اس کتاب کی کمپوزنگ اچھی ہے اور کاغذ عمدہ ہے۔ قیمت بھی واجب ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادبی دنیا میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

ادبی صحافت (آزادی کے بعد)

مصنف: عبدالحی
صفحات: 414، قیمت: 185 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
مبصر: سہیل انجم، 370/6A، ذاکر نگر، نئی دہلی

حالیہ چند برسوں میں اردو صحافت کے موضوع پر متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں کئی صحافت کی تاریخ پر ہیں تو کئی صحافت کی تکنیک پر۔ کچھ ملے جلے موضوعات پر ہیں، کچھ ہمعصر صحافت کی صورت حال پر ہیں تو کچھ صحافیوں کی خدمات پر۔ بیشتر ایسے موضوعات پر ہیں جن پر پہلے سے ہی کتابیں موجود ہیں، لہٰذا ان کی تالیف میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی۔ جبکہ ان میں سے بعض کتابیں ایسے موضوعات پر لکھی گئی ہیں جن پر پہلے سے نہ تو کتابیں ہیں اور نہ ہی معاون مٹیریل۔ اس لیے ایسی کتابوں کو تصنیف کرنے میں مصنّفین کو خاصی دشواریوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ ان میں سے بعض کو بہت اچھی کتابوں کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں تو بعض کو اچھی اور بعض کو عام کتابوں کے زمرے میں۔ حال ہی میں 'ادبی صحافت' کے موضوع پر ایک کتاب منظر عام پر آئی ہے جو دوسری کتابوں کا چربہ نہیں بلکہ خالص اور اوریجنل کتاب ہے۔ اس کا نام 'ادبی صحافت آزادی کے بعد' ہے۔ اگر ہم اس کتاب کو بہت اچھی کتابوں کے زمرے میں نہیں تو اچھی کتابوں کے زمرے میں ضرور رکھ سکتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ صحافت کے موضوع پر آنے والی کتابوں میں اپنی ایک منفرد شان رکھتی ہے۔ منفرد اس لیے کہ غالباً اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ ملکی سطح پر ادبی صحافت کی صورت حال پر اس سے قبل تحقیقی نظر نہیں ڈالی گئی۔

اس سے قبل بھی عبدالحی کی ایک کتاب 'سرسید کی صحافت' آچکی ہے جس پر ان کی خاصی ستائش ہوئی تھی۔ زیر تبصرہ کتاب اپنے موضوع کا بھرپور انداز میں احاطہ کرتی ہے۔

بعض ہلکی پھلکی خامیوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور کر دیا جانا بھی چاہیے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے۔ اس کے کئی ابواب ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستان میں اردو کی ادبی صحافت کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ادبی صحافت کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس کی تاریخ پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس سے قبل 'پہلا لفظ' کے عنوان سے انھوں نے ادبی صحافت کے پس منظر اور پیش منظر پر نظر ڈالی ہے۔

کتاب میں 74 صفحات تک آزادی سے قبل کی اردو صحافت اور ادبی صحافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے آزادی کے بعد اردو کے رسائل و جرائد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ پھر 1947 سے 2000 تک اردو کے اہم رسائل و جرائد کی چھان پھٹک کی گئی ہے۔ جن میں آجکل، نوائے ادب، نیا دور، تحریک، سوغات، شب خون، فکر و نظر اور کتاب نما سمیت 32 مجلات شامل ہیں۔ اس ضمن میں بعض ایسے مجلات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو کم معروف ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے رسائل و جرائد پر کام کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ لیکن مصنف اس مشکل مرحلے سے بہ آسانی گزر گئے ہیں۔ ہندوستان میں رسائل و جرائد کی ادبی حیثیت کا جائزہ لیتے وقت بجا طور پر لکھا گیا ہے "ہندوستان میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بڑی تعداد میں اردو رسائل منظر عام پر آئے لیکن ان میں سے بہت کم رسائل باقی رہے اور ادبی افق پر اپنا معیار بلند کر سکے۔"

عبدالحی نے رسائل و جرائد کا فنی جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کے تحت اداریہ: تعریف و تاریخ، اردو اداریوں کا ارتقا اور ادبی رسائل کی اداریہ نویسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھوں نے ماہنامہ شاعر کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے "اس کے زیادہ تر اداریوں میں اردو کی حالت زار پر آنسو بہایا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اردو کی ترقی اور اس زبان کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کرنے کی بات بھی کہی گئی ہے"۔ البتہ 'آنسو بہایا گیا' کی جگہ پر 'آنسو بہائے گئے' لکھا گیا ہوتا تو زیادہ صحیح ہوتا۔ 9 رسائل کے اداریوں کو تحقیقی انداز میں پرکھا گیا ہے اور اس بارے میں معروضی انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ خصوصی نمبروں پر نظر ڈالنے کے بعد اکیسویں صدی کے اہم رسائل و جرائد کا ایک باب باندھا گیا ہے۔ لیکن اس میں متعدد اصناف والے رسائل شامل کر دیے گئے ہیں، کوئی زمرہ بندی نہیں کی گئی ہے۔ جیسے کہ مذہب، خواتین، ادب اطفال وغیرہ۔ اس باب میں کچھ ایسے رسائل بھی آگئے ہیں جو لائق توجہ نہیں تھے۔ البتہ کچھ اہم ادبی رسائل کے باب میں معیاری رسائل نظر آتے ہیں۔

آخر میں 'حاصل مطالعہ' کے تحت عبدالحی بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں 'آزادی کے بعد کی ادبی صحافت' نے جس طرح کی جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ادبی صحافت نے ادب کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبوں پر بھی یکساں نقوش مرتب کیے ہیں۔ گزشتہ ساٹھ برسوں کی مدت میں ان رسائل نے مختلف موضوعات پر مبنی تخلیقات پیش کی ہیں ...... یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے ادبی رسائل آج بھی کامیاب ہیں۔ ادبی صحافت کامیابی کی منزل طے کر رہی ہے۔ لیکن اردو داروں اور اردو سے جڑے احباب کو ایک ساتھ مل کر اسے اور بہتر (معیاری) بنانے کی کوشش کرنی چاہیے اور جدید تقاضوں اور نئے رجحانات کو اپناتے ہوئے اردو رسائل کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی سعی کرنی چاہیے"۔ البتہ کتاب کی ابتدا میں ایک جملہ کھٹکتا ہے: "موجودہ دور رسائل و جرائد کی صحافت کا زریں دور ہے"۔ (اس دور کو جس میں مدیر حضرات پیسے لے کر گمنام شعرا کے گوشے نکالتے ہوں، زریں کیسے کہا جا سکتا ہے)۔ اسی طرح ایک جگہ لکھا ہے "اخبارات کا مقصد موجودہ منظر نامے پر روشنی ڈالنا ہوتا ہے"۔ (صفحہ 3)۔ اگر موجودہ کی جگہ ہمعصر لکھا جاتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔

مجموعی طور پر یہ ایک اچھی کتاب ہے البتہ اس کی زبان پر ایک بار پھر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کئی جگہوں پر واحد کو جمع اور جمع کو واحد لکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ 39 پر 'مواد' کو جمع لکھا گیا ہے۔ مواد اگر چہ مادہ کی جمع ہے لیکن اردو میں واحد مستعمل ہے۔ تاہم اس کے باوجود کتاب عام غلطیوں سے پاک ہے۔ جیسے کہ اخبار 'قران السعدین' کو پڑھے لکھے لوگ بھی 'قرآن السعدین' لکھتے پڑھتے ہیں۔ جبکہ اس کتاب میں یہ اول الذکر املا کے ساتھ یعنی درست لکھا گیا ہے۔ اسی طرح زبان کی بعض خامیوں کے باوجود اس کی زبان اچھی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کا پورا احاطہ کرتی ہے اور اردو کی ادبی صحافت کے سلسلے میں خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا مصنف یا محقق اردو کی ادبی صحافت پر کام کرنا چاہے تو وہ اس بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔ اس کتاب کی تالیف و اشاعت کے لیے عبدالحی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی لائق تحسین ہے کہ اسے شائع کر کے صحافت کے طلبہ کے لیے ایک اچھی کتاب فراہم کر دی ہے۔

لکیر کا فقیر

مرتب: ڈاکٹر نسرین رمضان سید

صفحات: 131، قیمت: 30 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ارشاد قمر، اے بی 452 امر پوری رام نگر، نبی کریم، پہاڑ گنج، نئی دہلی 55

'لکیر کا فقیر' بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ نسرین رمضان سید نے اس کتاب میں بڑے ہی سادہ اور سلیس انداز میں کہانیوں کو پیش کیا ہے۔ ان کے اس مجموعے میں ایسے موضوعات پر کہانیاں ملتی ہیں جن کی خوشبو اور شگفتگی سے معصوم بچوں کا ذہن معطر ہو جاتا ہے۔

یہ بچوں کے لیے ایسا نگار خانہ ہے جس میں تحیر و استعجاب، خوشی و انبساط، تعلیم و تربیت، تجسس و تعقل اور علم و آگہی کے نقوش نمایاں ہیں۔ ان نقوش سے بچوں کا ذہن جلد ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ بچوں کا ذہن ایک سادہ تختی کی طرح ہوتا ہے۔ اس پر جو بھی نقوش چھوڑیں گے بہت جلد اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن اس کتاب میں کچھ ایسی کہانیاں بھی ہیں جن سے بچوں کے دل و دماغ پر منفی اثرات بھی پڑ سکتے ہیں۔ ایسی کہانیوں سے گریز ضروری ہے تاکہ بچوں کے سامنے خرافات کے بجائے صحت مند اقدار کی عکاسی ہو۔ مثلاً جادو، جن، تین پریاں وغیرہ یہ ایسی کہانیاں ہیں جن سے بچوں کے سادہ دل و دماغ پر ایک طرح کا خوف و دہشت اور مبہوت کر دینے والی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب اس نوعیت کی کوئی کہانی ہو تو ہمیں احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ کسی طرح کا کوئی غلط تاثر بچوں پر نہ پڑے۔ کہانیوں سے حاصل ہونے والی جانکاری انھیں جلد متاثر کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بڑی ہی دلچسپی اور لگن سے کہانی سنتے ہیں کیونکہ سچی، سیدھی، اخلاقی اور مزیدار باتیں ان کے دل و دماغ پر اپنا نقش جلد قائم کر لیتی ہیں۔ ایسے میں اتحاد، ہار جیت، امن، خاموشی، گپ بازی، پانی، تحفہ، نمائش، مقابلہ، ہمدردی، دکھاوے کا انجام اور مصمم ارادہ جیسے اہم، معلوماتی اور سماجی موضوعات بچوں کے لیے مثبت قدروں کی تعلیم کا ذریعہ بنتے ہیں، اور بچوں کے ذہنی نشو و نما کے لیے یہ مفید عمل بھی ہے۔ انسانی زندگی وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ جیسے جیسے وقت بدلتا جا رہا ہے ویسے ہی انسانی زندگی کے تقاضے بھی بدلتے جا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ بچوں کی ذہنی ترجیحات بھی بدلتی جا رہی ہیں۔ بدلتے ہوئے تقاضے، اس کی زندگی کے کینوس پر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آج کی اس دوڑتی بھاگتی زندگی میں انسان کو کہیں سکون نہیں ملتا۔ وہ مشینی انداز میں زندگی گزار رہا ہے۔ آج کے اس الیکٹرانک دور میں سیریل، کارٹون اور ویڈیو گیمز نے بچوں کے دل و دماغ کو محصور کر رکھا ہے ایسے حالات میں صحت مند قدروں کی ترسیل کرنے والی کہانیاں ہمارے نونہالوں کے لیے کارآمد اور مفید ثابت ہوں گی وہیں انھیں ان کہانیوں میں زندگی کے آداب سیکھنے کو ملیں گے جس کی آج کے عہد میں شدید ضرورت ہے۔ بچوں

کے مزاج اور نفسیات کو دیکھتے ہوئے جو کہانیاں لکھی جاتی ہیں ان کہانیوں سے بچے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں اور ان کا ذہنی افق بھی وسیع ہوتا ہے۔

نسرین سید نے ادب اطفال کے جملہ لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کہانیوں میں آج کے عہد کا عکس بھی ہے، عبرت بھی ہے، سبق اور موعظت بھی ہے، سماج کی بدلتی قدروں کا منظر اور منفیت کے خلاف ذہنی مزاحمت بھی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کہانیوں سے بچوں کے ذہن میں نئی کھڑکیاں کھلیں گی اور کچھ نئے زاویے ان کے ذہن و دماغ کو متاثر بھی کریں گے۔

اردو قارئین سے التماس ہے کہ کہانیوں کی یہ کتاب اپنے بچوں کو ضرور پڑھوائیں تاکہ معصوم ذہنوں کی صحیح سمت میں بہتر رہنمائی ہو سکے۔

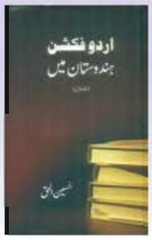

اردو فکشن ہندوستان میں (جلد اول)

مصنف: حسین الحق

صفحات: 188، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عزیزہ بانو فلاحِ امت گرلس پی جی کالج بھدوہی 221401

حسین الحق اردو فکشن کی دنیا کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ اب تک انھوں نے اردو فکشن کی دنیا کو اپنے سات افسانوی مجموعے دو ناول، ایک طویل نظم 'آخری گیت' تنقیدی کتاب 'نثر کی اہمیت' اور 'اردو فکشن ہندوستان میں' آثار بغاوت (تاریخ) آثار حضرت وصیؒ (سوانح) کے علاوہ آٹھ تالیفی کتابوں سے مالا مال کیا ہے۔ ان کی تین کتابیں 'زخمی زخمہ' (افسانوی مجموعہ) 'خواب آشوب' (ناول) اور 'اردو فکشن ہندوستان میں' (تنقیدی مقالات) زیر طبع ہیں۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار، ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تنقید نگار بھی ہیں اس کا ثبوت ان کی یہ تنقیدی کتاب 'اردو فکشن ہندوستان میں' ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 188 صفحات کو محیط ہے۔ اس کتاب میں بابائے افسانہ پریم چند سے لے کر مشرف عالم ذوقی تک 16 اہم افسانہ نگاروں و ناول نگاروں پر مضامین کے علاوہ گفتنی کے عنوان سے حسین الحق کا مقدمہ شامل ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون بابائے افسانہ پریم چند کے موضوعاتی تنوع سے متعلق ہے۔ اپنے اس مضموں میں حسین الحق نے پریم چند کے بڑے ناقدوں کے اقوال درج کرنے کے ساتھ ہی پریم چند کی تقریباً 32 کہانیوں کے ذریعے پریم چند کی کہانیوں میں موضوعاتی تنوع کو پیش کیا ہے۔ دوسرا مضمون منٹو کے بیانیہ سے متعلق ہے۔ اپنے اس مضمون میں حسین الحق نے منٹو کے مشہور زمانہ افسانہ بابو گوپی ناتھ کے ذریعے منٹو کے بیانیہ پر بحث کی ہے۔ سہیل عظیم آبادی اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ کتاب میں شامل تیسرا مضمون سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری سے متعلق ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی افسانوی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے وہ ان کی افسانوی مقبولیت کا راز ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں: 'کہا جا سکتا ہے کہ سہیل عظیم آبادی کی افسانوی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کے اثرات کی نوعیت نامیاتی ہے۔' کتاب کے چوتھے مضمون میں حسین الحق اختر اورینوی کے فن کی گمشدہ جہت کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ اردو افسانے پر گفتگو کرتے ہوئے وہ اختر اورینوی کی افسانہ نویسی کی بنیادی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ترقی پسندوں کے کارہائے نمایاں کو سراہتے تو ہیں لیکن پازیٹیو کے ساتھ نگیٹو جو مصنف کے الفاظ میں 'اصل عکس' ہے سے دور ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں: پریم چند وغیرہ کے قبیل کے فنکاروں کے یہاں فنکاروں کی تلاش، تلاش ذات کا استعارہ نہ بن سکی، فن کار صرف اردگرد دیکھتا اور گھومتا نظر آتا ہے۔' اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں: 'اختر اورینوی نے حقیقت کے (نگیٹو اور پوزیٹو) دونوں رُخ پیش کیے ہیں۔' چوتھا مضمون بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری سے متعلق ہے۔ مصنف نے اپنے مضمون میں بلونت سنگھ کی نگارشات کی ہندوستان میں کمیابی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ان کی مقبولیت میں کمی کی ایک بڑی وجہ یہی رہی ہے۔ ان کے دو دستیاب افسانوی مجموعوں اور ایک ناول عورت کے ذریعہ انھوں کے بلونت سنگھ کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ اور پھر مضمون کے اختتام پر انھوں نے تقریباً 13 نکات بلونت سنگھ کے فکر و فن سے متعلق تحریر کیے ہیں۔ چوتھے مضمون میں انھوں نے ایک اہم خاتون اردو فکشن نگار قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں سے بحث کی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں پائی جانے والی تہذیب اور تاریخ کو ان کے ناول آگ کا دریا سے واضح کیا ہے۔ یوں تو قرۃ العین حیدر کے ناول ہوں یا افسانے یا پھر ناولٹ ہر جگہ تاریخی و تہذیبی پس منظر بولتا ہے۔ وہ کوئی بھی بات کریں تاریخ و تہذیب ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ اور آخر میں حسین الحق اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ: ''آج بھی ہندوستانی مسلمانوں اور اردو والوں، اور گنگا جمنی تہذیب کے شیدائیوں کے لیے سماجی اور تہذیبی لحاظ سے نسخۂ کیمیا صرف مولانا ابوالکلام آزاد اور قرۃ العین حیدر کے پاس ہے۔'' اپنی کتاب میں جب حسین الحق غیاث احمد گدی کی بات کرتے ہیں تو ان کے مختلف افسانوں کی استعاراتی فضا پر بات کرتے ہیں۔ حسین الحق غیاث احمد گدی کو منٹو، بیدی اور قرۃ العین حیدر کے بعد ترجیحی درجہ دیتے ہیں اگلا مضمون کلام حیدری کی افسانہ نگاری پر ہے جسے حسین الحق نے فن کی خراد پر جانچا اور پرکھا ہے۔ ان کے فنی توازن، تخلیقی کرب، ناسٹلجیائی تڑپ، ہم عصر ثقافتی اور تمدنی بصیرت غیر متعصب نظر پر گفتگو کی ہے۔ 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول بھی پوری ایک تاریخ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ کردار وزیر خانم کے اندر موجود اس کی مضبوط قوتِ ارادی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی کے اس ناول کو حسین الحق ایک اچھا ناول تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:.....

لائق ستائش بات یہ ہے کہ خطرناک سے خطرناک مقام پر بھی تہذیبِ اظہار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ شفق کے افسانوں کے اسلوبیاتی ارتقا پر بات کرتے ہوئے حسین الحق اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شفق کی افسانہ نگاری کے کئی ادوار ہیں۔ چنانچہ وہ شفق کی فنی شناخت قائم کرنے کے لیے تمام ادوار سے بحث کرتے ہیں۔ عبدالصمد اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع اور تشبیہی بیانیہ پر گفتگو کرتے ہوئے مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ طارق چھتاری، اور سید محمد اشرف کے افسانوں کو بھی موضوعِ گفتگو بناتے ہیں طارق چھتاری کے افسانوی مجموعہ 'باغ کے دروازہ' کے حوالے سے کہتے ہیں کہ 'طارق استعاراتی افسانہ نگار ہیں۔' (ص 156) سید محمد اشرف کے افسانوی مجموعہ 'بادِ صبا کا انتظار' کی متعدد کہانیوں کے ذریعے ان کے فن پر گفتگو کرتے ہیں۔ اگلے مضمون میں انھوں نے سلیم شہزاد کے ناول 'دشتِ آدم' کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ ناول سے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں اور کچھ سوالات بھی قائم کیے ہیں۔ اردو فکشن کی دنیا میں غضنفر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ حسین الحق نے غضنفر کے ناول 'دِویہ بانی' کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔' وہ ناول کا موازنہ 'آنگن' سے کرتے ہیں اور آخر میں ایک سوال اُٹھاتے ہیں: یعنی ناول کا قاری تو Upgraded ہو جاتا ہے مگر؟؟ اس کتاب کا آخری مضمون پروفیسر الیس کی عجیب داستان (رزمیہ کے عروج سے صارفیت کے نشیب میں اترنے کا استعارہ) ہے۔ اس ناول کا موضوع آزادی کے بعد کا بنگال ہے۔ حسین الحق نے اس ناول کو گردشِ رنگ چمن کے بعد کا اگلا قدم بتایا ہے۔ ناول کے موضوع سے بحث کی گئی ہے۔ اور چند سوالات بھی قائم کیے گئے ہیں۔

یہ ایک تنقیدی کتاب ہے۔ تنقیدی خیالات سے قاری کے اندر دلچسپی کا سامان بنا رہتا ہے۔ زبان صاف، پُر اثر ہے۔ ادب کے حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی مجھے ایسی امید ہے۔

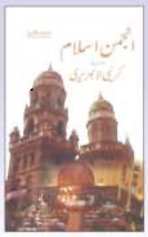

انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری

مصنف: شمیم طارق

صفحات: 272 قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی

شمیم طارق کی کتاب 'انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری' انجمن اسلام کی ایک سو بیالیس سالہ کارکردگی سے نہ صرف متعارف کراتی ہے بلکہ انجمن اور اس کی لائبریری کی مکمل خدمات کا احاطہ کرتی ہے۔ انجمن اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ مدرسۃ العلوم ایم اے او کالج سے ایک سال پہلے اس کا قیام عمل میں آیا۔ 1874 میں یہ انجمن قائم ہوئی جبکہ مدرسۃ العلوم 1875 میں قائم ہوا۔ اس کے قیام میں جسٹس بدرالدین طیب جی کا بہت اہم رول رہا ہے۔ یہ دونوں ادارے ہی بقول شمیم طارق 1857 کے بعد کی شب سیاہ میں خط روشن کی بازیافت کی حیثیت رکھتے تھے۔ الگ الگ مزاج و کردار کے حامل ہونے کے باوجود دونوں ملت کا اثاثہ ہیں۔ انجمن اسلام کے تاسیسی مقاصد اور اہداف پر مکمل روشنی ڈالتے ہوئے شمیم طارق نے بہت سی اہم معلومات جمع کردی ہیں۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ انگریزی جاننے اور انگریزی میں تفسیر و ترجمہ قرآن پاک پڑھنے والا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے عبداللہ یوسف علی کا نام نہ سنا ہو مگر یہ حقیقت چند لوگ ہی جانتے ہیں کہ عبداللہ یوسف علی طالب علم کی حیثیت سے انجمن اسلام میں داخل کیے گئے تھے اور ان کے ساتھیوں میں یعنی اس دور کے انجمن اسلام کے دوسرے طالب علموں میں بدرالدین طیب جی کے لڑکوں کے ساتھ محمد علی جناح بھی تھے۔ شمیم طارق نے انجمن اسلام کے قیام کے مقاصد پر بھی مکمل روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ انجمن اسلام ایک تعلیمی ادارہ تو ہے ہی جس کا مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا ہے لیکن اس ادارے نے مسلمانوں کے ملّی تشخص اور ثقافتی کردار کے تحفظ میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی حیثیت مسلمانوں کے ثقافتی مرکز کی بھی ہے۔ جس کو محفوظ رکھنا پوری ملت کی ذمے داری ہے۔ دینی احساس کا تحفظ اور دینی تعلیم کا انتظام بھی انجمن اسلام کے بنیادی مقاصد میں شامل رہا ہے۔ انجمن اسلام کی اہم خوبی یہ بھی ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے بچوں کے زیر تعلیم ہونے کے باوجود اس نے دینی تعلیم کے مسائل کو اتنی خوبصورتی سے حل کیا کہ کسی فرقے یا جماعت کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ بدرالدین طیب جی نے اس پر فخر کا اظہار کیا تھا:

''ہمارے اسکول میں تعلیم کا ایک پہلو ایسا تھا جس کی طرف ہم شروع ہی سے توجہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن اُسے ہم صرف گذشتہ سال (1894) ہی میں عمل میں لاسکے۔ انجمن کی ہمیشہ یہی رائے رہی ہے کہ مسلمانوں میں جزوی اختلافات کے باوجود (جن کی بنیاد پر فرقے قائم ہیں) تعلیمات کا بہت بڑا حصہ مشترک ہے اور یہ نہ صرف ممکن بلکہ ضروری بھی ہے کہ اسلام کی وہ تعلیمات جو متنازعہ فیہ نہیں ہیں، انجمن اسکول کے ان طلبہ کے ذہن نشین کرائی جائیں جو ابھی طفولیت کی منزل سے گزر رہے ہیں۔

(انجمن اسلام کے 100 سال: سید شہاب الدین دسنوی، بمبئی 1986، ص 120)

انجمن اسلام کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انجمن کے تحت بہت سے ادارے چل رہے ہیں جن میں پروفیشنل ٹیکنیکل ڈگری کالج بھی ہیں۔ تاسیس نسواں پر بھی اس ادارے کا خاص ارتکاز رہا ہے۔ اس کے تحت کئی ادارے قائم ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایسا ادارہ ہے جس نے تعلیمی شعور کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انجمن اسلام صرف تعلیم اور تدریس تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کی اشاعتی خدمات بھی اہم ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن اسلام کی ایک کریمی لائبریری بھی ہے جو قاضی عبدالکریم میمن کے عطیے سے قائم ہوئی ہے۔ ان کے والد قاضی نور محمد نے ایک کریمیہ پریس قائم کیا تھا۔ اس لائبریری میں تمام علوم و فنون کی اہم کتابیں محفوظ ہیں۔ مصنف کے بقول یہاں جن زبانوں کی کتابیں موجود ہیں ان میں عربی، فارسی اور اردو کی کتابیں تو ہیں ہی مراٹھی، گجراتی، سندھی، ملیالی، سنسکرت کے علاوہ پشتو اور انگریزی زبان کی کتابیں بھی ہیں۔ فارسی اور اردو میں شیو پران، رامائن، ہنومان چالیسا، بھگوت گیتا جیسی ہندو مذہب کی کتابیں مسلمانوں کی بے تعصبی اور انجمن اسلام کے ساتھ اردو زبان کے سیکولر کردار کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان کتابوں میں خاص بات یہ ہے کہ بیشتر کتابیں اور رسائل ڈیڑھ پونے دو برس پرانے ہیں۔

شمیم طارق نے لائبریری میں محفوظ چند اہم کتابوں کے عکس بھی شامل کیے ہیں۔ اس کے علاوہ کریمی لائبریری میں تقریباً 168 اخبارات موجود ہیں۔ انھوں نے ان اخبارات و رسائل کی فہرست بھی پیش کی ہے اور چند ٹائٹل کے عکس بھی شامل کیے ہیں۔ اس کتاب میں جن اخبارات کے عکس شامل کیے گئے ہیں ان میں کوہِ نور لاہور، پیسہ اخبار، زبدۃ الاخبار، جے پور گزٹ، معین الہند اجمیر، خالصہ گزٹ، مقبول عالم بمبئی، منشور محمدی، سراج الاخبار، سفیر ٹونک، صدائے ہند، نظام الملک، لٹن گزٹ، کارنامہ، اودھ اخبار، الوقت، فریادِ ہند، سول اینڈ ملٹری نیوز، صادق الاخبار، پنجاب گزٹ، اخبار انبالہ گزٹ، اخبار قیصری، جامِ جمشید وغیرہ شامل ہیں۔

شمیم طارق نے 142 سالہ انجمن اسلام کی تعلیمی، سماجی، اور ثقافتی خدمات کا احاطہ کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ یہ کتاب یقینی طور پر دستاویزی نوعیت کی ہے۔ امید ہے کہ علم دوست حلقے میں اس کا خاطر خواہ استقبال کیا جائے گا۔

سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

مرتبین: ڈاکٹر انیس صدیقی، ڈاکٹر رجیل صدیقی

صفحات: 530، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: رعنا پبلی کیشنز، A-21 اروند نگر کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد

مبصر: ڈاکٹر غضنفر اقبال، سائبان، زبیر کالونی ہاگرگا کراس، رنگ روڈ، گلبرگہ

شمس الرحمٰن فاروقی، اردو کے سربرآوردہ، بلند پایہ نقاد و فن کار ہیں۔ انھوں نے اردو ادب میں بہت لکھا، بے پناہ لکھا، اپنی تحاریر میں کچھ نہ کچھ نئی باتیں کہی ہیں۔ فاروقی صاحب کے ابتدائی ادبی کیریئر سے مختلف اصحاب، احباب اور صحیفہ نگاروں نے انٹرویو کیے ہیں۔ ان کی ملاقاتوں پر مبنی ایک کتاب ڈاکٹر رجیل صدیقی نے 'فاروقی: محوِ گفتگو' کے نام سے مرتب کی تھی۔ حال ہی میں فاروقی صاحب کے 28 مصاحبات پر مشتمل کتاب 'سو تکلف اور اس کی سیدھی بات' منظر عام پر آئی ہے۔ کتاب کے مرتبین ڈاکٹر انیس صدیقی اور ڈاکٹر رجیل صدیقی ہیں۔ یہ کتاب فاروقی صاحب کے حرف و دانش، اقوال زریں اور خیال انگیز باتوں کا ایک عالم ہے۔ ظاہر ہے فاروقی صاحب نے اپنی عالمانہ، استادانہ اور فاضلانہ گفتگو سے اپنا ایک عالم بنایا ہے۔

'سو تکلف اور اس کی سیدھی بات' میں ملاقات نگاری کے چار طریق کار ملتے ہیں (1) روبرو (2) مراسلاتی (3) سوانحی کوائف کی مدد سے سوالات کے جواب کی ترتیب (4) پینل انٹرویو۔ کتاب کے انٹرویو کار میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، انتظار حسین، ساقی فاروقی، ڈاکٹر آصف فرخی، گلزار جاوید، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر اطہر فاروقی،

ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر احمد محفوظ، سراج اجملی، پریم کمار نظر، ندیم صدیقی، عمران نقوی، صفدر رشید، رشید انصاری، اکرم نقاش، ڈاکٹر اطہر معز، اور ڈاکٹر رحیل صدیقی کے نام شامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں فاروقی صاحب نے اصناف نثر و شعر، اسلامی افکار، جدیدیت علم تصوف اور اردو زبان پر بحث کی ہے۔ ان مصاحبوں میں فاروقی صاحب کا انداز تیز و تند یا ماحول میں گرمی پیدا کرنے کا نہیں ہے بلکہ انھوں نے معروضی فکر اور استدلالی طرزِ اظہار کو اپنایا ہے۔ ملاقات نگار نے اپنی بساط بھر مساعی سے سوالات قائم کیے ہیں اور فاروقی صاحب سے تشفی بخش جواب حاصل کرنے میں کامران ہوئے ہیں۔ متکلم نے سکہ بند سوالوں سے بھی اجتناب کیا ہے۔ انٹرویو نگار کے سوالات فراست اور ذہانت کے آئینہ دار ہیں۔

فاروقی صاحب جدیدیت جیسے رجحان کے رجحان ساز نقاد ہیں۔ وہ ڈاکٹر رحیل صدیقی کے انٹرویو جو دراصل محمد حسن عسکری مرحوم کی ادبی صفات و جہات پر مبنی ہے، میں جدیدیت کی حمایت میں گویا ہوئے:

''جدیدیت نہ ہوتی تو وہ لوگ بھی نہ ہوتے جو آج جدیدیت کو برا بھلا کہنا اپنا مذہبی یا قومی فریضہ سمجھتے ہیں۔'' (ص 213)

زیرِ نظر کتاب میں ندیم صدیقی کے دلچسپ اور دل آویز انٹرویو نے راقم التحریر کا دل جیت لیا۔ یہ انٹرویو فاروقی صاحب کے سوانحی کوائف کو مدنظر رکھتے ہوئے لیا گیا ہے۔ فاروقی صاحب کے جواب نے اس انٹرویو کو خوب صورت بنا دیا ہے۔ یہ انٹرویو کا جدید طرز ہے۔ فی زمانہ اس طرز کے انٹرویو کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ 'سو تکلف اور اس کی سیدھی بات' میں رشید انصاری اور ڈاکٹر اطہر معز کے مصاحبات بھی اسی طرز کے ہیں۔ فاروقی صاحب کے یہ مصاحبات اردو کا گراں قدر تحریری سرمایہ ہیں۔ بقول مرتبین:

''یہ کتاب فاروقی صاحب کی ادبی شخصیت کو سمجھنے اور مختلف ادبی مسائل کو جاننے میں نہ صرف معاون ہے بلکہ ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔'' (ص 59)

کتاب کے مرتبین مبارک باد کے مستحق ہیں انھوں نے فاروقی صاحب کے مصاحبوں کو گرد کے حوالے ہونے سے محفوظ رکھا۔

بدلتے پیمانے

مصنف: ڈاکٹر یوگیندر ناتھ شکل، مترجم: ڈاکٹر حدیث انصاری
صفحات: 160، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: مترجم
مبصر: امتیاز احمد علیمی، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ہندی کے کہنہ مشق اور مختصر کہانی کار یوگیندر ناتھ شکل پچھلے تیس برسوں سے مسلسل ادبی ریاضت میں مصروف عمل ہیں۔ ان کے 500 سو سے زائد مختصر افسانے، چند تحقیقی و تنقیدی مضامین ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں نیز ان کی کہانیوں کے تراجم ملک کی مختلف زبانوں مثلاً گجراتی، پنجابی، سندھی، انگریزی، سنسکرت، کنڑ، مراٹھی اور مالوی میں ہو چکی ہیں اور ان زبانوں میں مقبول عام بھی ہیں۔ ابھی تک اردو میں ان کی کہانیوں کا ترجمہ نہیں ہوا تھا چنانچہ اردو میں ترجمے کا کام ڈاکٹر حدیث انصاری نے بہت ہی دلجمعی اور باریک بینی سے کیا ہے اور اس کے فنی لوازم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس مجموعے کا نام 'بدلتے پیمانے' رکھا ہے۔

'بدلتے پیمانے' مختصر کہانیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں تقریباً 112 مختصر کہانیاں شامل ہیں اور ہر کہانی ایک صفحے یا اس سے کم ہی پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل کہانیاں متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس ترقی یافتہ سماج میں زندگی، انسان، سماج، معاشرہ، سیاست، مذہب، افکار و نظریات، اقدار و روایات، اصول و ضوابط، اخلاقیات، تعصب، تنگ نظری، عریانی، زنا، فریب، مکاری، ظلم اور زیادتیوں نے کتنے پیمانے بدلے، ان بدلتے پیمانوں کا اندازہ اس مجموعے کے مطالعے کے دوران ہوگا۔ اس مجموعے میں شامل پہلا افسانچہ 'تصویر' ہے جس میں موجودہ تعلیمی زبوں حالی کے ساتھ ملک میں پھیلی غریبی، دہشت گردی، فرقہ وارانہ فسادات، بدعنوانی، اور بے روزگاری کا نقشہ کھینچ کر تلخ حقائق کی تصویر کشی کی ہے۔

دوسرا افسانچہ 'آپ بیتی' ہے۔ آپ بیتی دراصل انسان کی اپنی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اس میں کذب اور جھوٹ نہ کے برابر ہوتے ہیں مگر انسان کا اپنے آپ سے روبرو ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ اس آپ بیتی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ 'فن کار' میں اختر میاں کی فنکاری اور 'چراغ' میں والدین کے دو چشم و چراغ یعنی بڑا بیٹا اور چھوٹا بیٹا دونوں کا ان کی امیدوں پر پانی پھیرنا یعنی بہن کی شادی میں والدین کا ہاتھ نہ بٹانا، 'جنون' میں انسان جنونیت کے عالم میں کس طرح حیوانیت کا کام انجام دیتا ہے اور انسانیت پر سوالیہ نشان لگاتا ہے یہ اس کہانی سے ظاہر ہوتا ہے۔ 'تحفہ' میں تعلیمی اداروں میں در آئے کرپشن کی لعنت ہے۔ 'فریب' میں انسانی مکر و فریب، 'جیب کترے' میں ہندوستانی محکمہ پولیس کی اصلیت، 'بے بسی' میں حقائق کی پردہ پوشی اور سچ کہنے کی مشکلات، 'دانشمندی' میں ایمان دار افسران کے بے ایمان بننے کے اسباب، 'آدمی' میں انسان اور حیوان کے مابین فرق مٹانے والا جذبہ خود غرضی نمایاں ہوا ہے۔

مذکورہ بالا افسانچوں کے علاوہ بہت سارے دیگر افسانچے ایسے ہیں جو ہماری روز مرہ کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ یوگیندر ناتھ شکل کے افسانچوں میں امیر غریب، ادنیٰ، اعلیٰ، ٹیچر، مزدور، کلرک، دوکاندار، نیتا، سپاہی، افسر، ڈرائیور اور مرد و عورت وغیرہ عام کردار پائے جاتے ہیں جو مختلف مقامات پر مختلف حالات کے دائروں میں نت نئے مسائل سے دوچار نظر آتے ہیں۔ ان سب کے اپنے اپنے مسائل ہیں جن سے وہ جوجھتے ہیں۔ ایسے افسانچوں میں بھوت، حسد، بارش، فریب، تعلیم یافتہ، بندھن، خلش، ذہنیت، عاجزی، سایہ، دانا اور مرغا، نئی رپورٹ، نیم فوجی، بوائے فرینڈ، جرم، شیطان، اپنے اپنے خواب، جیب کترے، بے جان جسم، دانش مندی، راون اور قدامت پرست وغیرہ قابل ذکر ہیں جو عام انسانی زندگی کے شب و روز کا حصہ ہیں۔ یوگیندر ناتھ شکل کے افسانچوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام فہم ہے، غیر رسمی اسلوب اور انداز بیان ہے۔ ان کے کردار ہمارے چلتے پھرتے کردار ہیں نہ کہ ماورائی اور خیالی کردار۔ ان کی زبان صاف اور شستہ ہے۔ انھوں نے اپنے کرداروں سے عہد حاضر کے ان واقعات و حادثات کی نشاندہی کی ہے جن کی طرف لوگ کم سے کم دھیان دیتے ہیں۔ اس لیے اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے ہمارے سامنے وہ تصویریں آتی ہیں جو ہماری زندگی کی دیکھی بھالی تو ہیں لیکن انھیں رک کر دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا، اور اگر دیکھتا بھی ہے تو اس پر سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس مجموعے میں جتنی تصویریں ہماری روز مرہ کی زندگی کی پیش کی گئی ہیں وہ سب مصنف کے ذاتی مشاہدے کا حصہ ہیں۔ کم وقت میں آسانی سے اس مجموعے کو پڑھا جا سکتا ہے۔

شیرازی کہانیاں

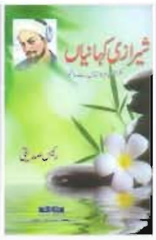

مصنف: رئیس صدیقی
صفحات: 72، قیمت: 48، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: مصنف
مبصر: رئیس الدین رئیس
جے 65، سفینہ اپارٹمنٹ، میڈیکل روڈ، علی گڑھ

ادبِ اطفال کی اہمیت اور ضرورت کو شروع سے ہی محسوس کیا گیا کیونکہ مفرسنی کے عالم میں صحت مند ادب اطفال کے ذریعے بچوں میں بآسانی مذہبی دینی تہذیبی اخلاقی اوصاف اور حب الوطنی کے جذبات جگا کر انھیں ایک اچھا شہری اور بہترین انسان بنانے نیز راہ راست پر چلانے کا کام بحسن وخوبی انجام دیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال، اسماعیل میرٹھی، کرشن چندر اور سراج انور نے بھی بچوں کی تعلیم و اصلاح کے لیے ادب اطفال کی تخلیق کو لازم وملزوم مان کر ادب کو بہت کچھ دیا تھا اور آج بھی بچوں کے مقبول وممتاز ادیبوں میں حافظ کرناٹکی، وکیل نجیب اور رئیس صدیقی نقطۂ عروج پر نظر آتے ہیں۔

رئیس صدیقی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچوں کی افتادِ طبع، ان کے مسائل، ان کی نفسیات، ان کے مزاج ومنہاج، ان کی پسند وناپسند اور ان کے ذوق ورغبت کو دھیان میں رکھ کر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، وہ اس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ کہانی میں مقصد یا پیغام کو موج تہہ نشیں کے درجے سے متجاوز نہیں ہونے دیتے اور پند و موعظت کے التزام سے صاف بچ جاتے ہیں۔

'شیرازی کی کہانیاں' شیخ سعدی شیرازی کی شہرۂ آفاق نثر ونظم پر مبنی کتب گلستاں اور بوستاں سے بذریعے ترجمہ مستعار لی گئی ہیں۔ اخلاقی تعلیمات میں یہ ایرانی کتب بے عدیل و بے نظیر ہیں۔ رئیس صدیقی نے فارسی کی ان کہانیوں کو اردو میں کچھ اس خوبی سے منتقل کیا ہے کہ ان پر طبع زاد کا گمان گزرتا ہے۔ شیرازی کے اقوال زریں ملاحظہ ہوں:

- علم دنیا کی ساری دولت سے بہتر ہے۔
- علم وفن اور عقل وادب سے آدمی بڑا بنتا ہے۔
- کسی کا دل مت دکھاؤ۔ دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔
- اپنا وعدہ پورا کرو تاکہ تم پر سبھی دوست اور دشمن بھروسا کریں۔
- دشمن سے لڑنے جھگڑنے کے بجائے دوستی کرنا بہتر ہے۔

ان اقوال زریں کے علاوہ کتاب میں مختصر باعنوان کہانیوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ 'خدا کا شکر کرو' کہانی میں ایک مرید اپنے مرشد سے شکوہ کرتا ہے کہ برائیاں ترک کردینے کے باوجود لوگ اسے برا سمجھتے ہیں آخر کیوں؟ مرشد فرماتے ہیں یہ اس سے بہتر ہے کہ ہم برائیوں میں ملوث ہوں اور لوگ تمھیں پارسا سمجھیں۔ 'ظلم کی عبادت' ایک ایسی کہانی ہے، جس میں ایک ظالم بادشاہ کسی برگزیدہ بزرگ سے پوچھتا ہے۔ کون سی عبادت سب سے افضل ہے؟ بزرگ نے جواب دیا تمھارے حق میں دن میں سونا ہی اچھی عبادت ہے کیونکہ محوخواب ہونے کے عالم میں تم ان گناہوں سے محفوظ رہو گے جو تم جاگنے کی حالت میں کرتے۔

اسی انداز کی علم وحکمت سے معمور دیگر کہانیاں دلچسپ اور بامعنی ہونے کے سبب قاری کو ہمسفر بنا کر اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں۔

جنوبی ہند میں اردو افسانہ نگاری: آزادی کے بعد

مصنف: ڈاکٹر پی داؤد خان
صفحات: 256، قیمت: 237 روپے
ناشر: سری وینکٹیشورا یونی ورسٹی، تروپتی، آندھرا پردیش
مبصر: محمد عبدالرحمٰن ارشد، ڈی۔3،
ٹی ٹی ایچ، مکھرجی نگر، دہلی 110009

'جنوبی ہند میں اردو افسانہ نگاری: آزادی کے بعد' ہندستان کے جنوبی خطے میں افسانوی ادب کی کھوج پرکھ کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر پی ایچ ڈی کے لیے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ہے جسے ازسرنو ترتیب واضافہ کے بعد مصنف ڈاکٹر پی داؤد خان نے شائع کروایا ہے۔ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ جنوبی ہند کا افسانوی ادب وقیع ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آزادی کے بعد آندھرا پردیش، کرناٹک اور تامل ناڈو کے افسانہ نگاروں نے افسانوی ادب کے میدان میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔ 'جنوبی ہند میں اردو افسانہ نگاری: آزادی کے بعد' جنوبی ہندستان کے نوجوان افسانہ نگاروں کی خدمات کا اعتراف ہے۔ ساتھ ہی اس علاقے کے بزرگ افسانہ نگاروں کی خدمت میں خراج عقیدت ہے۔

کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلے باب کا عنوان 'آزادی کے بعد آندھرا پردیش میں اردو افسانہ نگاری' ہے۔ ریاست آندھرا پردیش کے اضلاع کڈپہ، نظام آباد، محبوب نگر وغیرا اردو زبان کے حوالے سے اہم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ احمد نگر، گول کنڈہ اور بیجاپور میں اردو کی جو ابتدائی کتابیں لکھی گئیں، وہ کلاسیکی ادب کے ناقابل فراموش سرمائے ہیں۔ ڈاکٹر خان لکھتے ہیں کہ حیدرآباد میں افسانہ نگاری کے میدان میں خواتین نے نسبتاً زیادہ سرگرمی دکھائی۔ صغرا ہمایوں اور طیبہ بیگم اس کی بین مثالیں ہیں۔ ان کے یہاں نسوانی کردار کی پیش کش اصلاحی انداز میں کی گئی ہے۔ اس باب میں مصنف ڈاکٹر خان اردو افسانے کے ایک اہم پہلو 'اسلامی ادب' کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ ان کے خیال میں ترقی پسند تحریک کے زیراثر لکھے گئے افسانے گوکہ حقائق اور عصری حسیت کے ترجمان ہیں لیکن مضبوط وتوانا فکروخیال اور روشن مستقبل کی بشارت ادب اسلامی جیسے تعمیری ادب میں ہی ممکن ہے۔ اسلامی ادب کے ضمن میں جیلانی بانو، ابن فرید اور بشیرالحسن کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ واجدہ تبسم، مظہرالزماں خان، حامد محمود، غیاث صدیقی، بیگ احساس، اقبال متین اور عوض سعید کی افسانہ نگاری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جس میں متذکرہ افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی شامل ہے۔ واجدہ تبسم کے افسانہ 'بند دروازے' کا تجزیہ بھی موجود ہے۔ آندھرا پردیش کے نسبتاً کم مشہور افسانہ نگار شانتی رنجن بھٹا چاریہ کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ بھٹا چاریہ کے افسانوں میں آزادی کے وقت کی سیاسی اور سماجی تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے علاوہ آندھرا پردیش کے ضلع کڈپہ کے دو افسانہ نگار محمود شاہد اور ڈاکٹر محمد انور کے افسانوں پر بھی اس باب میں سیر حاصل گفتگو ہے۔

جنوبی ہندستان کی ریاست کرناٹک شاندار تہذیب وثقافت اور تاریخی اہمیت کی دیومالائی روایتوں کی وجہ سے قابل لحاظ رہی ہے۔ یہاں کے عوام کی اکثریت کنڑا زبان بولتی ہے۔ تاہم گلبرگہ، بیدر اور رائچور ایسے اضلاع ہیں جہاں اردو کا چراغ روشن ہے۔ ڈاکٹر خان نے کرناٹک میں اردو افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان تینوں اضلاع کے افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر خان لکھتے ہیں کہ ویسے تو گلبرگہ میں کئی افسانہ نگار اپنی تخلیقات پیش کررہے ہیں لیکن کوثر پروین کے افسانوں میں عصری رجحانات

نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر خان نے انھیں حساس افسانہ نگار تو بتانے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی افسانہ نگاری پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ ضلع بیدر کے افسانہ نگار اکرام باگ اور محمد ارشاد الحق انجم کی افسانہ نگاری پر مختصراً گفتگو کی گئی ہے۔ کرناٹک کے اہم ضلع رائچور میں افسانہ نگاری کی صورت حال پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس حصے میں نصرت مسرور، اعظم عرفان، شریف انور اور ناظم خلیلی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی میسور اور بنگلور کے بعض افسانہ نگار انل ٹھکر، حمید سہروردی، م ن سعید، قاضی انیس الحق وغیرہ کی افسانہ نگاری پر بھی ڈاکٹر خان نے نظر ڈالی ہے۔

ریاست تمل ناڈو میں افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خان نے ادیب بھارتی، مہر طلعت، شبیب احمد کاف، انور ربانی، محمد یعقوب اسلم اور عابد صفی کی افسانہ نگاری پر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ آخری باب میں ڈاکٹر خان نے اپنی تحقیق کی تلخیص پیش کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیر نظر کتاب میں اگر ہر افسانہ نگار کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا جاتا تو کتاب اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی۔ شاید کتاب کی ممکنہ طوالت اس میں حارج ہوئی ہو۔ لیکن یہ کمی قاری میں تشنگی کا احساس پیدا کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر خان درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ کتاب میں آسان زبان کا استعمال، جچے تلے الفاظ، دلکش انداز بیان اور لہجے کی ملائمت ان کی تدریسی مہارت کا بھی ثبوت پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے علاقہ وار افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے تقریباً ہر علاقے کا مختصراً تاریخی اور ثقافتی پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ اس کتاب کو جنوبی ہند میں افسانہ نگاری کی صورتِ حال کے عمومی جائزے کے بہ طور بھی لینا چاہیے جس میں اس علاقے کے تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کا تذکرہ اور تعارف موجود ہے۔

جدیدیت کا مغنی: اسعد بدایونی

مصنف: محمد رضوان خان

صفحات: 208، قیمت: 112 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی

مبصر: پروفیسر راشد طراز، عبید منزل، دلاور پور، مونگیر، بہار

'جدیدیت کا مغنی اسعد بدایونی' محمد رضوان خان کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ ہے، جسے انھوں نے اسعد بدایونی کے کلام سے نمائندہ بیس غزلوں کے انتخاب کے اضافے کے ساتھ بڑے ہی جذباتی احساس سے کتابی شکل دی ہے۔

جب تنقید میں جذبات کا دخل ہو جاتا ہے تو تنقید تأثراتی بن جاتی ہے لیکن مصنف محمد رضوان خان کا اندازِ نقد اس منزل پر مغلوب جذبات ہونے کے باوجود معروضی اور استدلالی ہے اور تنقید کے منطقی فریضہ کو انجام دینے میں کامیاب رہا ہے۔ اس کتاب کو دس ابواب میں منقسم کیا گیا ہے جس میں سات ابواب مصنف کے بیش قیمت قلم سے تحریر ہوئے ہیں اور ایک باب بعنوان ''جدید اردو غزل اور اس کی روایت'' خود اسعد بدایونی کا تحریر کردہ مضمون ہے جسے محمد رضوان خان نے ڈائجسٹ کیا ہے نیز جو اس کتاب کے بنائے گئے ابواب میں داخلِ بیجا نہیں بلکہ لازمی اور Relevant باب ہے جس سے اسعد بدایونی کے مطالعے اور تجزیاتی انداز کا علم بھی ہوتا ہے بقیہ دو ابواب میں، ایک اسعد بدایونی پر منظوم خراج عقیدت پر مشتمل ہے اور آخری باب اسعد کے کلام سے نمائندہ غزلوں کے انتخاب پر مبنی ہے۔ مذکورہ کتاب میں جہاں جہاں شاعر کی حیات و شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے وہ یقیناً جذباتی اور تأثراتی ہے جس سے قطع نظر اس کے تین چار ابواب بڑے ہی اہم ہیں۔ 'جیسے اسعد بدایونی اور جدید تر غزل ہم عصر شعرا کے حوالے سے'، 'اسعد بدایونی اور تصور انا'، 'اسعد بدایونی اور تصور عشق'، 'اسعد بدایونی کی غزلوں میں شعری صنعت کا التزام'، 'اسعد بدایونی کی شاعری میں عصری معنویت کی تلاش' وغیرہ۔ مصنف محمد رضوان خان نے اسعد بدایونی کی غزلوں کی تفہیم میں انھیں 1980 کے بعد کے شعرا میں گردانا ہے جو غلط ہے۔ کیونکہ اسعد بدایونی کی غزلوں کی پہلی اشاعت مشہور زمانہ رسالہ 'شب خون' کے 1977 کے اواخر کے شمارے میں ہو چکی تھی جس شمارے میں انھیں متعارف کرتے ہوتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ان کو نوجوان اردو اسکالر بتایا تھا۔ بہر کیف 1980 کے بعد ان کی شاعری جسے مصنف مذکور 'جدید تر شاعری' کی اصطلاح کی خصوصیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، واقعی صحیح شمار و تجزیہ ہے۔

اس کتاب کے دو اہم ابواب 'اسعد بدایونی اور تصور انا' اور 'اسعد بدایونی اور تصور عشق' پر خاصی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ رضوان خان، اسعد بدایونی کے کلام میں عشق کے تصور کو پوری طرح واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسعد کے تصور عشق میں عشقِ مجازی اور حقیقی دونوں کو ثابت کرنے پر بضد ہوئے ہیں جب کہ اسعد کا کلام عارفانہ نہیں بلکہ خالصتاً مجازی ہے جس میں وہ بہت بے باک بھی دکھائی پڑے ہیں۔

دوسرا اہم باب 'اسعد بدایونی اور تصور انا' ہے جہاں 'انا' کو 'خودی' سے تعبیر کیا گیا ہے یہ بحث خاصی متنازع فیہ ہے جس سے اتفاق کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ انا ایک منفی صفت ہے اور خودی اتنی مثبت ہے کہ اس کے دائرے میں خود نگری اور خود احتسابی اور جذبہ ایثار و قربانی بھی آ جاتے ہیں۔ اور انا کہیں کہیں پر اتنی منفی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی شدت میں تصادم اور جنگ کو بھی راہ دے سکتی ہے عالمی انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ''تصور انا'' کو کبھی Socio-Political Ligitimacy حاصل نہیں رہی۔

ایک بہت اہم باب جو کہ باب آخر بھی ہے وہ 'اسعد بدایونی کی شاعری میں عصری معنویت کی تلاش' ہے۔ اس باب میں محقق و ناقد محمد رضوان خان نے بہت شدت کے ساتھ اسعد بدایونی کے مقام کا تعین کرنا چاہا ہے نیز جو ایک مکمل بحث ہے۔ ذیل میں ہم ان کے اس بیان کا ابتدائی حصہ نقل کر رہے ہیں۔ جس سے ان کے تنقیدی تیور کا اندازہ ہو سکتا ہے......'

''کچھ سوالات اور ہیں جنھیں میں تحریر کرنا مناسب جانتا ہوں۔ کیا اسعد بدایونی کی شاعری جدید تر غزل کے تقاضے کو پورا نہیں کرتی؟ کیا آپ کی شاعری میں جدید غزل کی علامتیں موجود نہیں ہیں؟ کیا یہ شاعری پیکر تراشی سے خالی ہے؟ کیا اسعد کی شاعری جدید تر شاعری کی لفظیات سے خالی ہے؟ کیا یہ شاعری نئے دور میں فٹ نہیں اترتی؟ کیا اسعد بدایونی کی شاعری جدید تر شاعری کی بنیادی مباحث سے خالی ہے؟ کیا اسعد بدایونی کی شاعری میں سیاسی اور سماجی شعور کی کمی پائی جاتی ہے؟ کیا اسعد بدایونی کی شاعری میں جدید تر غزل کے اسلامی افکار و اقدار کی بازگشت سنائی نہیں دیتی؟''

محمد رضوان خان نے یہاں بحث کے نئے دروازے کھولے ہیں۔ انہیں اوصاف کی بدولت انہوں نے اسعد بدایونی کو اس عہد کا سب سے معتبر اور بڑا نام ثابت کرنے پر اصرار کیا ہے۔ اور اپنے تجزیہ میں تنقید کی اس Objectivity کو بروئے کار لانے کی تمام اہل نقد کو تحریک و صلاح دی ہے۔ جو خاصا غور طلب ہے۔ اپنی اس بحث میں وہ اسعد کے اشعار کو بھی پیش کرتے ہیں اور انھیں Categorically اپنے تجزیہ میں بھی لاتے ہیں۔

یہ کتاب اسعد بدایونی کی غزل کے نمائندہ انتخاب کو بھی پیش کرتی ہے جو کہ اضافی ہوتے ہوئے بھی اہم اور کارآمد ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ اول فلیپ پر شہنشاہِ جدید غزل ظفر اقبال کا اسعد بدایونی کے کلام پر بے لاگ تاثر ہے جسے اسعد

بدایونی پر ہوئی اب تک کی تنقید کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔

محمد رضوان خان کی اس کتاب سے جدید اردو غزل کے مزاج و میلان کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ خصوصاً اسعد بدایونی کا جو مضمون اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اس میں اچھی خاصی بحث جدید اردو غزل کے حوالے سے اس کے میلانات پر کی گئی ہے۔ دوم یہ کہ ''اینٹی غزل'' کے حوالے سے ماضی قریب میں ہمارے پیش روؤں نے جو خام تجربے کیے وہ کس طرح منفی ثابت ہوئے اس کا بھی اندازہ ملتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب کو اسعد بدایونی پر ہوئی تنقید کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ جس کی طباعت اور گیٹ اپ وغیرہ بھی بہت عمدہ ہے۔

آفاق

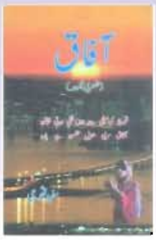

مصنف: مفید قنوجی
صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: مفید خان
مبصر: عبدالباری ایم کے

شعری مجموعہ 'آفاق' کے حوالے سے مفید قنوجی سے میرا غائبانہ تعارف ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے ان کی شخصیت کا اندازہ ہوا کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام 'آفاق' کے ذریعے اپنے خیالات، احساسات اور تجربات کو شعری پیکر میں ڈھال کر لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام 'آفاق' میں حمد، نعت، منقبت، غزلیں، اور دوہے وغیرہ ہیں جو قاری کے دلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مجموعے میں مختلف مضامین کو شعری جامہ پہنایا ہے۔

ادیب، فنکار اور شاعر بڑے حساس دل کے مالک ہوتے ہیں۔ مفید قنوجی بھی حساس ہونے کے ساتھ ساتھ رحم دل انسان ہی نہیں بلکہ حقیقت پسندی اور انسانیت ان کے اندر نہاں ہے۔ ان سب کی غمازی ان کا شعری مجموعہ 'آفاق' کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ ان کا دل عشق و محبت، خوشی و غم سے خالی ہے۔ ان کی غزلوں میں محبوب سے شکوہ و شکایات کے علاوہ زمانے کے تغیر پذیر حالات اور ان میں رونما ہونے والے حوادث کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مفید ناگہاں آئی ہوئی پریشانیوں اور حالات سے گھبراتے نہیں بلکہ جہد پیہم میں یقین رکھتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

پھر سے مفید اک نیا آغاز کیجیے — محنت اگرچہ آپ کی ناکام ہوگئی
اب وہ ملنے بھی نہیں آتے ہیں — حوصلہ ٹوٹ گیا ہے شاید
خدا نے تجھے ظرف اعلیٰ دیا ہے — تو کم ظرف لوگوں کی صحبت نہ کرنا

قنوجی کے مجموعے 'آفاق' میں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں۔ جو تصوف اور صوفیانہ انداز لیے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں تو غالب اور اقبال کی طرز ادا جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے:

خدا سے محبت کا دعویٰ ہے جھوٹا — اگر آدمی سے محبت نہیں ہے
ذرّے ہیں میری منزلِ مقصود کے تارے — دنیا یہ سمجھتی ہے کہ میں خاک نشیں ہوں
پھینک مت سکہ کہ کھوٹا ہی سہی — کام آجاتی ہے شے بیکار بھی

شاعر اپنے مجموعہ 'آفاق' میں حب الوطنی کے جذبے، اسلاف کے کارناموں اور قربانیوں کو یاد دلا کر وطن پر اپنا اتنا ہی حق سمجھتا ہے جتنا اوروں کا حق ہے۔ مفید قنوجی قومی جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ان کے دل کی گہرائیوں سے جو آواز نکلتی ہے وہ محض آواز ہی نہیں بلکہ وہ ایک پیغام ہوتی ہے ان لوگوں کے لیے جو اسلاف اور ان کے کارناموں کو فراموش کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

نسلوں سے قربانی دے کر ہم نے پھول کھلائے ہیں
اور ہمیں سے کہتے ہو اس گلشن کے حقدار نہیں

شاعر کا نام مفید خان اور قلمی نام مفید قنوجی مجموعہ کلام آفاق جسے شاعر نے اپنے پیر کے نام سے منسوب کیا ہے۔ کتاب کا سرورق خوبصورت ہے۔ جس پر کتاب کا نام، ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر ہے جو بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہے۔ یہ شعر بھی تحریر ہے:

قنوج کی مٹی سے ہوں نکلی ہوئی خوشبو
آفاق مری منزل مقصود ہے یارو

کتاب میں صفحہ نمبر 8 سے 16 تک ڈاکٹر ماجد...... پاکیزہ جذبے کا شاعر مفید قنوجی.....'جوہر کانپوری جس کی دنیا میں بڑی پہچان ہے.....محمد شریف قریشی فتح گڑھ...... مفید قنوجی کے شعری مجموعہ کلام پر ایک اجمالی تاثر......ان حضرات کے مضامین ہیں جن میں مفید قنوجی اور ان کے کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صفحہ نمبر17 اور 18 پر شاعر نے اپنے تعارف کے لیے ایک نئی ڈگر اپنائی ہے اور اپنا تعارف نثر کے بجائے نظم میں پیش کیا جو قابل تعریف ہے۔ صفحہ 19 پر حمد، صفحہ 20 سے 22 تک نعتیہ کلام، صفحہ 23 پر ایک منقبت، صفحہ 24 سے 143 تک 118 غزلیں، صفحہ نمبر 144 سے 147 تک 4 ہندی غزلیں، صفحہ نمبر 148 پر 1 گیت، صفحہ نمبر 149 سے 151 تک نظم شہرنامہ، صفحہ نمبر 152 پر 1 منفرد نظم، صفحہ نمبر 153 سے 160 تک دوہے، اور پشت پر شاعر قنوجی کی خوبصورت تصویر کے ساتھ یہ شعر درج ہے:

خزاں کے پھول ہیں ہم اور ویرانے میں کھلتے ہیں
ہماری آرزو ہوتی ہے خود بادِ بہاری کو

پر مشتمل مفید قنوجی کا مجموعہ کلام 'آفاق' ہے جو قابل ستائش ہے۔

شاعر کا یہ پہلا مجموعہ ہے جس کی تمام نظمیں اور غزلیں معیاری ہیں، جو باذوق حضرات کو پسند آئیں گی۔ شاعر کی کاوش رائیگاں نہیں جائے گی۔ انھوں نے اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ جو اردو ادب کے افق پر درخشندہ ستارے کی مانند جگمگاتا رہے گا۔

سہ ماہی **تحریک ادب**

مدیر: جاوید انور
شمارہ: 22، سنہ اشاعت: 2015
صفحات: 216، قیمت: 100 روپے
ناشر: جاوید انور، اردو آشیانہ، 167 آفاق خان کا احاطہ، مرواڈیہہ بازار، وارانسی
مبصر: اسلم مصباحی، ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اس بات میں شک نہیں کہ ادبی رسائل و جرائد ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں، رسالہ تحریک ادب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو محترم جاوید انور کی ادارت میں بنارس سے شائع ہو رہا ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ محض رسالہ نہیں ہے بلکہ ایک تحریک ہے جو رسالے کے علاوہ ادبی کتب کی بھی اشاعت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ زیر تبصرہ رسالے میں مضامین کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے جس میں حمد، نعت، اسلامیات، فلسفہ، شخصیت، فکشن، لسانیات، فکشن تنقید، تحقیق نگاری، غزلیں، افسانے اور مشاہیر سے لیے گئے انٹرویو بھی شامل ہیں، اس رسالے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ریسرچ اسکالر کے مضامین کو بھی خاصی تعداد میں جگہ دی گئی ہے جو عموماً مشکل سے اکا دکا نصیب ہوتی ہے حالانکہ اسکالر کو شامل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تبھی اردو کے مستقبل کو تحریک اور نئی روشنی حاصل ہوگی۔

حمد و نعت کے بعد مولانا وحیدالدین کا مضمون 'خدا کا فلسفیانہ تصور' شامل کیا گیا ہے،

یہ محض ایک صفحے کا مضمون ہے جس میں خدا کے وجود پر فلسفیانہ دلائل پیش کیے گئے ہیں لیکن عنوان کے مقابل مضمون بہت مختصر اور عام قاری کے لیے ناکافی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسالے کی مقبولیت کے لیے مولانا کا مضمون کسی کتاب سے بطور حکمت عملی اخذ کیا گیا ہے۔ نعتیہ گوشے میں ڈاکٹر شفیق اجمل کا مضمون بطور خاص اہمیت کا حامل ہے، اولاً تو آپ نے علامہ سبطین رضا خان کی نعتیہ شاعری کے فنی محاکے کے علاوہ صنف نعت پر بھی گفتگو کی ہے ثانیاً یوں کہ طویل مدت کے بعد صنف نعت کو ادبی میدان میں متعارف کرانے کی بہترین کوشش کی ہے، صنف نعت کو مذہب کا طعنہ دے کر ادب سے الگ کردیا گیا اس طرح محسن کاکوری کے بعد ادب کا خاص حصہ ہم سے الگ ہوگیا جس میں بہزاد لکھنوی کا خاص طور سے نام لیا جاسکتا ہے خود علامہ سبطین رضا خان کے خاندان میں امام احمد رضا خان، علامہ حسن رضا خان اور مصطفیٰ رضا خان نے اعلی پایے کی نعتیہ شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں جس میں ادب کی چاشنی، فنی محاسن اور عشق کی سچی کیفیات کا مطالعہ بخوبی کیا جاسکتا ہے، سوانحی زمرے میں پرتپال سنگھ بیتاب نے اپنی کشمیر سے جڑی یادوں اور امید وبیم کے مابین پنپنے والے انسانی رشتوں پر بات کی ہے، شخصیات میں 6 مضامین ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی سے متعلق ہیں جس میں تین مضامین اسلام اعظمی کے ہیں، ان تمام مضامین میں ڈاکٹر عرشی کے شعری مجموعوں پر تبصرہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی عرب کے باشندے ہیں وہ ملک پاکستان میں میڈیکل کی تعلیم کے لیے آئے اور یہیں یار دوستوں سے اردو زبان سیکھی اور اب تک ان کے 48 مجموعے شائع ہوچکے ہیں، ڈاکٹر عرشی کے کلام میں عشق کی کیفیات اور تغزل کا عمدہ نمونہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

چارہ گر کرنے لگا جب سے طرفداریِ دل
اور بھی بڑھنے لگی دوستو! بیماریِ دل

مضامین کے گوشے میں اسکالر رضوانہ شمسی کا مضمون 'تدوین متن کے طریقۂ کار' اہمیت کا حامل ہے، شخصیات میں ایک اور مضمون سیفی سوپوری سے متعلق ہے جس میں آپ کی شاعری اور تراجم کے حوالے سے گفتگو شامل کی گئی ہے، ان کا ایک شعری مجموعہ 'صحرا صحرا' 2011 میں منظر عام پر آیا جبکہ آپ کی زیادہ تر دلچسپی اسلامیات اور عالمی فلسفے میں ہے لہٰذا آپ نے ترجمے کی شکل میں کئی تصانیف سے ہم کو مالا مال کیا ہے جس میں فلسفۂ وجودیت سے متعلق سارتر، میک قوری اور بلیک ہم کی کتابوں کے ترجمے شامل ہیں۔ امام غزالی کی کیمیاے سعادت کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا اور شرح مائۃ عامل کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جاوید احمد مغل نے 'وارث کی موت افسانوی تنقید کی لاوارثی' کے عنوان سے متعلق خامہ فرسائی کی ہے جس میں ان کی تخلیقات، تحقیقات، اور تنقیدی کارناموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی ان کے گھریلو حالات اور شخصی پہلوؤں پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن وارث جیسے بے باک اور جارحانہ قسم کے نقاد کی کما حقہ خدمات کا اعتراف اختصار سے کیا جانا ناانصافی اور ادبی بخیلی ہے۔ لسانیات اور ترجمہ نگاری سے متعلق اسکالر خلیل احمد کا مضمون بھی لائق مطالعہ ہے جس میں آپ نے لسانیات اور ترجمہ نگاری سے متعلق چند اصول اور اصطلاحات کا متبادل پیش کیا ہے، اسکالر مختار احمد نے 'پریم چند اور کفن' کے عنوان سے افسانہ کفن کا روایتی انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ دیگر مضامین میں بلبیر کا مضمون 'پریم چند کے افسانوں میں مشترکہ تہذیب' ڈاکٹر الطاف حسین کا 'اردو افسانے میں ہندو مسلم اتحاد' بالکل منفرد نوعیت کے ہیں، تہمینہ جان کا مضمون کشمیر کی موجودہ تحقیق و تنقید نگاری پر روشنی ڈالتا ہے، اسکالر سید مسرت گیلانی کا مضمون قاضی عبدالستار کی تاریخی ناول نگاری سے متعلق خاصا مفصل اور لائق مطالعہ ہے۔ گوشۂ اکرم شروانی میں پروفیسر صغیر افراہیم کا تعارفی مضمون اور ڈاکٹر سیما صغیر کا انٹرویو بھی قابل غور ہے، اسی سے متصل اکرم شروانی کے پانچ افسانے بھی بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں، غزل کے گوشے میں مختلف شعرا کی منتخب غزلوں کو پیش کیا گیا ہے، آخر میں آنند لہر کا افسانہ 'سرحد کی آواز' کافی دلچسپ اور انسانی فطرت کو بے پردہ کرنے والا اور ضمیر کو جھنجوڑنے والا ہے۔

جملہ طور پر رسالہ کافی حد تک مفید ہے لیکن ٹائپنگ کی بے شمار غلطیاں مطالعے میں خلل پیدا کرتی ہیں، سرورق دیدہ زیب ہے البتہ مشاہیر کی تصاویر کے ساتھ ان کے ناموں کا بھی التزام کیا جانا بہتر ہوگا تاکہ قاری اور رسالے میں مضبوط رشتہ بنا رہے۔

مختصر تبصرے

حافظ شیرازی

مصنف: ڈاکٹر ابوطالب انصاری/صفحات: 80، قیمت: 50 روپے
ملنے کا پتہ: رحمانی پبلی کیشنز 1032 اسلام پورہ، مالیگاؤں، ضلع ناسک (مہاراشٹر)

علم وادب کی پرکیف فضاؤں سے معطر ایران کا شہر شیراز جہاں اسلامی علوم وفنون کا مرکز تھا، وہیں اس کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے۔ ڈاکٹر ابوطالب انصاری نے بچوں کے لیے 'حافظ شیرازی' تصنیف پیش کرکے ان مصنفوں کی جانب سے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے جو 'ادب اطفال' کو 'ادب ممنوعہ' سمجھتے ہیں، بلکہ ادب ہی نہیں سمجھتے۔ یہ کتاب رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں کی تاریخی شخصیات سیریز کے تحت شائع کی گئی ہے کہ وہ ملک کے نامور قلم کاروں سے یہ خدمات لے رہے ہیں اور اب تک بقول ناشر سیکڑوں شخصیات پر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

اس کتاب میں حافظ شیرازی کی حیات وخدمات کو بڑے سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جب کوئی کتاب بچوں کے لیے لکھی جارہی ہو تو اس میں ادیب کو ان کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہوئے لکھنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ابوطالب انصاری نے اس پر بہتر انداز میں عمل کیا ہے اور ساتھ ہی شیراز کی اہمیت، حافظ شیرازی کے دور کے حالات اور اس کی تاریخ پر بھی گفتگو کی ہے، جس نے کتاب کو دوآتشہ بنادیا ہے۔

زنداں سے تخت شاہی تک

تالیف: عبدالعظیم معلم ندوی
صفحات: 56، قیمت: 40 روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ علی العلمیہ، مدینہ کالونی، بھٹکل

'زنداں سے تخت شاہی تک' محبت ونفرت، فراق و وصل اور غربت وشاہی کی دلچسپ تاریخی داستان ہے۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے مکمل واقعے کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ محمد ناصر سعید اکرمی نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے کہ قصۂ یوسف کو آج کا نوجوان پڑھے، بار بار پڑھے، بہ نظر غائر پڑھے، غور وتدبر کے ساتھ پڑھے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی اور بے داغ زندگی کو اپنے لیے نمونہ اور آئیڈیل بنائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو مؤلف عبدالعظیم ندوی نے اچھوتے اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوب نگارش بھی عمدہ ہے۔ ان کی تحریر دل میں گھر کرتی چلی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے حسن قلم سے ایک ایسے تاریخی واقعے کو دلچسپ طرز بیان میں پیش کیا ہے، جو واقعی انہی کا حصہ ہے اور جس پر انھیں داد نہ دینا ان کی حق تلفی ہوگی۔

دبستان علم و ادب (کتابی سلسلہ نمبر 2)

مدیران: گلشن عبداللہ، انیس الاسلام

صفحات: 80، قیمت: 50 روپے/ ناشر: دارالادب پلی کیشنز، فراش گنڈ بڈگام کشمیر

'دبستان علم و ادب' کے مدیران گلشن عبداللہ اور انیس الاسلام نے نئے قلم کاروں کی تربیت اور انھیں ایک اسٹیج فراہم کرنے کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ وہ اس کتابی سلسلے کے ذریعے جہاں علم و ادب کے نئے در وا کرنا چاہتے ہیں، وہیں لوگوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کر کے صبح فردا کی فکر اور ریاست کشمیر کے بکھرے ہوئے قلم کاروں کو ملک اور بیرونِ ملک متعارف بھی کرانا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی یہ کوشش قابل ستائش ہی سمجھی جانی چاہیے۔ اس کتاب میں یوں تو تمام مضامین خوب ہیں، لیکن ڈاکٹر شبیہ پروین کا مضمون 'اردو غزل- جدید اور مابعد جدید کے پس منظر میں'، ڈاکٹر شاہ فیصل کا 'داغ دہلوی کی مکتوب نگاری' اور ڈاکٹر محی الدین زور کا 'فلم حیدر- جہلم کے سینے سے چیر کر نکالی گئی ایک دل سوز داستان' اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ اہلِ ذوق کے لیے غزلیں بھی پیش کی گئی ہیں، جن کے معیار پر گفتگو ایک لاحاصل عمل ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور نئی تنقید

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات: 40، قیمت: 60 روپے/ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

ڈاکٹر وزیر آغا تنقید اور اس کی تشریح کے حوالے سے ایک معتبر اور مشہور شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ان کی تنقید سے متعلق 'وزیر آغا کی امتزاجی نظریہ سازی' اور 'تنقید کا نیا منظر نامہ' اور وزیر آغا پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی محرکات پر مختصر گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے نئی تنقید کے پیش روتین نقادوں ٹی ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈز اور ولیم ایمپسن کو قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مناظر کی گفتگو لائق مطالعہ ہے۔ تنقید کے اس باب کو مختصر انداز اور دلچسپ طرز تحریر میں پیش کرنے پر انھیں مبارک باد دی جانی چاہیے۔ تھوڑے وقت میں باب تنقید سے روشناس ہونے والوں کے لیے یہ کتاب ایک اچھا اور مفید تحفہ ہے۔

گردش ایام

مصنف: شارق ربانی

صفحات: 79، قیمت: 60 روپے/ ناشر: مصنف، قلعہ، نانپارہ، بہرائچ (یوپی)

فکشن کو ادب کا آئینہ قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تمام اصنافِ ادب میں ناول انسانی زندگی کی مؤثر ترین عکاسی کرتا ہے، اس لیے کہ ناول میں ملک یا قوم کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی پہلوؤں پر ہی روشنی نہیں ڈالی جاتی، بلکہ ضرورت پڑنے پر اقتصادی پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

شارق ربانی بہ حیثیت شاعر و ادیب اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ پیش نظر ناول 'گردش ایام' میں انھوں نے بعض واقعاتی سلسلوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ ناول تیار ہو گیا۔ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے، لیکن واقعاتی شہادتیں ان کے ارد گرد پیش آمدہ واقعات کی چغلی کھاتی ہیں۔ آج کے دور میں اگر اتنی جلد شادیاں طے ہو بھی جائیں، لیکن شادی سے اگلے روز ہی کوئی غیر ممالک کی ملازمت کے لیے نہیں جاتا۔ ہاں ناول کے آخری حصے میں انھوں نے ضرور کئی رنگ بھر دیے ہیں، جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ سماج کی جس برائی کی جانب انھوں نے اشارہ کیا ہے، اس سے بچنے کے لیے بہر حال دوسری شادی کی ضرورت ایک خوبصورت اشارہ ہے۔

شارق ربانی ناول کے اسلوبِ نگارش سے واقف نظر آتے ہیں، لیکن ناول کے اجزائے ترکیبی متاثر کرتے نظر نہیں آتے۔ یقین ہے 'گردشِ ایام' کے بعد ان کی تحریریں ہمارے دل و دماغ کو مزید روشنی عطا کریں گی۔

نثار میں تری گلیوں کے پربھنی

مصنف: ابراہیم اختر

صفحات: 100، قیمت: 68 روپے

ابراہیم اختر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ 'نثار میں تری گلیوں کے...... پربھنی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب' ان کی آٹھویں کتاب ہے۔ انھوں نے اس شہر کو زبان دینے کی کوشش کی ہے۔ روشن خان کی بارہ دری، ارکانی صاحب کا گنبد اور ہیمار پنتھی کا قدیم مندر اس شہر کا تاریخی اثاثہ ہیں۔ اگر روحانی سلسلے سے دیکھا جائے تو سید شاہ تراب الحق کی درگاہ بھی بلاتفریق مذہب سب کو روحانی درس دیتی نظر آتی ہے، لیکن مصنف کے بہ قول یہ شہر مسلسل سیاسی ناانصافیوں کا شکار ہے۔ پربھنی سے متعلق انھوں نے اپنے درد کو بڑے مؤثر انداز میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یقین کیا جانا چاہیے کہ ان کے درد کا ضرور مداوا ہوگا اور قارئین کے سامنے پربھنی کی زندہ تصویر ابھر کر آجائے گی۔

جیتے جاگتے کردار

مترجم: مختار بدری

صفحات: 112، / ناشر: نذیر بک ڈپو، قائد ملت روڈ، ٹرپلیکن، چنئی

جیتے جاگتے کردار تمل زبان کی 260 کہانیوں کا اردو ترجمہ ہے۔ مختار بدری نے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا ہے کہ قاری ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ یہی اچھے مترجم کی پہچان ہے کہ اس کا ہر ترجمہ ایک تخلیق کا احساس کرائے۔ اس مجموعے میں واسنتی کی جیل، کاویری کی سیج کا سایہ، ایس رامن کی بچپن، شیخ چنامدار کی لالٹین، ناکی پرسا کی ممی اور تمل مگن کی یادوں کا سایہ خصوصی طور سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

مختار بدری نے بڑے خوبصورت پیرایۂ اظہار میں کہانیوں کے کرداروں کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کی ان کو داد ملنی چاہیے۔ شروع میں ہر شخص کو پیش آنے والے واقعات سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بالکل درست کہا ہے کہ ہم آج ایسے چند جیتے جاگتے کرداروں سے ملیں جن کی دھڑکنیں ہماری اپنی دھڑکنوں سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی مناسبت سے انھوں نے اس مجموعے کا نام 'جیتے جاگتے کردار' بالکل درست رکھا ہے۔

انشاء اللہ

مصنف: حسن نظامی کیراپی، مرتب: تنویر اختر رومانی

صفحات: 112، قیمت: 100 روپے

ناشر: تنویر کتاب کونا، 95 چونا شاہ کالونی، آزاد نگر، جمشید پور

حسن نظامی کیراپی ایک بزرگ افسانہ نگار ہیں۔ 1961 سے مسلسل قلم و کاغذ سے رشتہ نبھاتے ہوئے کم و بیش سات سو افسانے قلم بند کر چکے ہیں۔ 1996 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'تحفہ' شائع ہوا تھا اور پسند کیا گیا تھا۔ انشاء اللہ ان کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے دونوں بڑی ادبی تحریکوں، ترقی پسند اور جدیدیت کو نزدیک سے دیکھا ہے، لیکن انھوں نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا، بلکہ اپنی نہج پر ہی قائم رہے۔ فکری

اعتبار سے پریم چند سے قربت رکھتے ہیں اور اسلوب کے لحاظ سے منٹو سے۔ ان کے افسانوں میں سماجی نابرابری، بنیادی ضرورتوں کی عدم دستیابی، اسرافِ دولت، مذہبی تشدد اورغربت و افلاس وغیرہ موضوعات کہیں مؤثر لائحۂ عمل اور کہیں اپنی جذباتیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سیدھی سادی عبارت اور دلنشیں طرز نگارش کے سبب ان کے افسانے اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں 24 افسانے اور 9 افسانچے جمع کیے گئے ہیں۔ افسانوں میں روشنی کا ہالہ، دوسری گنگا، راز کی بات اور چاندنی کی چیخ متوجہ کرتے ہیں۔ افسانچوں میں زہریلا حسن، استحکام، شٹ اپ اور ووٹ بینک اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہیں۔

چائنا میرے آگے

مصنف: محمد سمعان خلیفہ ندوی

صفحات: 96، قیمت: 100 روپے

ناشر: معہد امام حسن البنا شہید، پوسٹ بکس نمبر 13، بھٹکل (کرناٹک)

مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'چائنا میرے آگے' ان کا سفرنامۂ چین ہے، جس میں مشاہدات وتاثرات کے تحت مولانا سمعان نے اپنے چین کے سفر کے دوران جو دیکھا، سنا اور محسوس کیا، اس کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے کی ایک عمدہ کوشش کی ہے۔ جب مسافر اجنبی فضاؤں میں سانس لیتا ہے اور انوکھے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرتے ہیں تو قلم و کاغذ سے رشتہ رکھنے والا فردان حالات کو قلم بند کرنے کے لیے بے چین ہو اٹھتا ہے۔ سفر میں بعض چیزیں حیرت میں ڈالتی ہیں، بعض درس عبرت ہوتی ہیں اور انجانی اور سرور آگیں مسرتوں سے ہمکنار کرتی ہیں۔ کچھ اسی طرح کا منظر نامہ 'چائنا میرے آگے' میں جا بہ جا نظر آتا ہے۔ سفرنامے کی ایک اہم خوبی پر مولانا عمیر الصدیق ندوی نے پرلطف پیرایۂ اظہار میں روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں: سفرناموں کے لیے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ یہ اگر ادبی حسن سے عاری ہیں تو پھر یہ محض سفری بیان رہ جاتا ہے۔ ادبی چاشنی واقعی کامیاب سفرنامے کا جزوِ اعظم ہے۔ انھوں نے اس جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ یہ تو دنیا ہے، یہ اتنی حسین اور پرلطف ہے تو پھر میرے رب کی بنائی ہوئی جنت اور سرمدی نعمت کے حسن کا عالم کیا ہوگا۔

چین میں ماضی قریب میں اسلام پر کیا گزری اور اسلام کس سیلابِ بلا سے دوچار رہ کر اپنے وجود کو برقرار رکھ سکا، مولانا سمعان نے اس پر بھی پاکیزہ گفتگو کی ہے۔ کتاب کو چین کی رنگین تصاویر اور وہاں کی مساجد کے دیدہ زیب خد و خال کو اجاگر کرتے ہوئے فوٹوز، دینی اور اسلامی کتابوں کے سرورق کے عکس سے سجایا گیا ہے۔ گویا وہاں کے واقعات کو دیکھیں، اپنی آنکھوں میں نور کی رنگینیاں پیدا کریں اور طرز تحریر کے دوران چین کی نیرنگیوں میں کھو جائیں۔

خدا کے لیے

مصنف: سراج فاروقی

صفحات: 160، قیمت: 175 روپے/ ناشر: نیوز ٹاؤن پبلشرز، ممبئی

'خدا کے لیے' سراج فاروقی کا افسانوی مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ایک سماجی ناسور کو مختلف انداز میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانوں کے کردار گاؤں کی جھونپڑیوں سے لے کر شہروں کی دکانوں اور بڑے شہروں کی فلک بوس عمارتوں کے خوب صورت بیڈروموں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ زندگی کی سچائیاں اگرچہ تلخ سہی، لیکن چار و ناچار انھیں حلق سے اتارنا ہی پڑتا ہے۔ اس مجموعے میں 18 افسانے ہیں، جن میں آہ غریب، اضطراب، مٹی کی جنت اور توکل قدرے بہتر افسانے ہیں۔ بعض افسانوں میں علاقائی زبان کا استعمال اچھا لگتا ہے، لیکن ہر جگہ اس کا کردار سے میل کھانا بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو قاری جس گرانی سے دوچار ہوتا ہے وہ قابل بیان نہیں۔ سراج فاروقی کی یہ تیسری تصنیف ہے۔ افسانے میں جتنی توجہ کرداروں پر دی جاتی ہے، اس سے زیادہ زبان و بیان بھی توجہ چاہتے ہیں۔

شہر کی چوری

مصنف: محمد طارق

صفحات: 128، قیمت: 165 روپے

'شہر کی چوری' محمد طارق کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے کئی افسانوی مجموعے سامنے آچکے ہیں۔ بچوں کی کہانیوں کے دو مجموعے اور ایک طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔ وہ گذشتہ 40 برس سے افسانوی دنیا کے لیے بہت اچھے افسانے پیش کررہے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مشاہدے اور تجربے کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد سے موضوع منتخب کرتے ہیں اور فنی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اخلاقی پہلو بھی ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔ عصری سچ کو افسانہ بناتے وقت محمد طارق کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قاری کو افسانہ بامعنی اور بامقصد لگے۔ ان کے افسانے زبان و بیان کے ان ابہامات سے بھی پاک نظر آتے ہیں، جن پر آج کل کے افسانہ نگار زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ جو بات کہتے ہیں وہ حقیقت سے قریب لگتی ہے۔ محمد طارق کی یہی خصوصیت انھیں ان کے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کا اسلوب ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے اور معیاری لب ولہجہ ایک دل کش تاثیر۔ اس مجموعے میں سولہ افسانے شامل کیے گئے ہیں جن میں شہر کی چوری، میں، اٹوٹ رشتے، چھلانگ، اور انجام بہت عمدہ افسانے ہیں اور اپنے زندہ کرداروں کے ساتھ اپنی چھاپ چھوڑتے ہیں۔ منظور الامین نے بالکل درست رائے قائم کی ہے کہ محمد طارق کے افسانوں میں تخلیقی ادب کی چمک اور مہک محسوس ہوتی ہے۔

رات کا آخری پھر

مصنف: عزیز رحیمی

صفحات: 176، قیمت: 104 روپے

عزیز رحیمی ایسے قلم کار ہیں جو ایک زمانے تک افسانے لکھتے رہے، لیکن انھیں شائع نہیں کرایا۔ اشتیاق سعید کے مطابق خانگی الجھنیں اور کام کی مصروفیت انھیں اپنی تحریریں رسائل و جرائد تک پہنچانے میں مانع رہیں۔ عزیز رحیمی کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ میں تو بس اپنی ذہنی تسکین کے لیے لکھتا ہوں، لیکن اشتیاق سعید کے برابر مہمیز کرنے کے بعد بالآخر انھوں نے اپنی تحریریں قاری تک پہنچانی شروع کیں اور اب ان کا یہ افسانوی مجموعہ 'رات کا آخری پہر' منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کتاب میں سترہ افسانے ہیں، جن میں بلّی اور انسان، دوشیزہ، متاع کوچہ و بازار، رات کا آخری پہر اور سیاہ تاج محل نہ صرف انوکھے افسانے ہیں بلکہ اپنی خصوصیت کے باوصف قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ عزیز رحیمی نے اپنے افسانوں میں نہ صرف سماجی برائیوں کی نشان دہی کی ہے بلکہ ان کے تدارک کے بھی خوب صورت اشارے کیے ہیں۔ ان کے یہاں زبان و بیان کے عام استعمال میں آنے والے جملے بڑا مزہ دیتے ہیں اور دورنگی کیفیت سے دوچار کرتے ہیں۔

مبصر: منور حسن کمال

بیت الراضیہ، G-5/A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

ایک شام شکیل جاذب اور حسیب اعجاز عاشر کے نام

شارجہ، متحدہ عرب امارات: ثقافتی تنظیم 'مسفرہ انٹرنیشنل' کے زیر اہتمام 'ایک شام شکیل جاذب اور حسیب اعجاز عاشر' کے نام تقریب کا اہتمام شارجہ کے مقامی ہوٹل میں کیا گیا۔ شکیل جاذب نوجوان نسل کے معروف شاعر ہیں جب کہ حسیب اعجاز عاشر معروف صحافی اور اردو ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان ممتاز شخصیات کے اعزاز میں تقریب کا انتظام سلمان جاذب اور سید تابش زیدی نے کیا تھا جس کی صدارت امارات کے نامور شاعر ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی نے کی۔ شعراء، کمیونٹی کی اہم شخصیات اور صحافیوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ کینیڈا کے ممتاز صحافی سید مختار حسین نے بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے تقریب میں شرکت کی۔ تقریب کے پہلے دور میں رانا ارشد، شیخ محمد پرویز، ذوالفقار شاہ، طاہر منیر طاہر، سلمان جاذب، سہیل خاور، سید مختار حسن اور شکیل جاذب، خالد گوندل نے حسیب اعجاز عاشر کی صحافتی وادبی خدمات اور شخصیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ دنیا کے معروف اخبارات میں ان کی ادبی سرگرمیاں، رپورٹس شائع ہوتی ہیں۔ حسیب اعجاز عاشر نے 'مسفرہ انٹرنیشنل' کے زیر اہتمام پروقار تقریب کے انعقاد پر سلمان جاذب اور سید تابش زیدی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ سب کا والہانہ جذبات اور محبت دیکھ کر دوستوں کا مداح ہوگیا ہوں۔ اس موقع پر ڈاکٹر یونس وقار نے حسیب اعجاز عاشر کو تعریفی سند پیش کی، سلمان جاذب اور جمیل اسحاق نے شکیل جاذب کو سند پیش کی، سہیل حاور، طاہر منیر طاہر اور تابش زیدی نے سید مختار حسین کو سند پیش کی، دوسرا دور مشاعرہ کا ہوا جس میں امارات کے نامور شعرا ڈاکٹر عاصم صباحت واسطی، تابش میدی، مسرت عباس مسرت، حسیب اعجاز عاشر، قمر بشیر، زاہد علی درویش، فرہاد جبریل، سلمان جاذب، فقیر سائیں اور مہمان شکیل جاذب نے اپنا اپنا کلام سماعتوں کی نذر کیا۔ فرہاد جبریل، فقیر سائیں اور ڈاکٹر صباحت واسطی کو بے حد داد ملی۔ شکیل جاذب نے تقریب کے انعقاد پر سلمان جاذب، سید تابش زیدی اور محمد غوث قادری کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ امارات میں ادبی شخصیات اور شعرا سے مل کر دلی خوشی ہوئی، میرا صحافت کے ساتھ رشتہ طویل ہے، صحافی معاشرہ کا اہم ستون ہے آپ دیارِ غیر میں ادب کی خدمت کر رہے ہیں جو قابل تحسین ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اردو زبان کو آگے ضرور بڑھائیں۔ اردو اپنے بچوں کو ضرور پڑھائیں۔ اردو زبان کی بڑی شان ہے، اردو ادب کے سلسلے کو جاری و ساری رہنا چاہیے۔ صدر محفل ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی نے کہا کہ محفل ہر لحاظ سے یادگار اور منفرد تھی کہ نوجوان شعرا کے سننے کا موقع ملا۔ منتظم تقریب سلمان جاذب نے اپنی تصنیف 'قتلِ گل' شعرا اور مہمان خصوصی کو پیش کی اور شعرا اور مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'فاروقی تنظیم' رانچی، 15 ستمبر 2015

کویت میں آٹھواں عالمی مشاعرہ

کویت: کویت کی فعال ادبی تنظیم انجمن فروغِ اردو ادب کویت نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آٹھویں عالمی مشاعرہ کا انعقاد مقامی پانچ ستارہ ہوٹل سوئس بیل پلازہ میں کیا۔ نہایت پروقار اور شاندار محفلِ مشاعرہ کا انعقاد انجمن کے بانی و صدر عبداللہ عباسی کی کوششوں کی منہ بولتی تصویر تھی جس کے لیے تمام اہل علم و دانش نے عبداللہ عباسی کی تعریف اور حمایت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریب میں جہاں امریکہ سے معروف اور مقبول شاعر فرحت شہزاد نے شرکت کی وہیں ہندوستان سے ڈاکٹر سنیل کمار تنگ اور فیض خمار اور سعودی عرب سے شیراز مہدی شامل ہوئے۔ ساتھ ہی کویت کے تقریباً تمام اہم شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس تقریب کو فرحت شہزاد کی موجودگی کی مناسبت سے شامِ فرحت کا نام دیا گیا تھا۔ مشاعرے کی صدارت فرحت شہزاد نے کی جبکہ سفیرِ پاکستان برائے کویت عزت مآب محمد اسلم خان بحیثیت مہمان خصوصی تھے۔ دیگر معزز مہمانان میں حافظ محمد بشیر، محمد صالح بروڈ اور ہوشدار خان کی موجودگی نے شامِ فرحت کو فرحت و انبساط کے جذبات سے معمور کیا۔ تقریب کا آغاز محمد حافظ شبیر کی قرأت سے ہوا اس کے بعد روبیلا عادل نے ایک حمد پیش کر کے محفل کو پرنور کیا، پھر معروف نعت خواں قمر نے نعت پیش کی۔ بعد میں انجمن کی روایت کے مطابق مہمانان کو اسناد پیش کی گئیں۔ سال 2015 کے لیے خالد سجاد اور محمد کمال اظہر کو بہترین شاعر کا ایوارڈ شیلڈ اور سند سے نوازا گیا۔ اسی تقریب میں الحافظ کمپنی کی جانب سے حسنِ کارکردگی کے لیے عبداللہ عباسی، سائیں نواز اور مہمان شاعر فرحت شہزاد کو یادگار شیلڈ حافظ محمد بشیر کے ہاتھوں پیش کی گئی۔ کویت کے مشہور و معروف شاعر افروز عالم کی تازہ تصنیف 'کویت میں ادبی پیش رفت' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اکتوبر 2015

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

اردو زبان اور اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت سنجیدہ: مختار عباس نقوی
قومی اردو کونسل میں نومنتخب وائس چانسلرز کے ساتھ فروغ اردو کے موضوع پر مذاکرہ

نئی دہلی: ملک کے بڑے تعلیمی اداروں کے ساتھ اشتراک کرکے قومی اردو کونسل اردو کے دائرے کو مزید وسیع کرسکتی ہے۔ اردو کی ترقی اور فروغ، اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے حکومتِ ہند سنجیدہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار عزت مآب وزیر مملکت برائے اقلیتی و پارلیمانی امور جناب مختار عباس نقوی نے قومی کونسل کی جانب سے مختلف یونیورسٹیز کے نومنتخب وائس چانسلرز کے ساتھ مذاکرے کی تقریب میں کیا۔ یہ تقریب قومی اردو کونسل کے کانفرنس ہال میں منعقد کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ پارلیمنٹ میں اردو مترجمین کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اس تعلق سے کونسل اگر کچھ کرنا چاہتی ہے تو حکومت اس سلسلے میں تعاون دے سکتی ہے۔ وزیر مملکت نے تعلیم، ترقی اور تحفظ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے یہ بنیادی مسائل ہیں۔ حکومت ان مسائل کے تئیں نہایت حساس ہے اور اقلیتوں کی تعلیم و ترقی اور تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کررہی ہے۔

قومی اردو کونسل کے زیراہتمام منعقدہ اس مذاکرے میں پروفیسر اشوک آئما (وائس چانسلر، سینٹرل یونیورسٹی آف جموں)، پروفیسر معراج الدین (وائس چانسلر، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر)، ڈاکٹر اسلم پرویز (وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، پروفیسر طلعت احمد (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے شرکت کی۔ اس مذاکرے میں قومی اردو کونسل کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے تمام معزز مہمانان اور مؤقر شخصیات کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے چاروں وائس چانسلرز کا تعلق اردو زبان وادب سے ہے۔ اس لحاظ سے یہ تقریب خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے قومی کونسل اور ان جامعات کے مابین اشتراک پر زور دیا اور کہا کہ ایک مشترکہ لائحۂ عمل تیار کیا جائے تو ان جامعات کے ذریعے اردو کی رسائی عام لوگوں تک ہوسکتی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کے ویژن کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے قومی اردو کونسل کو ایک وقار اور اعتبار عطا کیا ہے۔ اس مذاکرے کے ماڈریٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ تھے جنھوں نے فروغ اردو کے لیے ملک کے بڑے تعلیمی

کونسل کے ڈائرکٹر وزیر مملکت کا استقبال کرتے ہوئے اوپر کی تصویر میں ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، جناب مختار عباس نقوی، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر معراج الدین، پروفیسر اشوک آئما اور پروفیسر طلعت احمد

اداروں کے مابین اشتراک پر زور دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی اور کونسل کے مابین اشتراک کے حوالے سے کہا کہ یہ دونوں ادارے اردو کے فروغ کے لیے آگے بڑھیں تو اس کے مثبت اثرات پورے ملک میں محسوس کیے جائیں گے۔ پروفیسر آئما نے سینٹرل یونیورسٹی آف جموں میں غیر اردو داں طبقے تک اردو پہنچانے کے لیے نئے کورسز کے آغاز کا اشارہ دیا۔ پروفیسر معراج الدین نے بھی اردو کے فروغ کے لیے ایک مربوط اور مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنے کی بات کہی اور یہ بھی واضح کیا کہ اردو کسی خاص مذہب کی زبان نہیں ، بلکہ ہمارے ملک ہندوستان کی زبان ہے۔ تمام طبقات کو اردو زبان کے احیا اور فروغ کے لیے عملی اقدامات کرنے پڑیں گے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز (وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) نے اردو کے فروغ کے نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ عصری جامعات میں مدارس کے طلبا کے لیے ایک ایسا عصری نصاب تیار کیا جانا ضروری ہے جس کے ذریعے انھیں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو۔

تقریب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر کیپٹن شرفِ عالم، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر خالد محمود، جناب سہیل احمد فاروقی، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہپر رسول، جناب اسد رضا، جناب فاروق ارگلی، جناب فاروق انجینئر، جناب فیروز بخت احمد، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر مشتاق احمد قادری، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر قمر تبریز کے علاوہ کونسل کے ممبران پروفیسر اقبال، حاجی محمد اقبال خان، محترمہ شمع خان، جناب حسن باقر کاظمی اور پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 نومبر 2015

قومی اردو کونسل میں 'نگہداشت بیداری ہفتہ' سے متعلق تقریب کا انعقاد

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں نگہداشت بیداری ہفتہ کا اہتمام کیا گیا۔ واضح ہو کہ مرکزی حکومت نے اپنے تمام تر دفاتر میں نگہداشت بیداری ہفتہ (26 تا 31 اکتوبر) منانے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اسی سلسلے کی ایک تقریب تھی۔ اس موقع پر کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے کونسل کے تمام ارکان کو اپنے کام کے تئیں ایمانداری، شفافیت اور وقت کے پابند عہد ہونے کا حلف دلایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم سب کو ملک کے وزیر اعظم جناب نریندر مودی کے اس خواب کی تکمیل کرنا ہے جو انھوں نے ملک کی سالمیت، یکجہتی اور ترقی کے لیے دیکھا ہے۔

کونسل کے صدر دفتر میں نگہداشت بیداری ہفتہ کے موقعے پر حلف لیتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر اور دیگر اسٹاف

آیئے ہم سب مل کر ترقی اور کامرانی کے لیے اپنے فرائض کو بغیر کسی خوف اور جانبداری کے ایمانداری سے پورا کرنے کا عہد کریں۔ اس موقع پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ہم روایتی طور پر حلف نہ اٹھائیں بلکہ اپنے کام میں پوری ایمانداری اور نیک نیتی کا ثبوت پیش کریں۔ دراصل ہماری یہی کوشش ملک کی عظمت کو بڑھاتی ہے۔

حلف لینے کے تقریب میں کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (انتظامیہ) جناب کمل سنگھ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ کے علاوہ کونسل کے تمام اسٹاف موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 اکتوبر 2015

یوم اتحاد کے موقعے پر قومی کونسل کے صدر دفتر میں کونسل کے اسٹاف ملک کی یکجہتی اور سالمیت قائم رکھنے کا عہد لیتے ہوئے

فارسی کے بغیر اردو زبان و ادب کی تفہیم اور تدریس مشکل ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں فارسی زبان و ادب پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں فارسی زبان و ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ اس میٹنگ کی صدارت فارسی کے مشہور و معروف ناقد و محقق پروفیسر چندر شیکھر نے کی۔ سب سے پہلے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے تمام مہمانوں کا استقبال مختصر تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ میٹنگ ایک ایسی زبان سے وابستہ ہے جو ہندوستان کی آٹھ سو سالہ تہذیب و ثقافت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس زبان کے بغیر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کا مطالعہ ادھورا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو اور فارسی کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے کہا کہ فارسی کے بغیر اردو زبان و ادب کی تفہیم اور تدریس مشکل ہے۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ فارسی ہماری بہت سیکولر زبان ہے، کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک یہ زبان کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فارسی محض درباری زبان نہیں بلکہ علم و عمل دونوں کی زبان ہے۔ فارسی زبان و ادب کے فروغ میں کونسل کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ اس موقع پر کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے تمام ممبران سے گزارش کی کہ جو بھی مسودے، مخطوطے و دیگر پروجیکٹ ہیں اسے مقررہ وقت پر مشترکہ کوشش سے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں، تبھی کونسل اپنے ہدف کو پا سکے گی۔ اس موقع پر معزز ممبران نے ایسے بہت سے نکات پر گفتگو کی جن کے ذریعے فارسی زبان و ادب کا فروغ ممکن ہو۔ اکثر اراکین نے اس میٹنگ کے تین سال کے بعد ہونے پر تشویش کا اظہار کیا۔ ڈائرکٹر نے ان کی شکایت کو بجا قرار دیتے ہوئے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ اب یہ میٹنگ مستقل ہوا کرے گی۔

قومی کونسل کے صدر دفتر میں فارسی زبان و ادب پینل کی میٹنگ کا منظر

میٹنگ میں پروفیسر ایس اچ قاسمی، پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر اختر مہدی، پروفیسر قمر غفار، پروفیسر حسن عباس، پروفیسر وجیہ الدین، ڈاکٹر علیم اشرف خان کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اور دیگر اسٹاف نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 اکتوبر 2015

لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا، میٹنگ کی صدارت معروف ماہر لسانیات اور ممتاز محقق و ناقد پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سبھی مہمانان اور پینل ممبران کا استقبال کیا اور میٹنگ کی غرض و غایت بیان کی۔ انھوں نے اردو اور لسانیات کے گہرے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں لسانیات اور خاص طور پر سماجی لسانیات کے دائرے کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر انھوں نے اردو زبان کو ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں گجراتی، مراٹھی، پنجابی، تلگو، تمل اور ملیالم سے مربوط کرنے کے لیے اردو میں سہ لسانی لغت (اردو+ علاقائی زبان+ انگریزی) کی ترتیب و تشکیل کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے اشاعتی محاذ پر لسانیات کے میدان میں قومی اردو کونسل کی قابل قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ لسانیاتی کتابوں کا معیار اور بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ لسانیاتی پینل کے ممبران نے فرہنگ نویسی کے اصول و ضوابط طے کرنے پر زور دیا تاکہ آئندہ لغات کی ترتیب و تشکیل ان رہنما خطوط کی روشنی میں کی جا سکے۔ نئے الفاظ و اصطلاحات کی شمولیت پر بھی میٹنگ میں غور و خوض کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ اس کے لیے جلد ہی ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا جائے گا۔

اس میٹنگ میں پروفیسر اودے نارائن سنگھ، پروفیسر علی رفاد فتیحی، پروفیسر اومکار این کول، پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر ایس امتیاز حسنین، جناب ملک العزیز، ڈاکٹر عبدالرشید اور کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اور دیگر اسٹاف نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 اکتوبر 2015

اردو صحافت کے 200 سال پر سرینگر میں سیمینار

سرینگر: ہندوستان میں اردو صحافت کے دو سو سال مکمل ہونے پر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی طرف سے کشمیر یونیورسٹی کے گاندھی بھون میں دو روزہ سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح 17 اکتوبر کی صبح 11 بجے ہوا۔ افتتاحی تقریب میں این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مہمانوں کا استقبال کیا جبکہ پروفیسر قدوس جاوید نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ہندوستان میں اردو ادب اور اردو صحافت کے رول پر اظہار خیال کیا۔ تقریب سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے وائس چانسلر پروفیسر معراج الدین میر، کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خورشید اندرابی، معروف ادیب و قلم کار اور ادبی شخصیات غلام نبی خیال، فاروق نازکی اور پروفیسر محمد زماں آزردہ کے علاوہ صحافت سے وابستہ شخصیات اور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ شخصیات بھی موجود تھیں۔

این سی پی یو ایل کی طرف سے منعقدہ اس دو روزہ سیمینار کو 4 نشستوں میں تقسیم کیا گیا جس میں سے دو نشستیں سنیچر کو جبکہ دو نشستیں اتوار 18 اکتوبر کو منعقد کی گئیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں مرحلہ وار اس سیمینار کو منعقد کرنے کا مقصد ملک میں اردو زبان کے فروغ سے متعلق کی گئی پیش رفت اور اردو صحافت کے کلیدی رول کو سراہنے اور آنے والے وقت میں اس کو مزید فعال بنانے کی کوششوں کو جائزہ لینا ہے۔

استقبالیہ کلمات میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ صحافت ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر انسان کا تعلق رہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے قبل اس عنوان پر کلکتہ میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا اور اب اسی نوعیت کا سرینگر میں یہ دو روزہ سیمینار ہورہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا کلیدی رول رہا ہے جس کے لیے یہاں کے صحافی قابل مبارک باد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر کی صحافتی تاریخ سے متعلق جب بھی مورخین قلم اٹھائیں گے تو انھیں گذشتہ دو دہائیوں کے سفر کے لیے ایک الگ باب مرتب کرنا ہوگا۔ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خورشید اندرابی نے کہا کہ اردو ہمارے کلچر کا حصہ ہے جتنی وفا کشمیری نے اس کے ساتھ کی اتنا ملک میں کسی نے بھی نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ کشمیری پنڈت بھی اس زبان کا استعمال کرتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زبان کا کسی بھی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے عوام کی مادری زبان اردو نہیں پھر بھی اردو اس ریاست کے کونے کونے میں بولی جاتی ہے۔ سی این ایس کے مطابق سیمینار کے دوران معروف قلم کار غلام نبی خیال نے تجویز دی کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو چاہیے کہ وہ سنسکرت اور فارسی کی تاریخی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں کرانے کے ضمن میں اقدامات اٹھائیں۔ سی این ایس کے مطابق سیمینار کی دوسری نشست میں اردو صحافت پر مقالات پیش کیے گئے۔

سیمینار کے دوسرے دن قومی کونسل کے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم کے علاوہ کئی ادبی اور صحافتی شخصیات نے اردو صحافت کے دوسو سالہ سفر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کشمیر کے معروف صحافی شجاعت بخاری نے اپنے مقالے میں جموں و کشمیر کی اردو صحافت کی تاریخ اور اردو صحافت کو درپیش مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی اخبارات میں چھپنے والی خبروں کا سرکاری سطح پر جائزہ لیا جاتا ہے لیکن اردو اخبارات کے معاملے میں ایسا نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ جموں و کشمیر میں اردو کو سرکاری حیثیت حاصل ہونے کے باوجود اس کا مستقبل مخدوش نظر آرہا ہے جس کے لیے حکومت کی عدم توجہی ذمہ دار ہے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے اردو زبان کے فروغ کے لیے این سی پی یو ایل کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ جس طرح اس ادارے کی جانب سے ریاست بھر میں کمپیوٹر کورسز کرائے جاتے ہیں، اسی طرح اردو صحافت کے کورسز شروع کیے جانے چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ جموں و کشمیر میں اردو صحافت نے ہمیشہ تعمیری کام کیا ہے۔

روزنامہ 'روشنی'/ سری نگر ٹائمز، جموں کشمیر، 18,19 اکتوبر 2015

اردو صحافت کے 200 سال پر کشمیر میں منعقدہ سیمینار کے مناظر

اردو زبان کے فروغ کے لیے مربوط خاکہ تیار کیا جائے گا

بھوپال میں دوروزہ کل ہند اردو اکادمی کانفرنس کا انعقاد

بھوپال: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے دوروزہ کل ہند اردو اکادمی کانفرنس میں شرکت کے دوران یو این آئی سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی زیر قیادت قومی جمہوری اتحاد (این ڈی اے) حکومت نے این سی پی یو ایل کا بجٹ بڑھایا ہے۔ اس سے قبل مسٹر اٹل بہاری واجپئی کی زیر قیادت این ڈی اے کی سابقہ حکومت نے بھی کونسل کے بجٹ میں اضافہ کیا تھا۔ موجودہ وزیر محترمہ اسمرتی ایرانی اردو کے فروغ کے حق میں ہیں اور وہ این سی پی یو ایل کے کئی نئے پروجیکٹوں کے لیے اگزیکٹو بورڈ کی پہلے ہی منظوری دے چکی ہیں۔

یہ پوچھنے پر کہ کیا کونسل کو خاطر خواہ بجٹ مل رہا ہے، انھوں نے کہا کہ فنڈ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ مرکزی وزیر نے کونسل کو یقین دہانی کرائی ہے کہ کسی بھی کام کو شروع کرنے میں اسے رقم کی کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ زبان کے فروغ کے لیے کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں پروفیسر کریم نے کہا کہ این سی پی یو ایل ملک کے دارالحکومت میں 'اردو آن وھیلس' منصوبہ شروع کررہی ہے، جس میں اردو زبان سکھانے کے لیے کئی موبائل یونٹ مختلف علاقوں میں بھیجی جائیں گی اور ہر یونٹ میں ایک قابل ٹیچر بھی ہوگا۔ یہ یونٹ ایک علاقے کو منتخب کرے گی اور لوگوں کو پڑھانا شروع کرے گی، چاہے اس میں کتنے ہی طلبا کیوں نہ ہوں۔ ہر یونٹ ساؤنڈ سسٹم اور تعلیم سے متعلق دیگر رسائل سے لیس ہوگی۔ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر نے بتایا کہ کونسل کا ٹیلی ویژن پروگرام 'اردو دنیا' جلد ہی پھر شروع کیا جائے گا۔ دیگر چینلوں سے بھی اس کے لیے ٹائی اپ کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کے دوسو سال مکمل ہونے پر ملک کے مختلف حصوں میں سلسلہ وار کانفرنسیں منعقد کی جارہی ہیں۔ کولکاتہ اور جموں و کشمیر میں اس ضمن میں دو سیمینار ہوچکے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان پروگراموں کا مقصد ہندوستان کی آزادی میں اردو زبان کے رول سے عوام کو واقف کرانا ہے۔ اردو کے نعرہ 'انقلاب زندہ باد' نے آزادی کی لڑائی میں نوجوانوں کے اندر جوش بھر دیا تھا۔ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ کونسل نے گرانٹ دینے کی پالیسی میں ترمیم کی ہے اور اسے علاقہ وار طریقے پر دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ گرانٹ رقم کی مختلف مدوں میں 50 فیصد تک اضافہ کیا گیا ہے۔

قبل ازیں کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر کریم نے کہا کہ کانفرنس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو زبان کی جو حالت ہے اس کے لیے کافی حد تک اردو بولنے والے لوگ ہی ذمہ دار ہیں۔ اس کے برعکس یہ دیکھا گیا ہے کہ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے وہ لوگ اردو کی طرف راغب ہورہے ہیں اور ان میں سیکھنے کی چاہت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو سکھانے کے لیے کئی مرکز قائم کیے گئے ہیں، لیکن ان سے استفادہ کرنے کے لیے کم تعداد میں لوگ آرہے ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ تر وہ ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ پروفیسر کریم نے کہا کہ اجلاس میں بہت سے امور پر باہمی اتفاق رائے ہوا ہے اور جلد ہی دہلی میں بھی اسی طرح کی کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ تمام اکادمیوں کو مدعو کیا جائے گا اور سب کے صلاح مشورے سے اردو زبان کے فروغ کے لیے بلیو پرنٹ تیار کیا جائے گا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بتایا کہ این سی پی یو ایل اردو کی صورت حال پر ملک بھر میں ایک سروے کرانے پر غور کررہی ہے۔ اس کے لیے کونسل اردو اکادمیوں کو رقم فراہم کرائے گی۔

اس پروگرام میں اردو اکادمیوں کے نمائندوں نے اپنی ریاستوں میں اردو زبان کے فروغ کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی تفصیلات بتائیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ انھیں کس طرح کے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر عتیق اللہ نے اردو اکادمیوں سے سستے داموں پر کتابیں دستیاب کرانے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اردو کسی ایک مذہب کی زبان نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو بولنے والوں کو چاہیے وہ گھر میں اپنے بچوں کو اردو سکھائیں۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' علی گڑھ، 11 نومبر 2015

لیگل اسٹڈیز پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں پروفیسر طاہر محمود کی صدارت میں قانون سے متعلق

قومی کونسل کے صدر دفتر میں لیگل اسٹڈیز کی میٹنگ کا منظر

پینل کی ایک اہم میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سبھی ممبران کا استقبال کیا اور کونسل کے اس پینل کا تعارف پیش کیا۔ اس پینل کے تحت کونسل اردو زبان میں قانون اور آئین سے متعلق کتابوں کی اشاعت کرتی ہے تا کہ اردو داں حلقہ قانونی نکات اور باریکیوں سے واقف ہو سکے۔ میٹنگ میں بین الاقوامی قوانین، وقف قوانین، مرکزی قوانین، خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم، تجارتی و مالیاتی اصطلاحات جیسے اہم موضوعات پر کتابوں کی اشاعت سے متعلق فیصلے کیے گئے۔

عام لوگوں میں قانون سے متعلق بیداری پیدا کرنے کے لیے لیگل اسٹڈیز پر مبنی ایک ریفریشر کورس کی ضرورت و اہمیت پر بھی تبادلۂ خیال کیا گیا اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں سے رابطہ کیا جائے گا تا کہ اس سلسلے میں مزید پیش رفت ہو سکے۔ میٹنگ کے دوران پروفیسر طاہر محمود نے کونسل کے ڈائرکٹر کو اپنی خود نوشت سوانح بھی پیش کی جس میں قومی اردو کونسل پر بھی ایک باب شامل ہے۔ ڈائرکٹر نے اس کتاب کی اہمیت کے مدنظر اس کے اردو ترجمے پر زور دیا۔ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب شمس اقبال نے میٹنگ کے آخیر میں سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ میں پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم، ڈاکٹر ظفر محفوظ نعمانی، ڈاکٹر افضل قادری، ایڈوکیٹ سید اقبال احمد، ایڈوکیٹ احتشام عابدی، ایڈوکیٹ شرجیل محمود ہاشمی کے علاوہ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر محمد فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محترمہ ذیشان فاطمہ اور محمد طاہر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 اکتوبر 2015

شریف الحسن نقوی کے انتقال پر تعزیتی نشست

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کے بنی سکریٹری اور سابق وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی ایک سچے محبِّ وطن اور محبِّ اردو تھے۔ انھوں نے دہلی اردو اکادمی کی بنیاد کو نہایت مضبوط کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے آج جسولہ واقع قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے دفتر اردو بھون کی میٹنگ روم میں تعزیتی نشست کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ سید شریف الحسن نقوی کے ذریعے لگائے گئے پودے کی نہ صرف آبپاشی کی جانی چاہیے بلکہ ان کی عاجزی اور انکساری سے ہمیں نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ شریف الحسن نقوی نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں بنیادی کام کیے۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تمام اراکین بھی موجود تھے۔ تمام اراکین نے سید شریف الحسن نقوی کو تعزیت پیش کرتے ہوئے ان کی انتظامی صلاحیت کو یاد کیا۔ واضح رہے کہ سید شریف الحسن نقوی کا تین روز قبل انتقال ہو گیا۔ انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 4 نومبر 2015

ماجد رمن کا انتقال اردو صحافت کا ناقابلِ تلافی نقصان: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دھلی: اردو کے معروف صحافی ماجد رمن کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ماجد رمن کے انتقال سے اردو صحافت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ اردو صحافت کے میدان میں ان کی جو خدمات ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

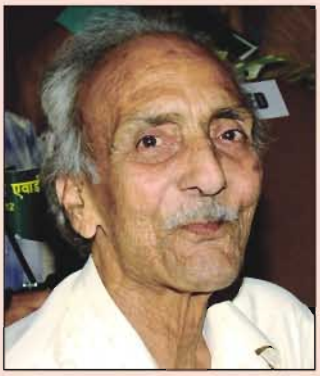

وہ ایک محنتی، مخلص اور اصول پسند صحافی تھے جنھوں نے زندگی کی آخری سانس تک کاغذ اور قلم سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مزید کہا کہ ماجد رمن ایک منجھے ہوئے سیاسی تجزیہ نگار تھے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا سے طویل وابستگی کے دوران انھوں نے اس اخبار کے معیار و وقار کو بلند کیا۔ ان کی صحافتی جدوجہد کو بھلایا نہیں جا سکتا لیکن ان کی صحافتی خدمات کا کما حقہ اعتراف نہیں کیا گیا۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس موقعے پر اردو صحافیوں کی حالت زار پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا صحافی پوری زندگی خون تھوک تھوک کر سماج کے درد کو پوری دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے مگر جب وہی صحافی اپنی زندگی کے آخری ایام میں اذیتوں سے گزرتا ہے تو سماج بے حسی کا ثبوت دیتا ہے۔ اس لیے تمام اردو اداروں، اکادمیوں اور تنظیموں کی ذمے داری بنتی ہے کہ ضعیف العمر اور علیل صحافیوں کے لیے مشترکہ طور پر ایک فنڈ مختص کریں جس سے ایسے صحافیوں کے لیے ہر ماہ معقول وظائف کا انتظام ہو سکے۔ یہ صحافت کی ایک بڑی خدمت ہوگی!

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 نومبر 2015

سہ روزہ بین الاقوامی اردو لٹریچر فیسٹول

اودے پور: انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام اس کی اودے پور شاخ کے زیر انتظام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقد ہونے والے اردو کے پہلے سہ روزہ بین الاقوامی لٹریچر فیسٹول کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے موہن لال سوکھاڈیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اندرور دھن ترویدی نے اعلان کیا کہ وہ اس کامیاب انعقاد سے اس درجہ خوش و مطمئن ہوئے ہیں کہ آئندہ برس سے اس لٹریچر فیسٹول کا انعقاد انجمن ترقی اردو (ہند) اور یونیورسٹی مل کر کیا کریں گے اور یہ یونیورسٹی کا مستقل سالانہ فیسٹول ہوگا۔ انھوں نے اس بات کی بھی یقین دہانی کرائی کہ وہ فوراً ہی اس بات کا جائزہ لیں گے کہ یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ کالجوں میں اردو کی تدریس کے لیے مزید کیا اقدام کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ اس سلسلے میں اگر اساتذہ کے مزید تقرر کی ضرورت ہوگی تو وہ بلا تکلف کیا جائے گا اور موسم گرما کی تعطیلات انجمن ترقی اردو (ہند) اودے پور شاخ کے اشتراک سے وہ اردو پڑھنے کے خواہاں طالب علموں کے لیے Summer School کے طرز پر تدریس کا انتظام کریں گے۔ اودے پور بین الاقوامی اردو فیسٹول کا افتتاح موہن لال سوکھاڈیہ یونی ورسٹی کے آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ انجمن (جو اپنی مزاج کے اعتبار سے ایک تحریک ہے)، کے احیا کی کوششوں میں نئی مگر فعال شاخوں کا قیام اردو کے ہندوستان گیر پیمانے پر وسعت کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے انجمن کے نئے لائحہ عمل کے مطابق اردو تحریک کا مقصد صرف زبان کا فروغ نہ ہو بلکہ اسکول کے نظام میں اردو کی شمولیت کو اوّلیت دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے ہمہ جہت فروغ میں اردو تہذیب جواب نئے معنی کی حامل ہے اہم رول ادا کرے گی۔ اس افتتاحی تقریب کے دوسرے اہم شرکا قومی کونسل کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنی تقریر میں نئے ذرائع ابلاغ خصوصاً انفارمیشن ٹکنالوجی کے ذریعے آرہے انقلاب سے ہم قدم ہونے کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب اردو جو بین الاقوامی زبانوں میں چوتھے نمبر پر آچکی ہے اس کے لیے بہت پیچھے مڑکر دیکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس موقعے پر سابق مرکزی وزیر اور مشہور شاعرہ محترمہ گرجا ویاس اور ہندی کے مشہور ادیب وبھوتی نارائن رائے نے اس امر پر زور دیا کہ اردو کے اہل قلم کو سماج میں آرہی ان چنوتیوں کے مقابلے کے لیے دوسری زبانوں کے ادیبوں کے ساتھ ہم قدم ہوجانا چاہیے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اس موقعے پر کہا کہ ہماری زندگی سے کتابوں کا غائب ہوجانا ہمیں تہذیبی طور پر کم مایہ کردے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ تہذیبی عناصر انسانی زندگی میں سب سے زیادہ طاقت ور رول ادا کرتے ہیں اور مذاہب بھی تہذیب ہی کا سہارا لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ اردو کے بزرگ ترین ادیب رتن سنگھ نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جن معاشروں میں ادب کے لیے جگہ نہیں ہوتی انھیں نیست و نابود ہوجانا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب ہندوستان میں اردو کے تخلیق کاروں میں نہ تو کوئی صف اوّل کا ادیب ہے اور نہ مستقبل میں اس کا کوئی امکان ہے کہ اردو میں لکھنے والے نئی نسل میں کوئی دوسرے درجے کا تخلیق کار بھی پیدا ہوگا۔ ان کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں نئے لکھنے والوں کا مطالعہ بہت قلیل ہے اور ان کی تمام تر توجہ شہرت کے حصول پر ہے جو رتن سنگھ صاحب کے مطابق ادب کے گہرے مطالعے کے بغیر کسی ادیب کا مقدر نہیں بن سکتی۔ اس موقعے پر 'تہذیب الاخلاق' کے مدیر اور شعبۂ اردو علی گڑھ میں پروفیسر صغیر افراہیم نے اعلان کیا کہ اس بین الاقوامی اردو لٹریچر فیسٹول کی کامیابی سے اتنے متاثر ہیں کہ وہ 'تہذیب الاخلاق' کا آئندہ شمارہ 'اودے پور انٹرنیشنل لٹریچر فیسٹول' نمبر کی شکل میں شائع کریں گے۔ اس بین الاقوامی لٹریچر فیسٹول میں دنیا کے مختلف ملکوں اور ہندوستان کے مقتدر اہل قلم حضرات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی 27 اکتوبر 2015

جنگ آزادی میں اردو اخبارات کا کردار

لکھنؤ: ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو زبان اور صحافت کا کردار ہندوستان کی قومی تاریخ کا ایک ولولہ انگیز باب ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا کہ آزادی کی جنگ جس زبان میں لڑی گئی، وہ مقبول عام زبان اردو اور اس کی صحافت ہے۔ اِس زبان کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے آزادی کی جدوجہد میں کلیدی حصہ لیا، کئی صحافی و شاعر پھانسی پر چڑھائے گئے، ان کی جائیدادیں ضبط ہوئیں اور مکانوں پر قبضے کیے گئے، اخبارات کے لیے ضمانتیں طلب کی گئیں، ان کے علاوہ مادرِ ہند کے جیالے ہندو، مسلمان اور سکھوں نے باہمی اتحاد اور فکر و عمل کی یکجہتی کے ساتھ جو جدوجہد کی۔ اس میں ان کا سب سے بڑا سہارا اردو زبان اور اس کی صحافت تھی۔ ان خیالات کا اظہار اکھل بھارتیہ مانو سیوا سنستھان کے زیر انتظام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اردو اکادمی اترپردیش کے مالی تعاون سے منعقدہ 'جنگ آزادی میں اردو اخبارات کا کردار' موضوع پر سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کی تاریخ سازی اور حصول آزادی میں صحافیوں نے ایک عہد ساز کردار ادا کیا ہے۔ اردو اخبارات کے صحافیوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی حب الوطنی کا روشن ترین مظہر ان کی وہ جدوجہد ہے، جو انھوں نے اپنے وطن عزیز کو غیرملکی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے کی ہے۔ اس کا ثبوت ایک نامور صحافی اور مدیر مولوی محمد باقر کی شہادت سے ملتا ہے۔

سیمینار کی صدارت جناب محمد اعظم خاں صاحب نے کی۔ سیمینار میں خصوصی طور پر جناب قطب اللہ صاحب، چیف ایڈیٹر عوامی سالار، ارشاد ثقافی، مولانا شبیر احمد رضوی، محمد ابواشرف ذیشان، قاری محمد طیب، ضیا اشرفی، عمران صفوی اور طفیل احمد نے شرکت کی۔ سیمینار کی نظامت جناب نورین علی حق نے کی۔ سیمینار کا اختتام سنستھان کے جنرل سکریٹری محمد نیر اعظم کے شکریہ پر ہوا۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' دہلی، 29 اکتوبر 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

ہند-ترکی تعلقات: مقاصد اور اس کے عصری فوائد

نئی دھلی: شعبۂ ترکی زبان وادب، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس بعنوان 'ہند-ترکی تعلقات: مقاصد اور اس کے عصری فوائد' کا

ایف ٹی کے (سی آئی ٹی) کانفرنس ہال میں انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس کی افتتاحی تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر ترکی کے سفیر براق اکشاپر نے شرکت کی۔ کانفرنس کے ڈائرکٹر اور شعبۂ ترکی زبان و ادب کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر محسن علی نے کانفرنس کے مقاصد بیان کیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ معروف مورخ پروفیسر عرفان حبیب نے کلیدی خطبہ پیش کیا اور پروفیسر اسدالدین (ڈین، فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز) نے اظہار تشکر پیش کیا۔ پروفیسر عرفان حبیب نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ ہندوستان اور ترکی کے قدیم تعلقات ہیں، چھٹی صدی عیسوی سے اس کے تاریخی شواہد ملتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ترکی سے ہندوستان کے تعلق براہِ راست نہیں تھے، بلکہ عرب کے توسط سے ترک تعلقات استوار ہوئے۔ کانفرنس کے پہلے سیشن میں پروفیسر ایس ایم عزیز الدین (دہلی)، پروفیسر جے این خاکی (کشمیر)، ڈاکٹر نشاط منظر (دہلی)، ڈاکٹر ایم وسیم راجا (علی گڑھ)، پروفیسر للیانہ سیمونوا (بلگاریہ) اور ڈاکٹر شاداب بانو، جبکہ دوسرے سیشن میں پروفیسر رضوان قیصر (دہلی)، ڈاکٹر اسلی نیاز وگلو (ترکی)، ڈاکٹر خورشید عالم (دہلی)، ڈاکٹر گلفشاں خان (علی گڑھ)، ڈاکٹر فرحت نسرین (دہلی)، ڈاکٹر جاوید اختر (علی گڑھ) اور سمیر احمد صوفی (علی گڑھ) نے اپنے علمی اور تحقیقی مقالات پیش کیے۔

سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے دوسرے دن متعدد اسکالرز نے شرکت کی اور اپنے مقالے پڑھے۔ دوسرے دن کی پہلی نشست کی صدارت پروفیسر رضوان قیصر صدر شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ پروفیسر علیم اشرف نے اپنے خطاب میں ہندو **اسکلپچر** اور اسلامی **اسکلپچر** کے درمیان مماثلت قائم کرتے ہوئے کہا کہ دونوں مذاہب کی روح ایک دوسرے سے بہت حد تک متاثر ہے۔ ڈاکٹر خالد جاوید نے اورہان پاموک کے ناول 'وائٹ کیسل' کے اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس ناول میں پاموک نے نیم داستانی اسلوب اختیار کیا ہے یہ اسلوب دراصل جدید اور مابعد جدید دونوں کے یہاں فکشن کے کامیاب نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔

سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے آخری دن چار سیشن ہوئے جن میں 'فارسی اور ترکی ممالک کے درمیان تعلیمی رشتے'، 'ہند-ترکی کے درمیان اقتصادی تعلقات' اور 'ہند-ترکی ممالک کے درمیان صوفی ازم اور مشترکہ تہذیب' کے عنوانات سے تین سیشن ہوئے۔ اختتامی اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر طلعت احمد اور مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر ارتضی کریم نے شرکت کی جبکہ پروفیسر اسدالدین نے صدارت کی۔ شعبۂ تاریخ کے صدر پروفیسر رضوان قیصر نے اختتامی تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ ہند-ترکی کے مابین علمی، لسانی، تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی رشتے بہت پرانے ہیں۔ پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ ترکی صرف زبان نہیں بلکہ ہند-ترکی کے درمیان تہذیبی رشتے کی علامت ہے۔ پروفیسر ارتضی کریم نے اپنی تقریر میں اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ جامعہ نے ایک اہم موضوع پر سیمینار کرایا۔ انھوں نے کونسل کی جانب سے ایسے پروگرام میں تعاون کرنے کی بات بھی کی۔ امریکہ سے تشریف لائے پروفیسر ایلیلین گاڈلاز نے اپنا تاثر دیتے ہوئے کہا کہ میں نے بہت سی کانفرنس میں شرکت کی ہے مگر جامعہ کے طلبہ نے جس قدر محبت اور مہمان نوازی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال مشکل ہے۔ اختتامی اجلاس کے صدر پروفیسر اسدالدین نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے مہمان کا شکریہ ادا کیا اور کانفرنس کی کامیابی پر مبارک باد پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر، اودھ نامہ علی گڑھ، 3 نومبر، انقلاب دہلی، 4 نومبر 2015

دہلی پولیس کا ہائی کورٹ میں حلف نامہ

نئی دھلی: دہلی پولیس نے پولیس اسٹیشنوں میں روز کی ڈیوٹی میں فارسی اور اردو کے پرانے اور مشکل الفاظ کے بجائے اردو یا انگلش کے آسان الفاظ کے استعمال کی ہدایت دینے کے لیے دائر درخواست کی دہلی ہائی کورٹ میں مخالفت کی ہے۔ چیف جسٹس جی روہنی اور جسٹس جینت ناتھ کی بینچ کے سامنے دہلی پولیس نے دلیل دی کہ پولیس کی زبان کو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ پرانی ضرور ہے لیکن یہ مشکل اور سمجھ میں نہیں آنے والی نہیں کہا جاسکتا۔ دہلی پولیس نے تھانوں میں بیان درج کرنے اور عدالتوں میں نوٹس دائر کرنے جیسی کارروائی میں فارسی اور اردو الفاظ کے خلاف دائر درخواست مسترد کرنے کی درخواست کرتے ہوئے عدالت میں ایک حلف نامہ داخل کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ان الفاظ کو ہٹانے سے سب کے لیے بہت زیادہ پریشانی پیدا ہوجائے گی۔ دہلی پولیس نے وکیل امت ساہنی کی پٹیشن کے جواب میں یہ حلف نامہ داخل کیا ہے۔ اس درخواست میں کہا گیا ہے کہ یہاں پولیس ٹریننگ کالج میں پولیس اہل کاروں کو اردو اور فارسی الفاظ کے استعمال کی تربیت دی جاتی ہے۔ درخواست کے مطابق پولیس کے افسروں کے لیے مشکل نہیں ہے کیونکہ انھیں ہی نہیں بلکہ ملزمین اوران کے وکلا کو بھی پولیس کارروائی سمجھنے کے لیے اردو اور فارسی الفاظ کو

اگنو کیمپس میں فنکشنل عربی سیکھنے والے طلبہ کے ورکشاپ کا منظر

سیکھنا پڑتا ہے۔ غور طلب ہے کہ دہلی پولیس ایکٹ میں متعدد ایسے دفعات ہیں جن میں دہلی پولیس کو اردو اور فارسی الفاظ کا استعمال کرنا پڑتا ہے اور یہ الفاظ برسوں سے مستعمل ہوتے آرہے ہیں جس کی تمام دہلی پولیس عادی ہوچکی ہے۔ جوانوں کو بھرتی کے دوران تربیت میں ان الفاظ کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے۔ اب ان الفاظ کی جگہ نئے الفاظ کے استعمال سے خود دہلی پولیس کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے دہلی پولیس نے ان الفاظ کو برقرار رکھنے کی وکالت کرتے ہوئے حلف نامہ دائر کیا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 27 اکتوبر 2015

اگنو عربی زبان میں گریجویشن سطح پر بھی کورس شروع کرے گی

نئی دہلی: عربی زبان سیکھنے کے خواہش مند طلبا اور پروفیشنل افراد کے لیے اگنو بڑے کورس بھی شروع کرنے کا منصوبہ بنارہی ہے۔ اگنو کیمپس میں فنکشنل عربی سیکھنے والے طلبہ کی ورکشاپ کے افتتاح کے موقعے پر اگنو کی پرو وائس چانسلر شما یادو نے کہا کہ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی عربی زبان میں سرٹیفکیٹ اور دوسرے ڈپلوما کورسوں کے علاوہ گریجویشن سطح پر بھی کورس شروع کرے گی اور ان کورسوں میں طلبہ کا رجحان بنا رہا تو پی ایچ ڈی اور دیگر کورس بھی شروع کیے جائیں گے۔ اس موقعے پر بیرونی زبانوں کے شعبہ کی صدر پروفیسر انجو سہگل گپتا نے کہا کہ ورکشاپ کے ذریعے طلبہ کو بہت ساری ایسی چیزیں سکھائی جائیں گی جس سے ان کو زبان سیکھنے میں آسانی ہوگی، جبکہ ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر محمد سلیم نے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں یہ جو افراد عربی زبان سیکھ رہے ہیں ان کو زبان آئے اور ان کے پروفیشن اور میدان میں کام آئے۔ ورکشاپ کے دوران طلبہ کو کھیل اور گیم کے ذریعے شعری زبان سیکھنے کے طریقے بتائے گئے نیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر حبیب اللہ خان اور پروفیسر نسیم احمد نے ماہرین کے طور پر عربی سے طلبہ کو روبرو کرایا۔ غور طلب ہے کہ اگنو کے ذریعہ فی الوقت عربی زبان میں بول چال پر مبنی فنکشنل عربک کورس کرایا جارہا ہے۔ ورکشاپ کے اہم شرکا میں ڈاکٹر عبیدالرحمٰن جے این یو اور نوین راج بھاٹیا سینٹر انچارج کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2015

ملک میں کوئی اردو کا دشمن نہیں، اردو داں طبقہ خود اپنی ذمے داریوں سے کنارہ کش: پروفیسر ارتضیٰ کریم

سری نگر: ''ملک میں کسی بھی سیاسی جماعت یا سیاسی شخصیت کو اردو زبان سے عداوت نہیں ہے۔ اس تصور اور تاثر کو توڑنے کی ضرورت ہے کہ اردو مسلمان کی زبان

ہے۔ مسلمانوں کی زبان عربی ہوسکتی ہے اردو نہیں۔ اس میں سرکار کا کوئی دوش نہیں ہے کہ اردو زبان کے پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں مسلسل کمی آرہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں خود اپنی زبان میں دلچسپی نہیں ہے اور سرد مہری کا شکار ہیں۔ جبکہ بدقسمتی کا عالم تو یہ ہے کہ خود اردو پڑھانے والے اساتذہ اردو میں لکھی گئی کتابیں نہیں خریدتے۔'' ان باتوں کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے یو این آئی اردو سروس کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ''اگر ہم واقعی اردو زبان کا تحفظ وفروغ چاہتے ہیں تو ہمیں نہ صرف اپنے کنبے کے ہر ایک فرد کو اردو سکھانی ہوگی بلکہ یہ تہیہ کرنا ہوگا کہ ہم کسی غیر اردو داں کو اردو سکھائیں گے۔'' ملک میں حکومتی سطح پر اردو کے ساتھ تعصب کو مسترد کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بتایا کہ اس میں سرکار کا کوئی 'دوش' نہیں ہے کہ اردو زبان کے پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں مسلسل کمی آرہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ''مرکز میں برسراقتدار بی جے پی میں کسی بھی وزیر یا سیاسی شخصیت کو اردو زبان سے عداوت نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''یہ بات میں وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ملک میں موجودہ حکومت یا کانگریس پارٹی میں کوئی اردو کا دشمن نہیں ہے۔'' بلکہ ہمیں صرف یہ کہا جارہا ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے جتنا کام ہوسکے کرو انھوں نے بتایا کہ اردو کے فروغ کے لیے حکومت بہت کام کررہی ہے لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ خود اردو داں طبقہ اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی اختیار کرچکا ہے اور ان میں جذبے کا فقدان ہے۔ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر نے بتایا کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو زبان نئی نسل تک منتقل ہو اور اس زبان کے پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو، تو اردو داں طبقہ کا متحرک ہونا لازمی اور ضروری ہے، اور انھیں یہ کام اپنے گھروں سے شروع کرنا ہوگا، حکومت پر دوش ڈالنا ہمارے لیے بہت آسان ہے لیکن خود اپنے گھروں میں اردو کا ایک اخبار تک نہیں منگواتے۔ اردو پڑھانے والے اساتذہ پر تنقید کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بتایا کہ خود اردو پڑھانے والے اساتذہ اردو میں لکھی گئی کتابیں نہیں خریدتے۔ آج پبلشرز کی یہ پریشانی ہے کہ چھپوانے کے بعد کتابوں کا کیا کروں، موجودہ صورت حال تو یہ ہے کہ جس یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم ہے وہاں 'شعبۂ اردو' اردو میں نہیں لکھا ہے اور جو پروفیسرز وہاں پڑھاتے ہیں ان کے وزیٹنگ کارڈس انگریزی زبان میں ہوتے ہیں انھیں شاید احساس خوف ہے کہ جب آگ زنی ہوگی تب سب سے پہلے اردو میں لکھے گئے بورڈ کو آگ لگائی جائے گی، انھیں اس احساس خوف سے باہر نکلنا ہوگا، مارکیٹ جانتی ہے کہ اردو زبان کی کیا اہمیت ہے۔ مگر ہم نہیں۔ سرکاری دفاتر سے اردو زبان کے غائب ہوجانے سے متعلق پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے

بتایا کہ ہمیں بحیثیت اردو داں خود اپنی آواز متحد ہوکر حکومت تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اس کو لے کر واقعی فکرمند ہیں کہ سرکاری دفاتر سے اردو غائب ہورہی ہے تو دستخطی مہم چلا کر اور دوسرے طریقوں سے اردو داں طبقہ اپنے مطالبات کو سرکار تک پہنچا سکتا ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم خودسر دمہری کے شکار ہیں۔ اردوصحافت کے مستقبل سے متعلق پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر نے بتایا کہ مستقبل تو بہت اچھا ہے لیکن ہمیں اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی ہوگی اور پہلے کے صحافیوں کی طرح موجودہ دور کے اردوصحافیوں کو مشن اور مقصد سمجھ کر اپنا کام کرنا ہوگا۔ کشمیر یونیورسٹی کے گاندھی بھون میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے 'اردوصحافت کے دو سو سال' کے عنوان سے منعقد کے گئے دوروزہ سیمینار کے موقعے پر دیے گئے اس انٹرویو میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مزید بتایا کہ اردوصحافت کے دوسو سال پر سب سے پہلے کلکتہ میں دوروزہ سیمینار منعقد کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ''چونکہ اردوصحافت کا آغاز کلکتہ سے ہوا ہے، اس لیے ہم نے پہلا سیمینار وہیں منعقد کیا اور سیمینار بہت ہی کامیاب ثابت ہوا، عالم تو یہ تھا کہ ہال میں سامعین کھڑے تھے۔'' انھوں نے بتایا کہ اردوصحافت کے دوسو سال مکمل ہونے پر سیمیناروں کا سلسلہ جاری رہے گا اور آئندہ ایسے ہی پروگرام حیدرآباد، ممبئی، کانپور، لکھنؤ اور دیگر بڑے بڑے شہروں میں منعقد کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 اکتوبر 2015

اردو زبان وادب کے ارتقا میں مدارس اسلامیہ کا حصہ

بارا/غازی پور: اردو اس ملک کی قدیم زبان ہے۔ یہ زبان نہ صرف زبان ہے بلکہ ایک تہذیب، ایک ثقافت ہے جس کی بقا ملک کی سالمیت اور قوم کی افادیت کے لیے بہت ہی اہم اور نہایت ضروری ہے۔ اردو زبان آج خطرات ومشکلات سے دوچار ہے۔ ان خطرات کا جائزہ لینے اور اردو کو ان سے باہر نکالنے کی ضرورت ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے غازی پور میں منعقد ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ غازی پور شہر واقع مدرسہ دینیہ غازیپور میں 'عالمی رابطہ ادب اسلامی ہند' شاخ غازی پور کے زیراہتمام 'اردو زبان وادب کے ارتقا میں مدارس اسلامیہ کا حصہ' عنوان سے ہفتہ کے روز ایک علاقائی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں مقرر خاص کی حیثیت سے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے شرکت کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کی ترقی میں مدارس کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس ملک سے مدارس ختم کردیے جائیں تو اردو زبان کا خاتمہ ہوجائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو ترقی دینے میں مسلم شعرا وادبا کے شانہ بہ شانہ ہمیں ہندو شعرا بھی نظر آتے ہیں۔ اس موقعے پر مختلف کتابوں اور کتابچوں کا اجرا بھی صدر جلسہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس سے قبل مدرسہ دینیہ غازی پور کے مہتمم مولانا عزیز الحسن صدیقی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا جس میں انھوں نے غازی پور کا مختصر مگر جامع تعارف کراتے ہوئے کہا کہ غازی پور کی تاریخ علم وادب کی تاریخ ہے، یہ شہر مدتوں علم وادب کا گہوارہ رہا ہے، بڑے بڑے علما ومشائخ اس کی خاک سے اٹھے ہیں، اس کی بنیاد کسی دنیا دار حکمراں نے نہیں بلکہ ایک خدارسیدہ بزرگ ملک السادات سید مسعود غازی نے رکھی تھی۔ مدرسہ کے ناظم مولانا سید بلال حسنی ندوی نے سیمینار کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ اردو زبان وادب کی نشوونما اور فروغ میں بنیادی حصہ مدارس اسلامیہ اور بزرگان دین کا ہے جنھوں نے اس کے ذریعے دین کی بھی خدمت کی اور زبان وادب کی بھی آبیاری کی۔ افتتاحی جلسے کی صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے کی جبکہ نظامت مولانا خالد ندوی غازی پوری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2015

شبلی اکادمی کے زیراہتمام 'دارالمصنفین، اس کے معمار، رفقا اور خدمات' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

دارالمصنّفین، اس کے معمار، رفقا اور خدمات

اعظم گڑھ: دارالمصنّفین کے رفقا نے جو کارنامے انجام دیے اس کی بنیاد پر وہ عالمی سطح پر نمایاں ہے اور اپنے کارنامے ہی کی بنیاد پر دارالمصنّفین ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم عرب میں متعارف ہے۔ ان خیالات کا اظہار عالمی شہرت یافتہ عالم دین اور انٹگرل یونیورسٹی کے چانسلر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے شبلی اکادمی میں 'دارالمصنّفین اس کے معمار، رفقا اور خدمات' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کے اختتامی اجلاس میں صدارتی خطبے کے دوران کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ علم وہ طاقت ہے جو حاکمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ علم کے ذریعے ہی تہذیبی تمدنی ترقی ہوتی ہے۔ ناظم دارالمصنّفین شبلی اکادمی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کہا کہ صدی تقریبات کے تحت ابھی دس کتابوں کی اشاعت باقی ہے اور آئندہ سال ماہنامہ معارف کے سو سال مکمل ہونے پر عالمی پیمانے پر شایان شان معارف صدی تقریب منانے کی کوشش کریں گے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شباب الدین، ڈاکٹر صفدر امام قادری، پروفیسر قمرالہدیٰ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت مولانا عارف عمری نے انجام دی۔ اس سے قبل مختلف عنوانات پر مقالے پیش کیے گئے۔ اختتامی اجلاس کے علاوہ چار اجلاس منعقد ہوئے جس میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی اور مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے صدارتی فرائض انجام دیے اور ڈاکٹر عمیر منظر، شاہ نواز فیاض، ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، ڈاکٹر محمد اکرم السلام اعظمی نے نظامت کی۔ پروفیسر محسن عثمانی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر توقیر عالم فلاحی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر احمد محفوظ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا عمیر الصدیق، ڈاکٹر صفدر امام قادری، ڈاکٹر علاء الدین، مولانا اشہد رفیق ندوی، جناب شاہ نواز فیاض، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، ڈاکٹر شباب الدین نے مختلف موضوعات پر اپنے مقالے پڑھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 نومبر 2015

دھلی:

ڈاکٹر خالد الناجی کا توسیعی لیکچر

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی سنٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز کے ذریعے عراقی پروفیسر ڈاکٹر خالد الناجی کا ایک توسیعی لیکچر تطبیقی نقد کے عنوان پر اسکول آف لینگویجز کے کمیٹی روم میں منعقد ہوا۔ اس توسیعی لیکچر کا افتتاح کرتے ہوئے سنٹر کے چیئرپرسن پروفیسر مجیب الرحمٰن نے مہمان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ پروفیسر خالد عراق کے نامور اسکالروں میں سے ایک ہیں اور اس وقت سامرا یونیورسٹی میں ادب اور نقد

کے حوالے سے اپنی تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ادب اور نقد پر عربی شاعر ذوالرمۃ کی حیات وخدمات، سرد جنگ کے بعد عالمی معاشی اور عسکری مداخلت پر آپ کی تصنیفات موجود ہیں۔ ڈاکٹر خالد نے اپنے لیکچر کی ابتدا میں ہندوستانیوں کے ذریعے ملنے والی محبت کے لیے سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یہاں کے لوگوں سے بے انتہا پیار ملا۔ ادب اور نقد کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ ادب اور نقد کا بہت گہرا تعلق ہے اور نقد کوئی ضمنی کام نہیں بلکہ بذات خود ایک تخلیق ہوتا ہے جس زبان میں نقد جتنا اعلیٰ وارفع ہوتا ہے اتنا ہی اس زبان کا ادب بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔ نقد تطبیقی کے حوالے سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر خالد نے عراق کے مشہور شاعر عبدالوہاب البیاتی کا ایک قصیدہ سوق القریۃ کی روشنی میں طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس پس منظر میں انھوں نے کہا کہ بعض دفعہ ناقد کی نگاہ وہاں تک پہنچ جاتی ہے جہاں تک شاعر بھی نہیں پہنچ پاتا۔ انھوں نے کہا کہ نقد کوئی سہل کام نہیں ہے لیکن اس کا ادراک کرنے کے بعد ادب کو پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکچر کے بعد پروفیسر خالد الناجی نے طلبہ اور اساتذہ کے سوالوں کا تشفی بخش جواب بھی دیا۔ اس موقعے پر شعبہ عربی کے اساتذہ میں پروفیسر بشیر جمالی، ڈاکٹر رضوان الرحمٰن، ڈاکٹر قطب الدین، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب اور ڈاکٹر اکرم نواز کے علاوہ کثیر تعداد میں ریسرچ اسکالرس اور طلبہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اکتوبر 2015

ادبی تنقید کے عنوان پر سیمینار

نئی دھلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں 'ادبی تنقید' کے عنوان سے منعقدہ سیمینار میں خطاب کرتے ہوئے شعبۂ ہندی کے استاد پروفیسر اپوروانند نے کہا کہ لفظوں کا صحیح استعمال مہذب سماج کی علامت ہے۔ ان کا نامناسب استعمال سماج میں بہت ساری برائیوں کو جنم دیتا ہے۔ اردو اور ہندی کے رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موجودہ عام بول چال ہندی اردو سے وجود میں آئی۔ ہندی یا اردو کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے کے بجائے ایک دوسرے سے استفادہ کی کوشش کرنی چاہیے۔ ادب اور سماج کے رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہم معیاری ادب کے لیے سماج سے ہی سرٹیفکیٹ مانگیں۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے، لیکن ادب سماج سے آگے بھی ہوسکتا ہے، جس طریقے سے بیسویں صدی کے بہت سارے اردو ادیب اپنے سماج میں آگے تھے۔ انھوں نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ بنے بنائے راستوں پر چلنے کے بجائے اپنی الگ راہ نکالیں۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے اس قسم کے پروگرام کی ضرورت پر زور دیا۔ آخر میں شعبہ کے سینئر استاد ڈاکٹر علی جاوید نے طلبہ کو مہمان خصوصی کی باتوں پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے انجام دی۔ پروگرام میں متھن کمار، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر سرفراز، ڈاکٹر دانش حسین خان، ڈاکٹر عزیر احمد، محمد شمس الدین، محمد اختر، شاداب شمیم کے علاوہ ریسرچ اسکالرس اور طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دلی، 5 نومبر 2015

اترپردیش:

اردو کے ساتھ حق تلفی کیوں

الہ آباد: وائس آف ڈیموکریسی کی جانب سے کڈس ونڈر لینڈ اسکول ضمیر نگر میں 'اردو کے ساتھ حق تلفی کیوں' کے موضوع پر ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر

آفاق حسین نے کی اور نظامت کے فرائض معروف تجزیہ نگار طارق رغیب نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود پروفیسر مجاور حسین نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ باتیں کم کریں اور کام زیادہ کریں، اردو میں تقریر کریں، اردو میں تحریر کریں اور اردو کو اپنی حیات کا مقصد بنائیں انشاء اللہ اردو کے ساتھ حق تلفی نہیں ہوگی۔ لیاقت علی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ نے کہا کہ امریکہ و دیگر ملکوں میں اردو کے تمام انسٹی ٹیوٹ کھولے جارہے ہیں لیکن ہندوستان اسے مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اردو کے ساتھ حق تلفی کیے جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا چکبست، پریم چند اور دیاشنکر نسیم ہندی بولتے تھے، یا وہ مسلمان تھے؟ لیکن انھوں نے اردو کو اپنایا، اردو سے محبت کی کیونکہ وہ ہندوستان ہی کی زبان ہے نہ کہ مسلمان کی۔ اردو کی حق تلفی کے موضوع پر سید فرمان علی نوی سینئر ایڈوکیٹ ہائی کورٹ نے کہا کہ اردو کی حق تلفی کے ہم ہی ذمے دار ہیں سرکاریں تو اپنا کام کررہی ہیں۔ طارق رغیب نے دوران نظامت کہا کہ اردو اسی ملک کے کئی صوبے میں پھل پھول رہی ہے حیدرآباد کے سارے دفاتر میں اردو ہی میں کام ہورہے ہیں۔ اردو عالمی زبان ہے اور ہندوستان میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر اشفاق حسین نے کہا کہ اردو ایک عظیم زبان ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اس طرح سے یہ سب کی زبان ہے۔ اس کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ انجینئر نسیم صدیقی اور نصراللہ وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 اکتوبر 2015

عصر حاضر میں اقبال کی معنویت

لکھنؤ: ''ہماری ذمے داری یہیں ختم نہیں ہوجاتی کہ ہم اردو کے تعلیمی اداروں اور ادبی محفلوں تک محدود ہوکر رہ جائیں، اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے ہمیں ان اداروں کو ایک پلیٹ فارم کی طرح استعمال کرنا چاہیے اور اردو زبان و ادب کو عام کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔'' ان خیالات کا اظہار جرمنی میں مقیم معروف قلم کار سید عارف نقوی نے شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی میں 'عصر حاضر میں اقبال کی معنویت' عنوان پر مذاکرے کے دوران کیا۔ سید عارف نقوی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ آج جرمنی میں اقبال اتنا ہی پڑھے اور سمجھے جاتے ہیں جتنا کہ گوئٹے، نیتشے اور دوسرے جرمن فلسفی اور ادیب۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے شعبۂ اردو کی جانب سے ایم اے اور بی اے کے سبھی طلبا وطالبات کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ وہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو کے لیے بھی خوش گوار ماحول پیدا کرنے میں پیش پیش رہیں گے۔ علامہ اقبال کی عصری معنویت پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ فی زمانہ عوامی سطح پر جس طرح کا انتشار برپا ہے ایسے میں اقبال کے افکار اور نظریات سارے جہان کے لیے حوصلہ افزا پیغام دیتے ہیں۔ مہمان ذی وقار کے طور پر صوبے کے وزیر ماحولیات نے شرکت کرتے ہوئے کہا کہ صوبائی حکومت بلا تعصب اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ انھوں نے دنیا کی سبھی زبانوں میں علامہ اقبال کو سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ ملک میں اخوت اور امن قائم کرنے کے لیے اقبال کی ترانۂ ہندی جیسی تخلیق ساری دنیا کے لیے مثال ہے بطور مہمان خصوصی شعبۂ عربی اور اسلامیات کے استاد ڈاکٹر قمر اقبال نے اس موقعے پر جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کے افکار میں خیالات

جامعاتی اردو تحقیق: نئے زاویے، نئے امکانات کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

وکائنات کے بنیادی موضوعات موجود ہیں، ان کی فکر مشرقی اقدار اور اسلامی روایات کا حسین امتزاج ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 اکتوبر 2015

پروفیسر محمد حسن کی ادبی خدمات

امروهه: آزاد ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی امروہہ کے زیر اہتمام اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے مالی تعاون سے 'پروفیسر محمد حسن کی ادبی خدمات' کے عنوان سے ایک سیمینار بمقام جین مندر دھرم شالہ، امروہہ میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت سید محمد ہاشم نے فرمائی اور بطورِ مہمانِ خصوصی چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ اردو کے جدید اہم نقادوں میں پروفیسر محمد حسن کا نام آتا ہے جو اپنی تنقید کے لیے مشہور ہیں ان کے مخصوص اندازِ تنقید کی بنا پر انھیں سید احتشام حسین کا جانشین کہا جاتا ہے۔ ترنم پروین نے کہا کہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محمد حسن صاحب ہمارے شہر مرادآباد سے تعلق رکھتے تھے وہ ایک ادیب، نقاد، شاعر اور ادب کی خدمت کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برکاتی نے کہا کہ پروفیسر محمد حسن ایک ایسے ادیب تھے جنھوں نے پوری ایک نسل کے ذہنوں پر اپنی چھاپ چھوڑ دی جس کے دیرپا اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ شیخ نوگانوی نے کہا کہ محمد حسن نے مرادآباد کے ایک معزز زمیندار گھرانے میں 1926 میں آنکھیں کھولیں اور اردو ادب کی خدمت کرتے کرتے 2010 میں اس دارِفانی سے رخصت ہوئے۔ چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز نے بھی محمد حسن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شخصیت وفن پر گفتگو کی۔ محمد ہاشم نے کہا کہ محمد حسن نے اپنی زندگی اردو ادب کے لیے وقف کردی۔ وہ ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب نثر نگار بھی تھے۔ مرادآباد سے تشریف لائیں غزالہ تبسم نے کہا کہ انھوں نے اگرچہ بہت سے ڈرامے تصنیف کیے تاہم غالب پر تحریر کردہ ان کے ڈرامے نے دنیائے ادب میں دھوم مچا دی۔ سیمینار میں بھون امروہوی نے گنگا جمنی تہذیب کی مثال پیش کرتے ہوئے کلام پیش کیا اور خوب داد وتحسین حاصل کی۔ آخر میں تنظیم کی صدر ترنم زاہد نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 اکتوبر 2015

لتا چودھری کو اردو میں 73 فیصد نمبر

لکھنؤ: اردو سے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والی ایک طالبہ

ترپتی لتا چودھری ہے جنھوں نے گورنمنٹ انٹر کالج، ملیح آباد سے انٹرمیڈیٹ 2015 کے امتحان میں 73 فیصد نمبر حاصل کیے ہیں۔ اردو اکادمی اردو مضمون کے ساتھ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والے ان طلبا و طالبات کو خصوصی اعزاز دیتی ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ ترپتی لتا چودھری نے بتایا کہ ان کے والد دھرم گنج پرساد جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کو اردو سے بڑی محبت تھی۔ بچوں میں اردو کا شوق والد ہی کی دین ہے۔ ان کی ایک بیٹی کیرتی لتا چودھری نے ہائی اسکول اور انٹر اردو مضمون کے ساتھ پاس کیا ہے۔ بڑی بیٹی پریتی لتا چودھری لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے اردو فائنل کی طالبہ ہے۔ اب اس نے بی اے میں داخلہ لیا ہے۔ اس نے ایوارڈ ملنے پر اردو اکادمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف خود اردو پڑھتی ہے بلکہ گھر پر بچوں کو اردو پڑھاتی بھی ہے۔ غیر مسلم بچوں کو بھی اردو کی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ اردو آسان اور خوبصورت زبان ہے اسے بلا تفریق مذہب وملت نئی نسل کو پڑھنا چاہیے۔ جیسی سہولتیں دیگر ہندوستانی زبانوں کو حاصل ہیں ویسی ہی سہولتوں کی حقدار اردو بھی ہے۔ اس موقعے پر چیئرمین اکادمی ڈاکٹر نواز دیوبندی نے طالبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ یہ طالبہ نئی نسل کی نمائندہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فراق، چکبست، ملاّ اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی روایات کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری اٹھانے میں پیش پیش رہے گی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 22 اکتوبر 2015

جامعاتی اردو تحقیق: نئے زاویے، نئے امکانات

گورکھپور: طلبہ کے لیے تحقیق کو ناگزیر بتاتے ہوئے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر محمد شاہد حسین نے کہا کہ ''تحقیق ادب کی بنیاد ہوتی ہے اور اس کے ذریعے یہ طے کیا جاتا ہے کہ کون سا ادب معیاری اور کون سا نہیں ہے اس لیے تحقیق پر زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیے۔'' وہ شعبہ اردو، ڈی ڈی یو یونیورسٹی کے زیر اہتمام جامعاتی اردو تحقیق: نئے زاویے، نئے امکانات کے موضوع پر منعقدہ یک روزہ سیمینار میں صدارتی کلمات پیش کر رہے تھے۔ اس موقعے پر صدر شعبہ ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن کے علاوہ آکاش وانی گورکھپور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اروند ترپاٹھی، وی کے ایس یونیورسٹی، آرہ کے ڈاکٹر حسین احمد، شہر قاضی مولانا ولی اللہ، ڈاکٹر محمد طاہر، ڈاکٹر طارق سعید اور ڈاکٹر شکیل احمد بطور خاص موجود تھے۔ ڈاکٹر اروند ترپاٹھی نے موضوع کو انتہائی اہمیت کا حامل اور وقت کی ضرورت بتاتے ہوئے کہا کہ کسی بھی تحقیق میں طلبہ کو اپنا موقف زیادہ سے زیادہ پیش کرنا چاہیے، جبکہ ریفرنس (حوالہ) کو بقدر ضرورت ہی شامل کیا جانا چاہیے۔ مولانا ولی اللہ نے کہا کہ تحقیق کے معاملے میں اساتذہ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ طلبہ میں منزل کی طرف تیزی سے آگے بڑھنے کی تڑپ پیدا کریں۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں اپنی تہذیب اور خصوصی روایات دونوں ہیں، جن سے ہمارے طلبہ مستفید ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن نے کہا کہ شعبہ اردو نے تعلیم کے ساتھ ثقافتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ کیا ہے اور کوشش یہی ہے کہ اس شعبہ سے فارغ ہونے والے طلبہ

خود کے ساتھ ساتھ اپنے ادارے کا نام روشن کریں۔
افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے کی۔
سیمینار میں ڈاکٹر ممنون عالم ڈاکٹر اشہد کریم (فیض آباد)، ڈاکٹر محمد رفیق احمد (مئو)، ڈاکٹر ناصر حسین خان (وارانسی)، ڈاکٹر درخشاں تاجور، ڈاکٹر اختر رضا، ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر عظیم فاروقی، ڈاکٹر محمد فرید، سید احمد (دہلی)، ریاض الدین، شردآنند، سیدہ خاتون، ہیم لتا، نغمہ تبسم، معین عارف، شریف نواز نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر شعبہ کے طلبہ کثیر تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 5 نومبر 2015

سیتاپور میں ساحر لدھیانوی کی یاد میں مشاعرہ

سیتاپور: اردو کے ممتاز اور مقبول شاعر ساحر لدھیانوی کے پرستاروں نے ان کی یاد تازہ رکھتے ہوئے نئی نسلوں کو ان کی خصوصیات اور خدمات سے واقف کرانے کے لیے جو 'ساحر فینس کلب' بنایا ہے اسی کے زیراہتمام ایک خصوصی پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس میں ساحر کی شاعری اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔ ساتھ ہی شاعروں نے اپنا کلام پیش کر کے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ گوپال ساگر جو کہ کلب کے بانی ہیں انھوں نے ہی اپنی کنوینرشپ میں یہ اہتمام کیا۔ ممتاز شاعر احمد وصی کو ممبئی سے مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے ساحر سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے ساحر کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو نمایاں کیا۔ احمد وصی نے کہا کہ ''ساحر کی مشہور نظم 'پرچھائیاں' آج کے عہد میں سب سے زیادہ پر اثر اور پرکشش نظم ہے۔'' مشاعرے میں اودھیش شکل، عکس لکھنوی، یامین انصاری، مجاز سلطانپوری، محمود رحمانی کے علاوہ دوسرے مقامی و بیرونی شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جبکہ احمد وصی نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ 14 اکتوبر 2015

مشہور غزل گلوکار غلام علی کو اعزاز

لکھنؤ: اترپردیش کے وزیر اعلیٰ جناب اکھلیش یادو نے کہا ہے کہ فن ادب اور ثقافت دنیائے انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔ فن اور فنکار کو کسی میدان یا مذہب سے جوڑا نہیں جاسکتا۔ ملک کی سرحدیں فنکار کو باندھ نہیں سکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہنر پر سیاست نہیں ہونی چاہیے۔ وزیر اعلیٰ نے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر مشہور غزل گلوکار مسٹر غلام علی کو خوش آمدید کہا اور شال اوڑھا کر اعزاز سے نوازا۔ انھوں نے اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ مسٹر غلام ریاستی عوام کی دعوت پر یہاں پروگرام پیش کرنے آئے ہیں۔ اس موقعے پر وزیر تعمیرات عامہ جناب شیو پال سنگھ یادو، وزیر سیاسی پنشن جناب راجندر چودھری، پرنسپل سکریٹری اطلاعات مسٹر نونیت سہگل بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' دہلی، 11 اکتوبر 2015

بہار:

انجمن فروغ ملت کے زیر اہتمام مقابلہ جاتی پروگرام کا انعقاد

جھاجھا: صوبہ بہار کے ضلع جموئی کے علاقوں میں ادبی، سماجی، تعلیمی اور دینی سرگرمی کے فروغ دینے کی غرض سے حال ہی میں تشکیل کی گئی کمیٹی انجمن فروغ ملت جھاجھا (جموئی) کے زیر اہتمام مدرسہ احمدیہ مدینۃ القرآن ستی گھاٹ کے احاطے میں ایک مقابلہ جاتی جلسہ مولانا افتخار احمد صدیقی کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ نظامت کے فرائض قاضی نعمان اختر قاسمی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ بعد ازاں مقابلہ جاتی تقریر، نعت خوانی، سوال و جواب کے سیشن کا آغاز ہوا۔ جس میں مختلف اسکولوں اور مدرسوں کے طلبا و طالبات نے حصہ لیا۔ خاص طور سے مدرسہ عین العلوم جھاجھا اور الفلاح کوچنگ سنٹر ستی گھاٹ کے طالب علموں نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے تقریری مقابلے میں اوّل محمد سیف اللہ دوم پروین نسا اور سوم درجہ محمد احسان نے حاصل کیا۔ مقابلہ نعت خوانی میں نسا پروین، محمد کفیل اور محمد آصف کو انعامات کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ مقابلہ سوال و جواب میں پہلے نمبر پر رشیدہ نسا، دوسرے پر شاداب اور تیسرے پر محمد الطاف اختشام رہے۔ اس مقابلہ جاتی دور کے اختتام پر صدارتی خطاب میں مولانا افتخار احمد صدیقی نے کہا کہ اسلامی سال نو ماہ محرم کے موقعے پر اس طرح کے مقابلہ جاتی پروگرام کا انعقاد وقت کی اہم ضرورت ہے اس سے بچوں میں دینی بیداری پیدا ہوتی ہے۔ آخر میں شمس الدین شمس نے تمام افراد کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: شمس الدین شمس، جھاجھا، جموئی، 15 اکتوبر 2015

گلستانِ اردو پٹیالہ کی جانب سے منعقدہ ادبی نشست کا منظر

پنجاب:

گلستانِ اردو پٹیالہ

پٹیالہ: 21 ستمبر 2015 کو بھاشا وبھاگ پنجاب، پٹیالہ کے اُردو طلباء کی ادبی انجمن 'گلستانِ اُردو پٹیالہ' کی جانب سے ایک ادبی نشست اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت سردار چیتن سنگھ، ڈائریکٹر بھاشا وبھاگ پنجاب نے کی۔ مہمانِ اعزازی کے طور پر جناب مسعود احمد عالپوری، پاکستان سے تشریف لائے تھے۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر پروفیسر محمد رفیع، سابقہ سکریٹری پنجاب اُردو اکیڈمی نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے ڈی ایل او پٹیالہ نے سبھی مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اِس کے بعد عابد علی خاں نے 'ریاست پٹیالہ اور اُردو زبان' کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ اس موقعے پر مہمانِ اعزازی جناب مسعود احمد عالپوری نے اپنے خاندان کے مورثِ اعلیٰ اور پنجابی زبان کے نامور شاعر حافظ غلام رسول کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے پنجابی زبان کی خصوصیت بیان کی۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر محمد رفیع نے اپنی شاعری اور روشن بیانی سے اُردو سامعین کا دِل جیت لیا۔ اُنھوں نے اُردو زبان کی شیرینی اور لطافت پر روشنی ڈالی۔ سردار چیتن سنگھ ڈائریکٹر بھاشا وبھاگ پنجاب نے صدارتی خطبہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مہمانِ اعزازی جناب مسعود احمد عالپوری کی شخصیت سے سامعین کو واقف کروایا۔ پروگرام کے اختتام پر بھاشا وبھاگ پنجاب سے چھ ماہ کا اُردو سرٹیفکیٹ کورس پاس کرنے والے طلبا کو سرٹیفکیٹ اور ٹرافیاں دی گئیں۔ اِس موقع پر ماسٹر پچھمن سنگھ راٹھور عالپوری کی پنجابی کتاب 'قصہ پورن بھگت' (شاہ مکھی رسم الخط) کا اجرا بھی کیا گیا۔ اِس تقریب کی نظامت پٹیالہ کے نامور شاعر سردار امرت پال سنگھ شیدا نے کی۔

پریس ریلیز: عابد علی خاں پٹیالہ، 21 اکتوبر 2015

تلنگانہ:

اردو ادب کے فروغ میں صحافت کا رول

نظام آباد: اردو زبان و ادب کی بقا اور اس کے فروغ میں اردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو صحافت نے انیسویں صدی میں جہاں انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کی کامیاب تحریک چلائی اور بیسویں صدی میں حصول آزادی کو یقینی بنایا وہیں آزادی کے بعد پچاس سال میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کے فروغ اور آج اکیسویں صدی میں عصر حاضر کے مسائل کی عکاسی کے ساتھ اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے تہذیبی ورثے کو اردو اخبارات کے ذریعے نئی نسل تک منتقل کیا جائے اس سے اردو کی بقا ممکن ہوگی اور اردو کی تہذیب زندہ رہے گی ان خیالات کا اظہار اردو کے مختلف دانشوروں نے ناظم ہال نظام آباد میں منعقدہ مذاکرہ 'اردو ادب اور صحافت' کے موضوع سے خطاب کے دوران کیا۔ مذاکرے کا اہتمام ڈاکٹر محمد ناظم علی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نظام آباد نے اپنے مکان ناظم منزل واقع کنٹیشور کمان میں کیا۔ مذاکرے کے شرکا میں ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو گری راج کالج نظام آباد، جناب محمد عابد علی سینئر لیکچرر گری راج گورنمنٹ کالج، محمد عبدالبصیر لیکچرار ردو تلنگانہ اقامتی جونیئر کالج نظام آباد اور حسیب الرحمٰن لیکچرر کامرس گری راج کالج شامل تھے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے کہا کہ ہر ماہ مختلف موضوعات پر مذاکروں اور ادبی جلسوں کا اہتمام کیا جائے گا تاکہ شمع اردو جلتی رہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کا ہر زمانے میں اہم کردار رہا ہے۔ محمد عبدالبصیر نے کہا کہ مولانا آزاد محمد علی جوہر اور دیگر نامور صحافیوں نے صحافت کو پیشہ نہیں بلکہ ایک مشن اور تحریک کے طور پر استعمال کیا۔ اردو اخبارات نے اردو کی غیر افسانوی اصناف کالم نگاری اور رپورتاژ نگاری کو فروغ دیا۔ محمد عابد علی سینئر لیکچرر نے کہا کہ جدوجہد آزادی کی تحریک کے دوران انقلاب زندہ آباد جیسے نعرے اردو صحافت نے دیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے اپنے گراں قدر خیالات پیش کیے۔ حسیب الرحمٰن نے کہا کہ یہ مذاکرہ موضوع کے اعتبار سے کافی معلوماتی رہا۔ انھوں نے مذاکرے کے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ملاپ' دہلی، 10 اکتوبر 2015

تمل ناڈو:

اقلیتی زبانوں کے تحفظ پر مکتوب

تملناڈو اردو رابطہ کمیٹی کے صدر جناب ملک العزیز نے محترمہ اسمرتی ایرانی، وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی کے نام ایک مکتوب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر سید ارتضیٰ کریم کے حوالے کیا ہے جس میں تملناڈو میں درپیش اقلیتی زبانوں کے مسئلے پر وزیر موصوف کی مداخلت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ملک العزیز صاحب جلد ہی وزیر موصوفہ سے مل کر مزید تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں۔

واضح رہے کہ حکومت تامل ناڈو نے نوٹی فکیشن کے ذریعہ اطلاع دی کہ 2016 سے ایس ایس ایل سی امتحان میں اردو بحیثیت مادری زبان حذف کر دی گئی ہے۔ اب طلبہ صرف مادری زبان تمل میں ہی سوالوں کے جواب دیں گے۔

ہندوستان کے آئین کی دفعہ 29 اور 30 میں اس بات کی صاف وضاحت کی گئی ہے کہ حکومت ایسی تمام زبانوں اور ثقافت کے تحفظ و بقا اور اس کے فروغ کے لیے اقدام اٹھائے گی جو آئین ہند کے شیڈول آٹھ کے تحت آتی ہیں۔ لہٰذا تمل ناڈو رابطہ کمیٹی حکومت ہند سے درخواست کرتی ہے کہ ریاست تمل ناڈو میں اردو زبان کی ترقی کے مثبت اقدامات کرے۔

پریس ریلیز: (ترجمہ انگریزی سے) ملک العزیز، تمل ناڈو اردو رابطہ کمیٹی، 20 اکتوبر 2015

کرناٹک:

اردو میڈیم طلبا کی تعداد میں اضافہ کے لیے خصوصی کوچنگ کا انتظام

کلبرگی: کرناٹک کے شہری علاقوں میں دسویں اور ساتویں کے بعد ترک تعلیم کرنے والے اردو میڈیم کے طلبا کی تعداد پر قابو پانے کے لیے اقلیتی ڈائرکٹوریٹ اور محکمہ تعلیمات کی جانب سے خصوصی کوچنگ کا انتظام کیا گیا ہے۔ ریمیڈیل کوچنگ اور بنیٹیشن ٹریننگ کے تحت ساتویں سے دسویں جماعتوں تک کے طلب کو سائنس، ریاضی، انگریزی مضامین کی خصوصی کوچنگ کا انتظام کیا گیا تاکہ ان مضامین میں طلبا کی تعلیمی صلاحیت و مہارت میں اضافہ کیا جا سکے۔ اس نوعیت کے پروگرام کا ہیومن ایج اردو ہائی اسکول گلبرگہ میں مسٹر محمد اصغر چلبل رکن وزیر اعظم 15 نکاتی پروگرام عمل آوری کمیٹی و چیئرمین کے یوڈی اے نے افتتاح کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے خطاب کرتے ہوئے اس کوچنگ کو قمر الاسلام صاحب وزیر وقف و اقلیتی بہبود حکومت کرناٹک کا پورے ملک کے لیے مثالی اور تاریخی کارنامہ قرار دیا۔ محمد اصغر چلبل نے بتایا کہ اس کوچنگ کے گلبرگہ ضلع میں 285 سنٹرس قائم کیے گئے ہیں۔ اس کوچنگ کے نتیجے میں دیہی علاقوں میں 7 ویں اور شہری علاقوں میں 10 ویں کے بعد اردو میڈیم کے طلبا کو تعلیم ترک کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس نوعیت کی ٹریننگ کا آغاز کرنے والی کرناٹک ملک کی پہلی ریاست ہے۔ اس موقعے پر محبوب پاشاہ ضلعی افسر محکمہ اقلیتی بہبود کے علاوہ محکمہ تعلیمات کے افسر آنجناب اطہر بابا سکریٹری ہیومن ایج ایسوسی ایشن، قاری عبدالجلیل نے شرکت کی۔ ابتدا میں نصرت محی الدین اردو ای سی او محکمہ تعلیمات نے ریمیڈیل کوچنگ اور بنیٹیشن ٹریننگ کی رپورٹ پیش کی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 28 اکتوبر 2015

اردو کو ریاست میں اس کا جائز حق دیا جائے

بنگلور: کرناٹک اردو اکادمی کی چیئرپرسن ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی قیادت میں ریاست کے مختلف اردو اداروں اور بہی خواہوں نے ایک وفد کی شکل میں کرناٹک کے وزیر اعلیٰ شریمان سدارامیا جی سے ان کی قیام گاہ 'کرشنا' میں اور بعد ازاں ریاستی وزیر برائے میونسپل انتظامیہ عوامی بہبود نیم اقلیتی مفاد حج اور اوقاف الحاج قمر الاسلام سے ان کے دفتر ودھان سودھا میں ہوئی خصوصی ملاقات میں مطالبہ کیا کہ ریاست کی سب سے بڑی اقلیتی زبان اردو کو ریاست میں اس کا جائز حق دیا جائے ورنہ اردو والوں کو اپنے جائز حقوق کے لیے مجبوراً اب سڑکوں پر اترنا پڑے گا۔ وفد نے وزیر اعلیٰ کی خدمت میں دو الگ الگ یادداشتیں پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ریاستی دارالخلافہ بنگلور اور دیگر اضلاع میں اردو گھر کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کے لیے مناسب اوقافی زمین الاٹ کی جائے اور اردو گھر کی تعمیر کے لیے حکومت اضافی فنڈ بھی مہیا کرے۔ اس وفد میں ریاست کے مختلف اردو اداروں کے ذمے داران شامل تھے جن میں بالخصوص کرناٹک اردو اکادمی کی چیئرپرسن ڈاکٹر فوزیہ چودھری، سابق کے اے ایس افسر عزیز اللہ بیگ رکن اردو اکادمی، ادارہ ادب اسلامی کرناٹک کے ایڈوکیٹ ضیا کرناٹکی، ناطق علی پوری رکن اردو اکادمی، اکادمی کی رجسٹرار فہمیدہ رحیم، بلگام اردو اکادمی کے صمد خانہ پوری اور کئی اصحاب موجود تھے۔ اس موقعے پر نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے ڈاکٹر

فوزیہ چودھری نے کہا کہ اردو ریاست کی ایک اہم زبان ہے جو ملک کی سب سے بڑی اقلیتی زبان کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پچھلے کئی سالوں سے ریاست کے اہم ایوارڈ 'راجیوتسوا ایوارڈ' سے اردو والوں کو محروم رکھا گیا ہے۔ اس سال اردو والوں کو راجیوتسوا ایوارڈ دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ سدارامیا اور وزیر اقلیتی امور الحاج قمرالاسلام نے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ اردو والوں کے مطالبے پر یکسوئی سے غور کریں گے۔

روزنامہ 'اردو ایکشن' بھوپال، 13 ستمبر 2015

کرناٹک اردو اکادمی کا اردو شعور بیداری پروگرام

بنگلور: محترمہ فوزیہ چودھری، چیئرپرسن، کرناٹک اردو اکادمی نے اردو شعور بیداری پروگرام میں مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ پروگرام فیڈریشن آف کرناٹک مسلم ایسوسی ایشن کے اشتراک سے ایک تعمیری مقصد کے تحت منعقد ہوا ہے۔ مانا کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے، لیکن چونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس زبان سے جڑی ہوئی ہے اس اعتبار سے اردو قلم کار اقلیتی طبقات بالخصوص مسلم طبقے کی پسماندگی اور ناخواندگی جیسے سلگتے ہوئے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنے میں اپنے قلم کا زور استعمال کریں۔ اس پروگرام کا افتتاح محترمہ سلطانہ بیگم معتمد عمومی جے ڈی ایس، ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر آف کمرشیل ٹیکس، حکومت کرناٹک، نے ایک پودے کی آبیاری سے کیا۔ پروگرام کا آغاز پروفیسر محمد منظور نعمان کی تلاوت آیاتِ ربانی اور اس کے اردو ترجمہ سے ہوا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر فریدہ رحمت اللہ نے انجام دیے۔ یہ پروگرام تین نشستوں پر مشتمل رہا۔ افتتاحی نشست کی صدارت ڈاکٹر فوزیہ چودھری، چیئرپرسن، کرناٹک اردو اکادمی، بنگلورو نے کی۔ مہمان خصوصی مہمان افتخار احمد شریف، مدیر روزنامہ 'سالار' رہے۔ مقررین میں سب سے پہلے کے سی نائیک واڈی، نائب صدر، یف کے ایم، اے بنگلورو نے اپنے ادارے کے تعارف کے ساتھ اس کے اغراض و مقاصد پر بھی روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر عظمت اللہ شریف، ذی سلام نے اردو زبان کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑنے کا مشورہ دیا۔ افتخار احمد شریف، مدیر روزنامہ سالار نے ایک نہایت سودمند مشورہ دیا کہ ہم وقت کی پابندی کرنا سیکھیں ''جو وقت کی قدر نہیں کرتا، وقت اس کی قدر نہیں کرتا۔''

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 3 نومبر 2015

مہاراشٹر:

'انداز بیاں اپنا' کی ماہانہ ادبی نشست کا انعقاد

ناگپور: ودربھ گورو پرتشٹھان، ناگپور کی ماہانہ ادبی نشست میں 'اندازِ بیاں اپنا' کے تحت ایک تقریب کا

انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت کے فرائض معروف ہندی شاعر رمیش گاندھی نے انجام دیے۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن اور ہندی کے شاعر انداپوار موجود تھے۔ ناگپور سے شائع ہونے والے ماہنامہ قرطاس کے مدیر مرحوم امین الدین کو اس مجلس میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اس سلسلہ میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے، ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے کہا کہ شہر ناگپور سے متعدد اخبارات ورسائل شائع ہوئے لیکن سب سے زیادہ طویل مدت یعنی پچیس برسوں تک باقاعدگی سے شائع ہونے والا رسالہ 'ماہنامہ قرطاس' ہے جو مرحوم امین الدین کی جانفشانی کا نتیجہ تھا۔ مشاعرے اور قومی یکجہتی کے عنوان سے شمیم اعجاز، مدیر ہفتہ وار المیز ان کے ایڈیٹر نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رمیش گاندھی، محمد توحید الحق، دیوی داس انداپوار، بھولا سرور اور ریحان کوثر نے اپنا کلام پیش کیا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد نے شکریہ ادا کیا اور پروفیسر اظہر ابرار نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' دہلی، 23 اکتوبر 2015

یاول میں کتابوں کی نمائش

یاول: 15 اکتوبر کو سابق صدر جمہوریہ مرحوم اے پی جے عبدالکلام کے یوم پیدائش کے موقع پر مولانا آزاد لائبریری یاول میں واچن پریرنا دِوس کے سلسلے میں

کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت لائبریری کے قائم مقام صدر جناب اختر حسین شیخ نے کی۔ جبکہ نمائش کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج کے پرنسپل جناب رحیم رضا کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر جناب ایس ایم انور جناب الحاج احمد خان صاحب، اقبال الدین شیخ اور شکیل احمد بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک تھے۔ اس نمائش کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج اندرا گاندھی اردو گرلس ہائی اسکول اور گلوبل انگلش میڈیم اسکول کے طلبہ و طالبات نہایت جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوئے۔ لائبریرین ظہیر خان نے طلبہ و طالبات کو کتابوں کی اہمیت ان کے رکھ رکھاؤ اور مطالعہ کی اہمیت سے متعلق رہنمائی کی۔ آخر میں صدر جلسہ اختر حسین شیخ صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں مطالعہ کی اہمیت پر اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض جناب غلام غوث خان نے ادا کیے اور شکریہ کی رسم لائبریرین ظہیر خان نے نبھائی۔

پریس ریلیز: رحیم رضا، یاول، مہاراشٹر، 15 اکتوبر 2015

سرسید احمد خاں کی تعلیمی خدمات پر جلسے کا انعقاد

امراوتی: ودربھ لائبریری جمیل کالونی، امراوتی میں 17 اکتوبر 2015 کی شب میں 'یوم سرسیدؒ' کے موقعے پر ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس تقریب کی صدارت سید مقصود علی (وظیفہ یاب بی ای او) نے کی اور مہمان

خصوصی کے طور پر پروفیسر عبدالرشید اور ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل مدعو تھے۔ گلدستوں سے مہمانوں کے استقبال کے بعد ودربھ لائبریری کے صدر جناب شیخ عمر کوثر نے تقریب کی غرض و غایت بیان کی اور مہمانوں کا تعارف بھی پیش کیا۔ اس کے بعد مہمانوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر عبدالرشید نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''سرسید احمد خاں نے معاشرے کے جمود کو توڑ کر اس میں تعلیمی ہلچل پیدا کی تھی اور آج بھی اس مشن کو آگے بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل نے کہا کہ ''ہمیں اپنے اداروں میں تعلیم کا معیار بلند کیے جانے پر غور کرنا چاہیے، نیز طلبہ کے ڈراپ آؤٹ کو روکنے کے لیے بھی منصوبہ بندی کی

ضرورت ہے تاکہ مسلم طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔''

صدر جلسہ مقصود علی نے سر سید احمد خاں کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی اور اس تقریب کے انعقاد پر منتظمین کو مبارکباد دی۔ اس تقریب کی نظامت محمد ریحان احمد نے بحسن وخوبی کی اور ودربھ لائبریری کے صدر جناب شیخ عمر کوثر صاحب نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

پریس ریلیز: شیخ عمر کوثر، صدر ودربھ واچنالیہ، امراؤتی، 26 اکتوبر 2015

روبوٹ کی تعلیم، مستقبل کے سائنس داں کے موضوع پر منعقدہ ورکشاپ کا منظر

روبوٹ کی تعلیم، مستقبل کے سائنس داں

پمپری چنچوڑ: عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اردو کی نئی نسل کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ٹھوس قدم 'روبوٹ کی تعلیم، مستقبل کے سائنس داں' ورکشاپ کا آغاز اردو کونسل پمپری چنچوڑ کے زیر اہتمام نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول (پمپری) پونہ میں عمل میں آیا جو ہر اعتبار سے مبارک ہے Excellent Education Training Centre اکادمی آف روبوٹکس کے تعاون سے ورکشاپ میں اپنے صدارتی خطاب سے پروفیسر غیاث الدین شیخ ڈائرکٹر اسٹوڈنٹس ویلفیئر نے کہا کہ اردو کونسل پمپری چنچوڑ پر فخر ہے جو اردو طلبہ کو اس ملک کے Excellence کے ساتھ جوڑنے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہی ہے اور اسکول کو کامیابی کی بلندیوں پر لے جا رہی ہے۔

اکادمی آف روبوٹکس کے ڈائرکٹر جناب شرد پاٹل نے روبوٹ ورکشاپ میں روبوٹ مشین کے ذریعے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی ہدایت پر روبوٹ مختلف کام کر سکتا ہے۔ ملٹری کے کاموں میں کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جاسوسی کے کاموں میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے۔ اس ورکشاپ سے طلبہ میں حد پرواز سے آگے بڑھنے کی تمنا کے بدلے حسرت پیدا ہوئی۔ طلبہ نے یہ عہد کیا کہ ہم مستقبل کے سائنس داں بن کر ملک کے نگہبان بنیں گے اور ایسا روبوٹ بنائیں گے جو فسادات کو قابو کر سکے اس طرح ملک میں امن وامان قائم رہے۔

قاسم زبیری، چیئرمین اردو کاؤنسل نیا اظہار کیا کہ مجھے امید ہے کہ اس ورک شاپ میں شامل ہونے والے طلبا اور طالبات یہاں جو ہنر سیکھیں گے، زندگی کے میدان میں کمال حاصل کرنے کے لیے اس کا بھرپور استعمال کریں گے۔ محترمہ شبانہ شیخ، صدر معلّمہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ریاست مہاراشٹر کی واحد اسکول ہے جو طلبہ کو روبوٹ ورکشاپ سے مستقبل کے سائنس داں بنانے میں رواں دواں ہے۔ اس اسکول میں جو شعور بیداری مہم چلائی جاتی ہے جو ناقابل فراموش ہے۔ ادارہ اردو کاؤنسل نے ہمیشہ ہی عصری ٹیکنالوجی کے استعمال کو ترجیح دیتے ہوئے اردو زبان کو ٹیکنالوجی سے مربوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس موقعے پر پونم پاٹل، پروفیسر رادھیکا جگتاپ نے دن بھر ورکشاپ میں پریکٹیکل کے ذریعے روبوٹ کے مختلف حصوں سے طلبہ کو واقف کرواتے رہے جس کے بہتر نتائج حاصل ہونے کی قوی امید ہے۔ بینا سوریہ ونشی نے اس کی تیاری میں اپنی زندگی کا حق ادا کیا۔ نظامت محمد نعیم نے ادا کیا۔ شکریے کی رسم پروفیسر عابدہ شہ نے کی۔

پریس ریلیز: شبانہ شیخ، صدر معلّمہ نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول، پمپری، 31 اکتوبر 2015

انیسویں صدی کے اردو اخبارات ورسائل کا لسانیاتی مطالعہ

ممبئی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'انیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل کا لسانیاتی مطالعہ' کے موضوع پر ممبئی میں یک روزہ سمپوزیم کا انعقاد کیا جس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف اسکالر شمیم طارق نے کہا کہ ہندوستانی تہذیب سے وابستگی اور اس وابستگی کی بہر قیمت ترجمانی اردو زبان و ادب اور رسم الخط کا خاصہ ہے۔ اردو صحافت کم وبیش 200 سالہ سفر میں اسی وصف کی حامل رہی ہے۔ موصوف نے آواز، حروف، الفاظ، جملوں، عبارتوں اور خبروں کے تجزیے کے حوالے سے بتایا کہ اردو زبان و ادب ہی کی طرح اردو صحافت کا بھی ہندوستانی ذہن و تہذیب سے بہت گہرا رشتہ رہا ہے اور یہ ہر ہندوستانی کو ساتھ لے کر چلنے کی قائل رہی ہے۔ شمیم طارق نے لسانیاتی مطالعہ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی اور مثالوں سے واضح کیا کہ کچھ اردو صحافت میں حروف اور الفاظ یقیناً فارسی اور عربی سے آئے ہیں مگر ان میں اتنی تبدیلی اور اضافہ کیا گیا ہے کہ اب وہ خاص اردو کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اردو صحافت نے بھی ہندوستانی مزاج، ضرورت اور عوامی مزاج کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ سیمینار کے افتتاحی سیشن کی صدارت بیگم عابدہ انعامدار نے کی۔ انھوں نے اس موقعے پر کہا کہ اکادمی نے بہت اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ انھوں نے کہا اردو اخبارات و رسائل کا لسانیاتی مطالعہ آج کے عہد کی اہم ضرورت بھی ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے اس اجلاس میں اپنا پرمغز مقالہ پیش کیا۔ دوسرے سیشن کی صدارت مدیر انقلاب شاہد لطیف نے کی۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت موثر گفتگو کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انیسویں صدی کے اخبارات و رسائل کے متن کو سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے تبھی ہم اردو صحافت کے لسانی مطالعے کے ساتھ انصاف کرسکیں گے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سلیم شہزاد، اطہر عزیز اور شکیل رشید نے مقالے پیش کیے۔ اس علمی سمپوزیم کی ابتدا ساہتیہ اکادمی کے پروگرام افسر مشتاق صدف کے افتتاحی کلمات سے ہوئی۔ انھوں نے تمام شرکا اور مہمانوں کا استقبال اور خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر سلام بن رزاق، ظہیر انصاری، صدر عالم گوہر، غلام نبی مومن، عبدالاحد ساز، محمد حسین پرکار، نور پرکار کے علاوہ مختلف زبانوں کے اہل علم اور اہل قلم موجود تھے۔ پونے، بھیونڈی اور مضافات ممبئی سے بھی کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ صحافت، ممبئی، 1 نومبر 2015

ہریانہ:

خطہ میوات میں اردو کی حالت خستہ

نوح / نگینہ: قومی راجدھانی دہلی سے متصل خطۂ میوات سے ملک کے نامور شاعر غالب کا سسرالی رشتہ ہونے کے باوجود اردو زبان اس علاقے میں بدحالی کا شکار ہے ایسے

حالات میں اردو زبان کے فروغ کے لیے آر ٹی آئی نام

'اردو شاعری میں تہذیبی عناصر کی عکاسی' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

کی سماجی تنظیم سامنے آئی ہے جس کو عوام کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ واضح ہو کہ میوات میں سرکاری اسکولوں میں اردو زبان کی تعلیم دینے و زبان کو فروغ دینے کے لیے آہستہ آہستہ مطالبہ زور پکڑنے لگا ہے۔ تنظیم کے میڈیا ترجمان نے بتایا کہ خطۂ میوات کے وسطی علاقہ نگینہ، برکلی، چوک سے تیسرے مرحلہ کی ابتدا کردی گئی ہے جو گاؤں گاؤں شہر بہ شہر لوگوں میں بیداری مہم چلانے کا ارادہ رکھتی ہے اس دوران بڑی تعداد میں دیہی علاقوں سے شرکت کرنے والے لوگوں نے دستخطی مہم میں حصہ لیا۔ آرگنائزر راجو الدین نے کہا کہ اردو ٹیچروں کی حیثیت سے بھرتی ہونے والے ٹیچروں سے بجائے اردو پڑھانے کے دوسرے مضامین پڑھوائے جا رہے ہیں۔ ضلع میں 3460 اردو ٹیچروں کے عہدے آج تک پر نہیں ہوئے ہیں وہیں ہریانہ اردو اکادمی کی برسہا برس کسی بھی زبان کے تئیں کارکردگی سامنے نہیں آتی۔ الیاس پردھان نے کہا کہ ہریانہ حکومت کو چاہیے کہ سرکاری اسکولوں میں خاص طور سے خطۂ میوات جہاں مسلم شرح آبادی 82 فیصد ہے۔ اردو زبان پڑھانے کے لیے ٹیچروں کی بھرتی کر کے بچوں کو اردو پڑھانے کی راہ ہموار کرے کیونکہ اردو زبان اس ملک کی قدیمی و روایتی زبان رہی ہے جس کے اندر ہندوستان کی قدیمی ثقافتی تہذیب و کلچر پوشیدہ ہے اس لیے حکومت کو چاہیے کہ ریاست کے مسلم اکثریتی علاقوں میں ہندوستان کے بڑے بڑے نامور اردو شعرا کے نام پر اردو لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے اور میوات کے وسطی علاقہ برکلی چوک نگینہ میں اردو کالج کا قیام کیا جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اکتوبر 2015

اردو شاعری میں تہذیبی عناصر کی عکاسی

نوح / میوات: خطہ میوات کی مشہور عصری دانشگاہ یٰسین میوڈگری کالج نوح میں اردو شاعری میں تہذیبی عناصر کی عکاسی کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ سیمینار کے کنوینر صدر شعبہ اردو ڈاکٹر نصیرالدین اظہر نے سیمینار کے مقاصد کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ریاست ہریانہ کا اردو کی ترویج و تشکیل کی سمت میں عہد ماضی میں جو کردار ادا کیا ہے۔

سیمینار کا افتتاح معروف نقاد پروفیسر مولا بخش، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا، انھوں نے اپنی تجزیاتی تقریر میں کہا کہ ادب صحیح معنوں میں تہذیب کا چہرا ہے، یہ ادب و شعر ہی ہیں جو کسی ملک کی تاریخ سے زیادہ تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں تہذیب کی عکاسی کے موضوع پر ریاست ہریانہ کے خطہ میوات کی اہم عصری علمی دانشگاہ یٰسین میوڈگری کالج میں سیمینار کا انعقاد ریاست ہریانہ میں اردو زبان و ادب کی بیداری مہم کا ایک طرح سے آغاز ہے۔ پروگرام کے مہمان ذی وقار معروف نقاد پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ سارا مسئلہ تہذیب ہی ہوتا ہے، اردو شاعری میں بالخصوص نظموں میں نظیر اکبرآبادی، تا حال کے شعرا کے یہاں جس نوع کا تہذیبی شعور نظر آتا ہے، اس کی نظیر ہندوستان کی دیگر زبانوں میں نہیں ملتی۔ اس پروگرام کے تئیں اردو طلبہ میں کافی جوش دیکھنے کو ملا اور طلبہ کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ میوات میں اردو سے لوگ رغبت رکھتے ہیں اور خاص کر نوجوان نسل اس کی دیوانی نظر آرہی ہے۔

سیمینار کے افتتاحی سیشن کی صدارت ڈاکٹر محمد امتیاز خاں، پرنسپل یٰسین میوڈگری کالج نے کی جبکہ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر معید الرحمٰن نے کی، دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر مولا بخش، اور ڈاکٹر خالد جاوید نے کی اس سیشن میں معید الرحمٰن، امتیاز احمد، ڈاکٹر ریاض احمد نے مقالات پڑھے۔ تیسرے سیشن کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ریاض احمد نے کی اس سیشن میں ڈاکٹر خالد جاوید، نوشاد منظر، ڈاکٹر متھن کمار نے مقالات پڑھے اور اخیر میں شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر نصیرالدین اظہر نے جملہ مہمانوں و سامعین و طلبہ طالبات و شہر و علاقے کے معزز لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2015

اے پی جے عبدالکلام کی یاد میں کل ہند مشاعرہ

نئی دھلی: ہم مشاعروں کے ذریعے نہ صرف اردو زبان کو فروغ دیں گے بلکہ اس زبان کی مدد سے بھائی چارے کی فضا بھی قائم رکھیں گے۔ یہ باتیں کرشنا نگر اسمبلی حلقہ کے آرام پارک میں اردو اکادمی دہلی کی جانب سے بہ اشتراک فیس اسلامک کلچر کمیونٹی انٹگریشن سابق صدر جمہوریہ ہند اے پی جے عبدالکلام کے یوم پیدائش

کے موقعے پر منعقدہ ایک کل ہند مشاعرہ میں ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہی۔ انھوں نے ڈاکٹر کلام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ولی صفت انسان تھے۔ اس موقعے مہمانِ خصوصی رام نواس گوئل اسپیکر دہلی اسمبلی نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے اردو زبان کی خوبصورتی اور چاشنی کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ زبان لوگوں کے دلوں میں خود اپنا گھر بنا لیتی ہے۔ یہ پیار محبت اور آپسی بھائی چارے کی زبان ہے۔ ہم سب کو مل کر اس زبان کے فروغ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ کرشنا نگر علاقہ کے ایم ایل اے ایڈووکیٹ ایس کے بگا نے کہا کہ اردو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے یہ سب شاعر جو یہاں آئے ہیں ان کی شاعری میں آپ کو محبت کا پیغام ملے گا جس پر ہمیں عمل کرنا ہے۔ مشاعرے کی صدارت علاقے کی معروف ہستی عمر سیفی صدر سیفی کونسل نے کی۔ مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے حاجی یونس، اے سی پی ٹریفک نیم پال سنگھ بھی مشاعرہ میں موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اکتوبر 2015

شمیم عباس کے اعزاز میں شعری نشست

نئی دھلی: پرانی دہلی کے بلیماران علاقے میں جمعیت مفکرین ملت ہند کی جانب سے اسلامی سالِ نو کے موقعے پر ممبئی سے آئے مہمان شاعر سید شمیم عباس رضوی کے اعزاز میں شعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ عالمی شہرت یافتہ معمر شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے نشست کی سرپرستی کی۔ گلزار دہلوی نے مہمان شاعر سید

شمیم عباس رضوی کی شاعری کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں دہلی کا لب ولہجہ جھلکتا ہے۔ انھوں نے شعری نشست کے کنوینر اور جمعیت مفکرین ملت کے عمومی ناظم شیخ علیم الدین اسعدی اور دیگر لوگوں کو اسلامی سالِ نو کی مبارک باد دی اور کہا کہ اس طرح کی تقریبات ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا سرمایہ ہیں۔ اس موقعے پر مہمان شاعر شمیم عباس نے انھیں اعزاز دیے جانے پر منتظمین و شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے معروف شاعر رؤف رضا نے شرکت کی۔

آخر میں نشست کے کنوینر شیخ علیم الدین اسعدی نے مہمان شاعر اور تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر گلزار دہلوی، شمیم عباس، رؤف رضا، شہباز ندیم ضیائی کے علاوہ دیگر مشہور و معروف شعرا نے شرکت کی۔ جبکہ شعری نشست کی نظامت معروف شاعر شہباز ندیم ضیائی نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اکتوبر 2015

اعزاز و اکرام:

ڈاکٹر اسلم پرویز مانو کے وائس چانسلر مقرر

نئی دھلی: ڈاکٹر ذاکر حسین دلی کالج دہلی یونیورسٹی کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے دہلی

کالج سے بوٹنی سے بی ایس سی کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم سی اور پی ایچ ڈی کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد وہ کچھ دنوں تک علی گڑھ میں ہی درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ پھر وہاں سے ذاکر حسین دہلی کالج میں بحیثیت استاد آ گئے اور یہاں 1984 سے اب تک اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ 2006 سے وہ ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے ابتدا زمانے میں انھوں نے بڑے اہم رول ادا کیے۔ چنانچہ سب سے پہلے یونیورسٹی کا دہلی ریجنل سینٹر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے ہی قائم کیا اور وہ دہلی کے سب سے پہلے ریجنل ڈائرکٹر بنے۔ اس موقعے پر روزنامہ 'سیاسی تقدیر' سے گفتگو کرتے ہوئے اسلم پرویز نے کہا کہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ آج اردو کو محض ادب تک محدود کر دیا گیا ہے لیکن ہماری کوشش ہوگی کہ اردو کو معلوماتی کتابوں سے جوڑا جائے تا کہ قانون، سائنس او دیگر فنون لطیفہ سے اردو الوں کو روشناس کرایا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں معلومات کی کمی ہے اور اردو والوں کو کتابیں دستیاب نہ ہونے کے سبب دوسرے فن سے واقفیت نہیں ہو پاتی ہے جس کی بنا پر انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری یہ بھی کوشش ہوگی کہ اردو میں عوام کی دلچسپی کے پیش نظر کتابیں تیار کی جائیں۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے مدارس کے طلبا کے لیے بھی معلوماتی کتابوں کی طرف توجہ دینے کا اظہار کیا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اسلام کی عصری اور سائنسی تفہیم کے حوالے سے بڑا اہم کام کیا ہے۔ اہل اردو میں سائنس کے تئیں بیداری پیدا کرنے ے لیے انھوں نے رسالہ 'سائنس' رسالہ جاری کیا جو گذشتہ 22 سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ خاص طور سے قرآن کریم کو سائنسی اصول اور تجربات کے مطابق پیش کرنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ ملک کے قومی روزناموں میں انھوں نے سائنس کے حوالے سے مختلف مضامین بھی لکھے ہیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 19 اکتوبر 2015

حسن کمال کو قمر الحسن خاں اعزاز

بھوپال: ملک کے نامور اردو جرنلسٹ اور فلم نغمہ نگار جناب حسن کمال کا ماننا ہے کہ اردو زبان سے نسل نو دور ہوگئی ہے، تاہم یہ کہنا غلط ہے کہ اردو زوال پذیر ہے۔ جناب حسن کمال نے نمائندہ 'ندیم' سے بات کرتے ہوئے یہ بات کہی۔ وہ اردو اکادمی کی اعزازی تقریب میں شرکت کے لیے بھوپال تشریف لائے تھے۔ انھیں

اردو صحافت کی گرانقدر خدمات کے لیے اکادمی کے قومی حکیم قمر الحسن خاں اعزاز سے نوازا گیا۔ مسٹر کمال نے کہا کہ ان کے لیے خوشی کا لمحہ ہے کہ اردو صحافت میں کام کرتے ہوئے انھیں یہ تیسرے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اردو جرنلزم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے سب سے پہلے ایوان غالب نے انھیں 2009 میں اعزاز سے نوازا۔ اس کے بعد پریس کونسل آف انڈیا نے 2012 میں ایوارڈ کی فہرست میں جرنلزم کو شامل کیا اور پہلا ایوارڈ بھی مجھے دیا اور اب ایم پی اردو اکادمی نے بھی انھیں جرنلزم کی خدمت کے اعتراف میں ایوارڈ سے نوازا ہے، میں خوش ہوں۔ اردو زبان کی صورت حال کے سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یقیناً ہر بڑے شہر میں نسل نو اپنی مادری زبان سے دور ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ صورت حال اردو ہی نہیں ہندی سمیت ملک کی دیگر مادری زبانوں کے ساتھ بھی ہے۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 27 اگست 2015

افضل منگلوری کو پروفیسر وحید الدین ملک ایوارڈ

روڑکی: آئی آئی ٹی روڑکی کے سابق پروفیسر و کشمیر، الہ آباد و جھانسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر مرحوم پروفیسر وحید الدین ملک کی یاد میں کنونشن ہال روڑکی میں ایک کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں مشہور شاعر افضل منگلوری کو پروفیسر وحید الدین ملک ایوارڈ سے نوازا گیا جس میں گیارہ ہزار روپے، شال اور ایوارڈ شامل تھا۔ انھیں یہ ایوارڈ پدم بھوشن شاعر و کوی گوپال داس نیرج، ڈاکٹر انور جلال پوری کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس موقعے پر ملک کے نامور شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ جبکہ مشاعرہ کی صدارت گوپال داس نیرج نے فرمائی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے اتراکھنڈ پولس کے ایڈیشنل ڈی جی پی اشوک کمار نے شرکت کی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 4 نومبر 2015

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی ایوارڈ تقریب

بھوپال: اردو ہماری ہندوستانی زبان ہے اور اس کے ادیب اور شعرا ہمیں دل سے پیارے ہیں۔ اس زبان کے فروغ کے لیے محکمہ میں جو لوگ فرائض انجام دے رہے ہیں وہ ادب سے محبت کرتے ہیں اور خود بھی ادیب ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں اردو پوری طرح محفوظ ہے۔ یہ باتیں بھارتیہ جنتا پارٹی کے سرکردہ رہنما اور سابق ممبر پارلیمنٹ جناب کیلاش نارائن سارنگ نے اسٹیٹ میوزیم میں منعقد مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی تقریب اعزاز میں صدارتی خطبے کے دوران کہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ اکادمی کی معرفت ریاست میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے سرکار سے مزید امداد تعاون کے لیے کہیں گے۔ تقریب میں سینئر ادیب اقبال مجید اور ممتاز افسانہ نگار بحیثیت مہمان ذی وقار موجود تھے۔ جبکہ اس موقعے پر

اردو زبان و ادب سے وابستہ شخصیات اور معزز شہری اس باوقار تقریب کے گواہ بنے۔ تقریب میں ریاست اور بیرون ریاست کی 25 شخصیات کو اردو زبان و ادب کی مختلف اصناف نیز صحافت کے شعبے میں ان کی گرانقدر خدمات کے اعتراف میں اردو اکادمی کے قومی اور صوبائی اعزازات برائے 12-2011، اور 13-2012 سے نوازا گیا۔ مہمان خصوصی جناب کیلاش نارائن سارنگ اور جناب اقبال مجید نے ان شخصیات کو اعزازات سے سرفراز کیا۔ اعزاز سے سرفراز ادیب:

سال 12-2011 کے کل ہند اعزاز ڈاکٹر صادق دہلی (میر تقی میر ایوارڈ)، حقانی القاسمی دہلی (حکیم یافتگان: قمرالحسن ایوارڈ)، پروفیسر قاسم نیازی بھوپال (حامد سعید خاں ایوارڈ)، ڈاکٹر علی عباس امید بھوپال (شاداں اندوری ایوارڈ)، ڈاکٹر انیس سلطانہ بھوپال (ظہور قریشی ایوارڈ)۔

12-2011 کے صوبائی ایوارڈ

طہور منصوری نگاہ ریوا (سراج میر خاں سحر ایوارڈ)، قمرالدین برتر گوالیار (باسط بھوپالی ایوارڈ)، آفتاب عارف بھوپال (محمد علی تاج ایوارڈ)، ڈاکٹر خلیل احمد اندور (نواب صدیق حسن خاں ایوارڈ)، پروفیسر حیدر عباس رضوی بھوپال (شعری بھوپالی ایوارڈ)، حبیب عالم کھنڈوا (کیف بھوپالی ایوارڈ)، تلک راج پارس جبلپور (شمبھو دیال سخن ایوارڈ)، محترمہ سلطانیہ حجاب بھوپال (شفا گوالیاری ایوارڈ)

13-2012 کے کل ہند اعزاز:

پروفیسر آفاق احمد بھوپال (میر تقی میر ایوارڈ)، حسن کمال ممبئی (حکیم قمرالحسن ایوارڈ)، نصیر پرواز بھوپال (حامد سعید خاں ایوارڈ)، رشید اندوری اندور (شاداں اندوری ایوارڈ)، طوفان آفندی بھوپال (جوہر قریشی ایوارڈ)۔

13-2012 کے صوبائی ایوارڈ:

ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی بھوپال (سراج میر خاں سحر ایوارڈ)، تاباں ضیائی کھرگون (باسط بھوپالی ایوارڈ)، ڈاکٹر محمود شیخ جبلپور (محمد علی تاج ایوارڈ)، ڈاکٹر مہتاب عالم بھوپال (صدیق حسن خاں ایوارڈ)، غلام حسین اجین (شعری بھوپالی ایوارڈ)، ساز جبلپوری جبلپور (شمبھو دیال سخن ایوارڈ) اور ڈاکٹر پروین کیف بھوپال کو (شفا گوالیاری ایوارڈ) سے نوازا گیا۔ اعزازات سے سرفراز ہونے والے ادیب وشعرا کو شال، سپاسنامہ، مومنٹو اور اعزازی رقم کا چیک پیش کر کے نوازا گیا۔ پروگرام کے شروع میں اردو اکادمی کی سکریٹری محترمہ نصرت مہدی نے اکادمی کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نئے کلینڈر سال میں اکادمی نے مختلف پروگرام ترتیب دیے ہیں جو اردو والوں کی آرزوؤں کی تسکین کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ محکمہ ثقافت کی کوشش ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کی کوششوں کے ساتھ ہی اردو زبان کے لیے گراں قدر خدمات دینے والوں کی عزت افزائی بھی کی جائے۔ انھوں نے اکادمی کے اعزازات قبول کرنے کے لیے سبھی ادبا، شعرا نیز اساتذہ اور جرنلسٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اکادمی کا وقار بلند کیا ہے۔ آغاز جلسہ نصرت مہدی نے مہمانان کو خوش آمدید کہا اور گلدستہ پیش کر کے ان کا استقبال کیا۔ تقریب میں نظامت کے فرائض اردو اکادمی کے سینئر اسٹاف ممبر محمد انیس انصاری اور شاعر بدر واسطی نے انجام دیے۔ آخر میں محمد انیس انصاری نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 27 اگست 2015

اردو دانشوروں کا والہانہ استقبال

امروھه: مولانا عبادت بریلوی ایجوکیشنل سوسائٹی (رجسٹرڈ) امروہہ کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر جناب پروفیسر ارتضیٰ کریم، جناب خورشید زیدی

اور پاکستان سے تشریف لائے ڈاکٹر ہلال نقوی، جناب شمیم ہادی اور سیدین صاحب کے اعزاز میں ایک تہنیتی اور استقبالیہ جلسے کا انعقاد دارالعلوم سیدالمدارس امروہہ میں کیا گیا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر منظر عباس نقوی، سابق شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض کمال امروہوی نے انجام دیے، پروگرام کا آغاز طاہر میاں کی تلاوت کلام پاک اور زبیر ابن سیفی کی نعت پاک سے ہوا۔ پروگرام میں مولانا ڈاکٹر سید محمد سیادت کی نو تصنیف کتاب فرہنگ مراثی دبیر اور ڈاکٹر حسنین اختر کی کشاف مجلّہ ثقافت الہند کا اجرا بھی مہمانوں کے ذریعے عمل میں آیا۔ مولانا ڈاکٹر سید احسن اختر نے مہمانوں کا استقبال کیا اور جناب سید خورشید زیدی کو گورنر ایوارڈ ملنے پر سوسائٹی کی جانب سے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ خورشید زیدی ملی سماجی اور تعلیمی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مہمانوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر حسنین اختر نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کا امروہہ آمد پر خیر مقدم کیا اور کہا کہ وہ ایک نہایت متحرک اور فعال شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی فعالیت سے پوری امید ہے کہ قومی اردو کونسل میں مثبت تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ جناب پروفیسر ناشر نقوی نے پاکستان سے آئے ہوئے مہمانوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر ہلال نقوی جدید مرثیہ کے میدان میں ایک اہم نام ہے۔ جدید مرثیہ پر جب بھی گفتگو ہوگی اس میں ہلال نقوی کا ذکر ناگزیر ہوگا۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر ہلال نقوی نے کہا کہ امروہہ ایک ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو والوں کو چاہیے کہ وہ نئی نسل کو آگے بڑھائیں اور دوسری اور تیسری لائن تیار کریں تاکہ دانشوری کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ امروہہ پوری دنیا میں اپنی منفرد ادبی شناخت بنائے ہوئے ہے اور ادب وثقافت سے یہ شہر پوری طرح جڑا ہوا ہے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر محمد شفاعت نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 اکتوبر 2015

عارف نقوی اور فرحت شہزاد کو استقبالیہ

نئی دھلی: لوگ کہتے ہیں اردو ختم ہو رہی ہے لیکن میں بتا دوں یوروپ، امریکہ اور کناڈا میں اردو ختم نہیں ہونے جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا جب تک ماں اردو نہیں بولے گی تب تک اس کا بچہ اردو نہیں لکھ پڑھ سکتا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار جرمنی میں مقیم معروف شاعر اور افسانہ نگار عارف نقوی نے اردو اکادمی میں منعقدہ استقبالیہ تقریب میں کیا۔ 1961 میں جرمنی گیا تھا اور 64 میں میری کہانی جرمن میں شائع ہوئی تھی۔ وہاں اردو کے جلسوں میں صرف ہندوستانی اور پاکستانی نہیں ہوتے ہیں بلکہ جرمن باشندے بھی شریک ہوتے ہیں۔ 1962 سے میں نے وہاں اردو پڑھانی شروع کر دی تھی۔ باضابطہ 1996 میں اردو بزم کا قیام عمل میں آیا جس کے ذریعہ اردو کے پروگرام منعقد کیے جانے لگے۔ اردو کے سلسلے میں یوروپ کے کئی شہروں میں اردو کے جلسے منعقد ہو رہے ہیں۔ اردو انجمن برلن کا میں بانی صدر ہوں۔ یہ اردو کی واحد انجمن ہے جو قومیت و مذہب سے اوپر اٹھ کر کام کرتی ہے۔ ہمارا مقصد اردو والوں کو سنانا نہیں ہے بلکہ دوسروں کو اردو کے تئیں رغبت دلانا ہے۔

قبل ازیں نظامت کرتے ہوئے اکادمی کے اسسٹنٹ سکریٹری راغب الدین نے اردو اکادمی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے تمام لوگوں کا استقبال کیا۔

اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے خیرمقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ جرمنی میں اردو کا چراغ روشن کرنا آسان کام نہیں ہے۔ عارف نقوی شخص نہیں شخصیات کے زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں، وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ شعبۂ اردو ذاکرحسین کالج کے استاد ڈاکٹر خالد علوی نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ عارف نقوی تاریخ ساز اس لیے ہیں کہ ان کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں سے جرمنی میں مقیم ہیں اور وہاں انھوں نے اردوستان قائم کررکھا ہے۔ فرحت شہزاد نے کہا کہ اردو محبت کی زبان ہے اور جہاں یہ زبان بولی جائے گی وہاں عارف نقوی، ماجد دیوبندی اور خالد علوی جیسے لوگ مل ہی جائیں گے۔ پروفیسر عبدالحق نے صدارتی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ اردو اکادمی میں خوش گوار اضافہ ہورہا ہے۔ اس کے لیے میں ماجد دیوبندی کو مبارکباد دیتا ہوں۔ آخر میں وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں اہل علم حضرات شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اکتوبر 2015

ہائی اسکول وانٹر میں اردو مضمون میں ٹاپ کرنے والے طلبا اعزاز سے سرفراز

ہائی اسکول وانٹر میں اردو مضمون میں ٹاپ کرنے والے طلبا اعزازات کے ساتھ

لکھنؤ: کسی بھی ملک کی تعمیر وترقی وہاں کی زبان کے فروغ وتحفظ سے ہے، غیرملکی زبانوں سے ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اردو ہندی ملک کی زبانیں ہیں اور ان کے فروغ ہی سے ملک وعوام کی ترقی ہوگی۔ ملک کی آزادی میں ہندی اور اردو زبانوں کا اہم رول تھا۔ عوام میں بولی اور سمجھی جانے والی ان زبانوں کی ترقی کے لیے ریاستی حکومت ہر ممکن تعاون کرے گی۔ سماج وادی نظریہ کی ریاستی حکومت نے ہندی، اردو، سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے دانشوروں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے اور اپنی اعزازات سے نوازا۔ ان خیالات کا اظہار وزیراعلیٰ اکھلیش یادو نے اپنی سرکاری قیام گاہ پر ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ یوپی بورڈ کے امتحانات میں اردو مضمون میں اپنے اپنے ضلع میں ٹاپ کرنے والے طلبا و طالبات اور ان کے اساتذہ کی اعزازی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے ہائی اسکول کے 103 اور انٹر کے 86 طلبا۔ طالبات کو 5100-5100 روپے کا چیک، توصیفی سند اور مومنٹو اور 83 اساتذہ کو بالترتیب فی کس 2100 روپے کا چیک اور مومنٹو دے کر اعزاز بخشا۔ اس موقعے پر وزیراعلیٰ نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ امتحانات میں اردو اور ہندی مضامین میں اپنے اپنے ضلع میں ٹاپ کرنے والے طلبا، طالبات کو لیپ ٹاپ دینے کا اعلان بھی کیا۔ اترپردیش اردو اکادمی کے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے وزیراعلیٰ نے کہا کہ ریاستی حکومت نے اترپردیش ہندی سنستھان اور اترپردیش سنسکرت سنستھان کو ضرورت کے مطابق مالی مدد مہیا کرائی ہے۔ اسی طرح اردو اکادمی کو بھی فراہم کرائی جائے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اکتوبر 2015

رسم اجرا:

میری تحریریں

نئی دھلی: معروف شاعر اور اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی کی تازہ ترین کتاب 'میری تحریریں' حال ہی میں منظرعام پر آئی ہے۔ یہ نثری

کتاب ان بڑی شخصیات کے فن وکارناموں سے مزین ہے جنھوں نے ہندوستان کے ادبی، تہذیبی، ثقافتی شعری وسماجی اُفق پر اپنی علمی فتوحات کے نقش ثبت کیے ہیں۔ 25 مضامین پر مشتمل اس کتاب کی نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے دست مبارک سے رونمائی عمل میں آئی۔ موصوف نے ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اس طرح کے اشخاص کے فن وکارناموں سے نوجوان نسل کو واقف کرانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اپنا نصب العین متعین کرسکیں۔ حامد انصاری نے اردو زبان سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا جس زبان میں جتنی کشش ہوگی لوگ اس کی طرف راغب ہوں گے اور اسے ترسیل وابلاغ کا ذریعہ بنائیں گے۔ اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے فروغ کے لیے آکسیجن ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اکتوبر 2015

تاریخ مرثیہ

لکھنؤ: مشہور محقق، ناقد اور تاریخ داں پروفیسر مسعودحسن رضوی ادیب کی کتاب 'تاریخ مرثیہ' ابتدائی دور کی تقریب رونمائی انہی کی رہائش گاہ 'ادبستان' میں انجام پائی۔ تقریب کی صدارت مولانا حسن عباس رضا فطرت نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض پروفیسر انیس اشفاق سابق صدر شعبۂ اردو لکھنو یونیورسٹی نے انجام دیے۔ دیگر مقررین میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر فضل امام، ڈاکٹر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، پروفیسر قمر جہاں، مولانا رضا حسین، مولانا امراد رضا، مولانا جعفرحسین اور اطہر مسعود رضوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ پروفیسر انیس اشفاق نے نظامت کے دوران کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں ایرانی مرثیوں میں کربلا اور اس کے متعلقات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ہندوستان میں مرثیہ کی جو روایت ہے بالخصوص انیسی مرثیہ جس بلندی پر قائم ہے ایرانی مرثیہ اس بلندی اور اس مقام پر نہیں پہنچ سکا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی ایران میں عزاداری اور مراثی کی روایت کے بارے میں پروفیسر مسعودحسن رضوی اپنے متعدد مضامین میں اظہار خیال کرچکے ہیں لیکن تاریخ مرثیہ باقاعدہ ایک کتاب کی صورت میں منظرعام پر آئی ہے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' علی گڑھ، 2 نومبر 2015

بچن آف دی ڈومس

نئی دھلی: کے کے بڑلا واقع الیانس فرنچائز میں

'ہندوستانی آواز' کے زیراہتمام ہندوستانی آواز کی بانی رخشندہ جلیل کی انگریزی میں مرتبہ کتاب 'بچن آف دی

ڈومس' (گنبد کے کبوتر) کی رسم رونمائی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ کتاب کا اجرا جاوید اختر اور پرسار بھارتی کے چیف ایگزیکیٹو آفیسر جواہر سرکار نے کیا۔ رخشندہ جلیل کی کتاب میں مختلف ہندی اور اردو مصنفین کی 19 مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ہندو مسلم تعلقات، کشمیر پنڈتوں کی وادی سے نقل مکانی، پنجاب میں ہندوؤں کی پسماندگی اور 1984 کے سکھ مخالف فسادات میں سکھوں پر ہوئے ظلم سے منسلک کہانیاں شامل ہیں۔ واضح رہے کہ رخشندہ جلیل نے فرقہ واریت کے حوالے سے لکھی گئی کہانیوں کو انگریزی میں ترجمہ کرکے مرتب کیا ہے۔ 'ہندوستانی آواز' کی بانی اور معروف ادیبہ رخشندہ جلیل نے اپنی مرتبہ کتاب کے حوالے سے کہا ہے کہ اس میں بیشتر کہانیاں اردو کی ہیں کچھ ہندی اور پنجابی سے بھی لی گئی ہیں۔ اس میں گنبد کے کبوتر ایک کہانی شوکت حیات کی ہے۔ یہ تمام کہانیاں ہندوستان میں ہو رہی فرقہ واریت یا فسادات سے متاثر ہیں۔ کتاب کا اجرا کرنے کے بعد جاوید اختر نے کہا کہ اکثر کتابوں میں اب فرقہ واریت کے عناصر دیکھے جاتے ہیں لیکن فرقہ واریت کے حوالے سے آج یہ کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے کیونکہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 اکتوبر 2015

چپ رہوں کیسے

نئی دھلی: آئی ٹی او پر واقع ہندی بھون کی تیسری منزل میں حلقہ تشنگان ادب کی 476 ویں نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر محفل، گنگ و جمن کے ہندی ایوارڈ یافتہ شاعر درس و تدریس سے وابستہ آشیش سنہا قاصد کے پہلے شعری مجموعے 'چپ رہوں کیسے' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت دانشور و ماہر لسانیات اور ادیب و شاعر ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ نظامت مشترکہ طور پر سیماب سلطانپوری اور انل ورمامیت نے انجام دی۔ مہمان ادیبوں میں ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، ڈاکٹر سدھیر پالیوال، ارل ستیہ بھوشن، صدر و ناظم وغیرہ کا شال و پھول پیش کرکے استقبال کیا گیا۔ ڈائس کے مہمان ادیبوں نے شعری مجموعے چپ رہوں کیسے پر اظہار خیال کیا۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اکتوبر 2015

سرسید پر تین کتابوں کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی اور ملک میں تعلیمی انقلاب کے روحِ رواں سرسید احمد خاں کی 198 ویں سالگرہ کے موقعے پر علی گڑھ موومینٹ مجلّہ کے ایک جلسے میں پروفیسر رضاء اللہ خاں کی کتاب 'سرسید کے منتخب مضامین' اور ڈاکٹر جسیم محمد کی دو کتب 'سرسید اور ان کی

خدمات' اور 'سرسید احمد خاں اور علی گڑھ موومینٹ' کا رسم اجرا اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق ڈین پروفیسر ابوبکر کے دستِ مبارک سے ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر رضاء اللہ خاں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سرسید ایک بڑے کردار کے مالک اور ماہر تعلیم تھے۔ وہ اپنے دور میں تمام مخالفتوں کے باوجود ایک تعلیمی انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے ان کی زندگی اور جدوجہد آج کے نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' علی گڑھ، 18 اکتوبر 2015

متاعِ قلم

علی گڑھ: الحاج طالب محمود کے مجموعہ کلام 'متاعِ قلم' کا اجرا مولانا شمیم بستوی اور الحاج ڈاکٹر الیاس نوید گنوری کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطبے میں شمیم بستوی نے مجموعہ الحاج طالب محمود نے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی۔ مہمانِ خصوصی استاذ الاساتذہ ڈاکٹر الیاس نوید گنوری کے اردو کی ترقی اور بقا کے حوالے سے پُرمغز تقریر کی اور اردو پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی ترغیب دی۔ مہمانِ ذی وقار جمنا پرشاد راہی نے مجموعہ کو ایک بہترین ادبی کاوش بتاتے ہوئے فرمایا کہ یہ مجموعہ نوجوان شاعروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا کیونکہ اس مجموعے میں ہر غزل اور نظم کی بحر اس کے اوزان اور بحر کا نام دیا گیا ہے جو مبتدیوں کے لیے سودمند ثابت ہوگا۔ خانہ و کنوینر ڈاکٹر مسرور احمد نے مجموعہ کو پُروقار اشعار سے مزین ادبی تحفہ قرار دیا۔ نظامت کے فرائض جاوید وارثی اختر نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ روزنامہ 'اودھ نامہ' علی گڑھ، 9 اکتوبر 2015

میکش نامہ

نئی دھلی: انڈین کلچرل سوسائٹی اور کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام غالب اکادمی نظام الدین میں مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش پر ایک کل ہند مشاعرہ و سیمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر گلزار زتشی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض معروف شاعر معین شاداب نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ پروگرام میں بحیثیت مہمان خصوصی تسمیہ ایجوکیشنل و ولفیئر سوسائٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عطیہ رئیس کی ترتیب کردہ کتاب، میکش نامہ (میکش امروہوی شخصیت فن اور شاعری) کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ اس میں ڈاکٹر عطیہ رئیس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے میکش امروہوی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے میکش نامہ ترتیب دیا کیونکہ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کی ستائش ان کی زندگی میں کی جائے۔ ڈاکٹر احمد امتیاز نے میکش امروہوی کی چالیس سالہ شعری و ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ مشاعرے کی شمع ڈاکٹر عقیل احمد (سکریٹری غالب اکادمی) و تمام مہمانان نے مشترکہ طور پر روشن کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 اکتوبر 2015

وفیات:

سید شریف الحسن نقوی

نئی دھلی: دہلی اردو اکادمی کے بانی سکریٹری اور تعلیمی و انتظامی شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دینے والے سید شریف الحسن نقوی کا 1 نومبر 2015 کو انتقال ہوگیا۔ وہ قومی خطہ راجدھانی کے پیتم پورہ میں واقع سروج اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ انھوں نے اسپتال میں آخری سانس لی۔ ان کی عمر تقریباً 86 سال تھی۔ انھیں بعد

نمازِ مغرب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں بڑی تعداد میں سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کیا گیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ نجمہ نقوی کے علاوہ بیٹے فضل علی، فضل حسن اور فضل حسین شامل ہیں۔ ان کی پیدائش معروف علمی سرزمین سنڈیلہ میں 7 اکتوبر 1929 میں ہوئی، ابتدائی تعلیم قصبہ بلگرام میں ہوئی۔ بارھویں کی تعلیم کانپور میں حلیم ڈگری کالج سے، بی اے اور ایم اے شعبۂ تاریخ اور معاشیات میں ڈی اے وی کالج سے کیا جبکہ تیسرا ایم اے اردو میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا سلسلہ بھی کانپور سے ہی شروع کیا، چنانچہ سب سے پہلے بحیثیت ٹیچر نواب گنج کانپور کے ایک اسکول میں ان کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد بحیثیت پرنسپل امام المدارس امروہہ آگئے جہاں انھوں نے 1946 تک اپنی خدمات پیش کیں۔ دوران ملازمت امروہہ انھیں انگلینڈ جانے کا موقع ملا جہاں سے انھوں نے لیڈس یونیورسٹی سے ایجوکیشنل ایڈمنسٹریشن میں اسپیشل ڈپلومہ کیا، اس کے بعد دہلی میں بحیثیت پرنسپل ایک

اسکول جوائن کیا اور اس کے بعد وہ محکمہ تعلیم میں آفیسر ہوگئے۔ جب وہ محکمہ تعلیم میں تھے تبھی انھیں اردو کا نوڈل آفیسر بنایا گیا، 1981 میں دہلی اردو اکادمی کے قیام کے بعد انھیں سکریٹری کا اضافی چارج دیا گیا اور ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن کی حیثیت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے 1983 سے 1991 تک مستقل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ اردو اکادمی کی سرگرمیوں اور اسکیموں کا جو خاکہ انھوں نے تیار کیا تھا اکادمی میں بنیادی طور سے ابھی تک اسی پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اردو اکادمی کا جب قیام ہوا تو صرف تین افراد تھے، ایک کمرہ تھا اور تقریباً 50 ہزار روپے کا معمولی بجٹ تھا لیکن 1991 میں جب وہ یہاں سے سبکدوش ہوئے تو اس کا بجٹ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے ہوگیا اور تقریباً 40 ملازمین ہوگئے تھے اور اکادمی کا ایک بڑا دفتر بھی ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ایک سال کے لیے وہ یہاں مشیر کی حیثیت سے رہے۔ 2004 میں اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کا ممبر بنایا گیا اور پھر جب قمر رئیس کا انتقال ہوا تو تقریباً پانچ مہینے کے لیے وائس چیئرمین کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ بنیادی طور سے انھیں سیاسیات اور تاریخ سے گہری دلچسپی تھی اور ان دونوں موضوعات پر انگریزی اور اردو میں تقریباً 9 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار بھی رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 نومبر 2015

فاتح انٹارکٹیکا ظہور قاسم

نئی دہلی: ممتاز ہندوستانی سائنسداں پدم بھوشن پروفیسر سید ظہور قاسم کا 20 اکتوبر 2015 کو انتقال ہوگیا۔ انٹارکٹیکا کی اولین ہندوستانی مہم جوئی کے لیڈر مرحوم قاسم 92 برس کے تھے۔ ان کی تدفین جامعہ قبرستان میں بعد نماز ظہر عمل میں آئی۔ جنازہ میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نمائندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

پروفیسر قاسم نے 82-1981 میں منجمد براعظم انٹارکٹیکا کی مہم جوئی کی اور آئندہ 7 مہمات کی کامیاب اور منظم رہنمائی کی۔ قومی اور بین الاقوامی جریدوں میں ان کے 200 سے زیادہ اوریجنل تحقیقی مقالات کی اشاعت عمل میں آئی۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں 1982 میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا۔ پروفیسر قاسم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ابنائے قدیم میں نمایاں اور منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے 1949 میں بی ایس سی مکمل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہی 1951 میں زولوجی میں ایم ایس سی کیا اور اوّل پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ پروفیسر قاسم نے 1951 میں ہی یونیورسٹی کے زولوجی کے شعبے میں بحیثیت لیکچرر تدریسی ذمے داری سنبھالی تھی۔ اے ایم یو نے 2009 میں پروفیسر قاسم کو لائف سائنس کے لیے سرسید احمد خان انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا تھا۔ پروفسر قاسم نے اس ایوارڈ کی رقم (3 لاکھ روپے) یونیورسٹی کو عطیہ میں دے دی تھی تاکہ یونیورسٹی کے سائنس گریجویٹ کے مستحق طالب علموں کے لیے اکیڈمک ایوارڈ اور اسکالرشپ کا سلسلہ شروع کیا جاسکے۔ اے ایم یو کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ نے غمزدہ کنبے کے ساتھ دلی تعزیت کی اور کہا کہ پروفیسر قاسم کا انتقال ملک وملت کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 اکتوبر 2015

سعیدہ خورشید

نئی دہلی: ڈاکٹر ذاکر حسین کی بیٹی اور سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید کی والدہ کا اپنی رہائش گاہ گل مہر ایونیو تکونہ پارک جامعہ نگر نئی دہلی میں 21 اکتوبر 2015 کو انتقال ہوگیا، وہ تقریباً 85 سال کی تھیں۔ وہ سعیدہ آپا کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر جامع مسجد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امام وخطیب قاری سلیمان نے پڑھائی اور تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ تدفین میں مرحومہ کے فرزند اور سابق مرکزی وزیر خارجہ سلمان خورشید، م افضل ترجمان کانگریس پارٹی، سابق راجیہ سبھا ایم پی محمد ادیب علیگ، عبدالخالق سکریٹری جنرل لوک جن شکتی پارٹی، پروفیسر طلعت احمد وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے لسانی اقلیت حکومت ہند، عمران قدوائی، اطہر فاروقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، مرزا قمرالحسن بیگ ڈائریکٹر جامعہ کوآپریٹو بینک، ڈاکٹر عبدالنصیب خان، ودیگر سرکردہ اور معزز شخصیات نے شرکت کی۔ وہ طویل عمری کی وجہ سے مختلف عارضے کا شکار تھیں۔ پسماندگان میں ایک بیٹا، سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید کے علاوہ 3 بیٹیاں شامل ہیں۔ تینوں بیٹیاں بڑی ہیں جبکہ سلمان خورشید چھوٹے ہیں۔ سعیدہ خورشید کی پیدائش 6 اگست 1927 میں قائم گنج، فرخ آباد، اتر پردیش میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم قائم گنج فرخ آباد میں حاصل کی۔ پھر قرول باغ دہلی کے ایک گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے (اردو) کی ڈگری اصل کی۔ مرحومہ کو تقریر وتحریر سے بھی کافی شغف تھا۔ انھوں نے اپنے والد محترم، معمار جامعہ اور سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین پر ایک کتاب 'ذاکر صاحب کی کہانی ان کی بیٹی کی زبانی' اردو میں لکھی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اکتوبر 2015

سینئر صحافی عبدالقدوس قادری

لکھنؤ: ملنسار، ہنس مکھ، جہد مسلسل کے پیکر، معروف سینئر صحافی عبدالقدوس قادری سابق سب ایڈیٹر روزنامہ 'قومی خبریں' کا بدھ کی شام انتقال ہوگیا۔ مرحوم اپنے نحیف و نحیل جسم کے باوجود آخری وقت تک ملازمت سے منسلک رہے اور لاولد ہونے کی وجہ سے ضعیفی کے باوجود ضروریات زندگی کے تمام اخراجات کا بار اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم کا تعلق ضلع بدایوں سے تھا، تقسیم وطن کے وقت ان کے گھر کے اکثر افراد پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ ان کے والد محکمہ پولیس میں سرکاری ملازم تھے۔ قادری مرحوم کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سنہرا موقع ملا اور انھوں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کانپور میں انھوں نے سرکاری ملازمت بھی کی مگر وہ کسی بھی محکمے میں کافی دیر تک برقرار نہیں رہ سکے۔ بعد میں انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور اردو زبان کے بڑے ماہر ادیبوں وصحافیوں کے ساتھ رفاقت کا موقع ملا۔ قادری مرحوم نے 'قومی آواز' ان دنوں، اقدام، آگ، قومی خبریں وغیرہ میں صحافت کی خدمات انجام دیں۔ مرحوم کی تدفین کیمپل روڈ پر واقع اسیامئو قبرستان میں ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2015

معروف پینٹر شمشاد حسین

نئی دہلی: مرحوم پینٹر مقبول فدا حسین کے بیٹے اور مشہور پینٹر شمشاد حسین کا 24 اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 70 سال کے تھے اور گذشتہ کچھ دنوں سے بیمار تھے۔ ان کے خاندان میں بیوی اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی تجہیز وتکفین ممبئی میں عمل میں آئی۔ ممبئی میں 1946 میں پیدا ہوئے مسٹر حسین ملک کے معروف پینٹرز میں سے ایک تھے۔ انھوں نے بڑودہ آرٹ کالج اور رائل کالج آف آرٹ، لندن سے تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے 1968 میں اپنی پہلی پینٹنگ کی نمائش کی تھی جس کے بعد ملک و بیرون ملک ان کی پینٹنگز کی نمائش لگی۔ انھیں 1983 میں فائن آرٹس اکادمی کا بھی ایوارڈ ملا تھا۔ مسٹر شمشاد حسین کو دو دن پہلے اسپتال سے گھر لایا گیا تھا جہاں انھوں نے آخری سانس لی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 26 اکتوبر 2015

ہاشم عبدالحلیم

کولکاتا: مغربی بنگال اسمبلی میں 29 سالوں تک اسپیکر کے عہدے پر فائز رہنے والے سابق اسپیکر ہاشم عبدالحلیم کا انتقال 2 نومبر 2015 کو ہوگیا۔ وہ گذشتہ کئی دنوں سے بیمار تھے۔ 80 سالہ عبدالحلیم 1982 سے 2011 تک بنگال اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ عبدالحلیم مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کے سینئر لیڈر اور مشہور وکیل تھے۔ وہ 1977 سے 1982 تک ریاست کے وزیر قانون وانصاف تھے۔ اس کے بعد انھیں اسپیکر کے لیے منتخب کیا گیا۔ بایاں محاذ کی حکومت تک وہ اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ 2011 کے اسمبلی انتخاب میں درازی عمر کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے انتخاب میں حصہ لینے سے انکار کردیا تھا۔ وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی نے عبدالحلیم کے انتقال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک ریاست کے اسپیکر رہے اور اسمبلی کی کارروائی بحسن وخوبی چلائی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 3 نومبر 2015

خراجِ عقیدت:

سرسید کے یوم ولادت پر ایک پروگرام

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی-فارسی یونیورسٹی میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے طلبا کی جانب سے سرسید احمد خاں کے یوم ولادت کے سلسلے میں ایک پروگرام کا صدر شعبۂ پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی کی صدارت میں انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت ایم اے اردو کی طالبہ سفیۃ الزہرا نے کی۔ اس موقعے پر شعبہ کے استاد ڈاکٹر ثوبان سعید نے سرسید احمد خاں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''سرسید کی صحافت جہاں ایک طرف اردو صحافت کا روشن باب ہے وہیں ان کی رفاہی و سماجی خدمات بھی اپنی جگہ پر مسلم ہیں وہ صرف مصنف ہی نہیں بلکہ مصنف گر بھی تھے۔ شعبے کے استاد ڈاکٹر فخر عالم اعظمی نے سرسید کی زندگی کے ان گوشوں پر بات کی جو اب تک نظروں سے مخفی تھے۔ انھوں نے سرسید کی عظمت کو ان کے عہد کے تہذیبی و سیاسی پس منظر میں واضح کیا اور سرسید کے افکار و خیالات اور موجودہ دور میں ان کی معنویت پر پھر سے غور کرنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر محمد اکمل شاداب نے سرسید اور موجودہ دور میں ان کی معنویت کے تعلق سے بات کی۔ ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر نے سرسید کے عہد کے تناظر میں ان کی عظمت کا جائزہ لیا۔ کلمات تشکر سعید انور نے پیش کیے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ'، علی گڑھ، 20 اکتوبر 2015

محمد امین الدین کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی نشست

ساگر: شعبۂ اردو وفارسی ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی ساگر میں محمد امین الدین مدیر قرطاس ناگپور مہاراشٹر کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی نشست انعقاد کیا گیا، جس میں شعبے کے طلبہ واساتذہ نے شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر فداء المصطفیٰ فدوی صدر شعبہ اردو وفارسی نے محمد امین الدین کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مرحوم کی وفات اردو کی ادبی صحافت کا زبردست نقصان ہے۔ اس کی تلافی ناممکن ہے۔ وہ تقریباً بیس برسوں سے ماہنامہ قرطاس ناگپور کی ادارت کررہے تھے۔ اس دوران انھوں نے قرطاس کے مختلف قابل قدر خصوصی نمبر اور ادبی شخصیات کے اہم گوشے شائع کیے۔ محمد امین الدین کی پیہم کوششوں سے قرطاس کو نہ صرف ریاست مہاراشٹر میں بلکہ بیرون ریاست اور بیرونی ممالک میں بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ لہٰذا یہ سانحہ نہ صرف ادارۂ قرطاس بلکہ پوری اردو دنیا کے لیے باعث رنج وغم ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وسیم انور نے کہا کہ میں نے انھیں بہت ہی پرخلوص اور معاون مددگار پایا۔ ماہنامہ قرطاس اس علاقے میں ایک عرصے سے مقبول ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر ابوشہیم خان اور ڈاکٹر افضل مصباحی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مرحوم کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ مرحوم کے لیے دعائے خیر پر تعزیتی نشست کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: پروفیسر فداء المصطفیٰ فدوی، صدر شعبۂ اردو و فارسی، ساگر یونیورسٹی، مدھیہ پردیش، 20 اکتوبر 2015

جاوید اقبال کی رحلت پر تعزیتی نشست

کولکاتا: شاعر مشرق علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال کی رحلت پر مغربی بنگال اردو اکادمی کے کانفرنس روم میں اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر سید منال شاہ القادری کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی جس میں مغربی بنگال اردو اکادمی کی گورننگ باڈی اور جنرل کونسل کے ممبران کے علاوہ اہل علم حضرات نے بھی شرکت کی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کی گورننگ باڈی کے معزز رکن اور ممبر آف پارلیمنٹ جناب سلطان احمد نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو اکادمی نے علامہ اقبال کے خاندان سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔'' 'جشن اقبال' سے مغربی بنگال اردو اکادمی اور اقبال گھرانے کے درمیان ایک خوش گوار رشتے کی شروعات ہوئی جس کا سلسلہ قائم ہے۔ موصوف نے مزید کہا کہ جاوید اقبال جیسے لوگ آفاقی ہوتے ہیں ہمیں ان کی موت سے گہرا دکھ ہوا ہے، ریاستی وزیر عبدالکریم چودھری نے کہا کہ جاوید اقبال عہد ساز ہستی تھے۔ پروفیسر منصور عالم نے کہا کہ ''ان کی وفات سے مغربی بنگال کا اردو طبقہ غم زدہ ہے۔ ایسے نابغۂ روزگار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔'' صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج ڈاکٹر دبیر احمد نے 'جاوید نامۂ' کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہر شخص کو فنا ہونا ہے مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو فنا ہوکر بھی زندہ جاوید ہوجاتے ہیں، جاوید اقبال ان ہی میں سے ایک ہیں۔ ڈاکٹر نعیم انیس نے کہا کہ کاش 'جشنِ اقبال' کے موقعے پر جاوید اقبال کی صحت اس بات کی اجازت دیتی کہ وہ کولکاتا آپاتے تو اہلِ بنگال کو ان سے ملنے کی سعادت نصیب ہوجاتی۔ کریم رضا مونگیری نے کہا کہ جاوید اقبال کی رحلت کا غم مغربی بنگال کی پوری اردو دنیا کو ہے۔ صدر نشست پروفیسر سید منال شاہ القادری نے جاوید اقبال کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رحلت قوم کا ایک عظیم نقصان ہے۔ اللہ ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ اخیر میں ڈاکٹر صباح اسماعیل ندوی نے مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 8 اکتوبر 2015

اشفاق الرحمٰن مظہر کے انتقال پر تعزیتی اجلاس

تمل ناڈو کے معروف ادیب وشاعر اور سابق ڈپٹی سکریٹری، حکومت تمل ناڈو جناب اشفاق الرحمٰن مظہر کا انتقال 2 ستمبر 2015 کی نصف شب کو ہوا جس کی وجہ سے اردو کے ادبی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ نمازِ جنازہ پرساواکم کے قبرستان کی مسجد میں ادا کی گئی اور تدفین اسی مسجد کے احاطے میں عمل میں آئی۔ تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز چینئی 5 اور تمل ناڈو اردو لٹریری ایسوسی ایشن، چینئی 2 کی جانب سے اشفاق الرحمٰن مظہر کے انتقال کے بعد 30 ستمبر کو بعد نماز مغرب جناب علیم صبا نویدی کی رہائش گاہ پر تعزیتی اجلاس کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جناب سجاد بخاری سابق نائب چیئرمین تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی نے کی اور نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر حیات افتخار سابق صدر شعبۂ اردو قائد ملت کالج چینئی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں بحیثیت مہمانانِ ذی وقار جناب علیم صبا نویدی، جناب ملک العزیز اور کاتب محمد حنیف شریک تھے۔ اس تعزیتی نشست میں وانباڑی کے شاعر مشتاق رفیقی نے شرکت کی۔ اشفاق الرحمٰن کے فرزندان میں انعام الرحمٰن، اعزاز الرحمٰن اور ان کے بھائی جمال صاحب بھی شریک جلسہ رہے۔ جناب علیم صبا نویدی کے ہدیۂ تشکر پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: شاہد مدراسی، تمل ناڈو، 20 اکتوبر 2015

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی
صفحات: 474
قیمت: 216 روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: بنارسی پرشاد سکسینہ
صفحات: 466
قیمت: 197 روپے

نورتن کی کہانیاں
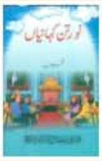

انتخاب: شمیم احمد
صفحات: 155
قیمت: -/37 روپے

تذکرۂ شورش

مصنف: غلام حسین شورش
مرتب: ڈاکٹر محمود الٰہی
مترجم: محمد عاصم اعظمی
صفحات: 450، قیمت: 198 روپے

اردو کی کہانی

مصنف: سید احتشام حسین
صفحات: 104
قیمت: 125 روپے

عصری عالمی ادب کے ستون: احوال وافکار

مصنف: زبیر رضوی
صفحات: 216
قیمت: 111 روپے

مشاہدات وتاثرات

مصنف: ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ
ترتیب وتہذیب: اطہر صدیقی
صفحات: 412
قیمت: 185 روپے

تاریخ علم الادویہ

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی
صفحات: 498
قیمت: 220 روپے

تعلیمی نفسیات

مصنف: ڈاکٹر طلعت عزیز
صفحات: 242
قیمت: -/100 روپے

مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال
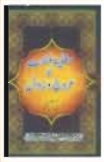

مصنف: آر پی ترپاٹھی
مترجم: ریاض احمد خاں شروانی
صفحات: 543
قیمت: 242 روپے

ہمارا طرزِ زندگی اور بیماریاں

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی
صفحات: 69
قیمت: -/42 روپے

معالجات (جلد اول، دوم، سوم چہارم)
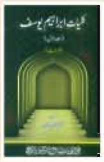

مصنف: وسیم احمد اعظمی
صفحات: 2273 (مکمل سیٹ)
قیمت: 613 روپے (مکمل سیٹ)

انیس کے سلام
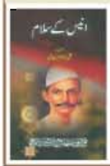

مرتب: علی جواد زیدی
صفحات: 307
قیمت: 113 روپے

ہند کی مایۂ ناز ہستیاں ودیگر مضامین

مصنف: بی شیخ علی
صفحات: 176
قیمت: -/35 روپے

شرارِ جستجو

مصنف: قیصر ضحیٰ عالم
صفحات: 125
قیمت: -/80 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر
مرتبہ: ڈاکٹر وہاب اشرفی
صفحات: 740
قیمت: 305 روپے

فضائی آلودگی

مصنف: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر
صفحات: 179
قیمت: -/108 روپے

پیسے کی کہانی
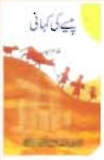

مصنف: غلام حیدر
صفحات: 80
قیمت: -/22 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, December-2015, Vol.17, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/11/2015
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Prof. Syed Ali Karim, Tel : 49539000